جولائی 2025 قیمت 25₹

ماهنامه

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

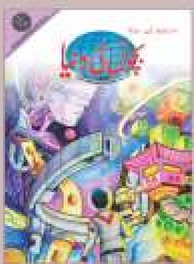

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

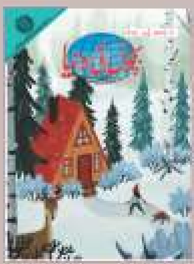

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اُردو دُنیا

ماہنامہ

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:7، جولائی 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم، ثاقب فریدی، فیضان الحق

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

• ہماری بات 4

خطوط

• ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

• طبع انسانی اور آغاز تعلیم — مصنف: ڈی ایس گورڈن، مترجم: خلیل الرحمن سیفی پریمی 7

• ہندوستانی علمی ورثہ اور جدید تعلیمی نظام — سید محمد کہف الوریٰ 10

• دورِ جدید کے آئینے میں اساتذہ کا کردار — احمد حسین 13

ادب زاویے اور جہات

• تقابلی ادب کے اساسی تصورات — ارشاد نیازی 16

• پریم چند کی افسانہ نگاری فکر و فن کا تحقیقی آئینہ — ریاض توحیدی 20

• جدید اردو غزل میں تنہائی کا کرب — محمد یونس ڈار 24

• اردو غزل میں بٹر فلائی افیکٹ — انجینئر محمد عادل 27

یاد رفتگاں

• شمس الحق عثمانی حیات اور تنقیدی افکار — اویس احمد 30

• قمر جہاں کے افسانوں میں عورت کے متنوع کردار — واثق الخیر 33

جہان دانش

• رام پور رضا لائبریری صدیوں پر محیط علمی ورثہ — نشاط جمیل 37

نگر نگر اردو

• اڈیشا میں اردو کا ماضی حال اور مستقبل — شاداب عالم 41

تاریخ

• تاریخ کی اصناف بندی — خلیل الرب 45

شخصیات

• حکیم اجمل خان: نگینہ ہند — ابوطالب انصاری 48

• ایک نوائے حرف خموش: ظفر کلیم — محمد اسد اللہ 51

• نظیر اکبرآبادی کی شاعری — مجیب احمد خان 53

سلسلۂ صحافت

• سنبھل کے اردو اخبارات اور اردو ادب — نوید احمد خاں 56

معاشیات

• بین الاقوامی معاشیات کا مطالعہ — مصنف: چارلس پی کنڈل برجر، مترجم: لیاقت علی خان 59

خصوصی گفتگو

• ف س اعجاز سے انٹرویو — شکیل افروز 63

سائنس

• تعلیم میں سائنس — مصنف: دیپک کمار، مترجم: سہیل احمد فاروقی 66

نیا آسمان نئے ستارے

• اردو غزل پر تصوف کے اثرات — عبدالرحمن شافی 72

کتابوں کی دنیا

• تعارف و تبصرہ — ادارہ 75

• **خبرنامہ**

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

ادب نے ہمیشہ سے قوموں کی فکری اور تہذیبی پہچان مستحکم کی ہے۔ اگر قومی زبان میں لکھا جانے والا ادب کسی قوم کی اجتماعی تہذیب وتاریخ اور تصورات ونظریات کی نمائندگی کرتا ہے تو علاقائی ادب کسی خاص علاقے کی روایتوں، زبانوں اور رسوم وتہذیب کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ علاقائی ادب صرف شاعری، ناول اور افسانوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں علاقائی رسمیں بھی ہیں، تہوار بھی ہیں، لوک گیت بھی ہیں اور اسی کے ساتھ کہاوتیں اور محاورے بھی ہیں۔ علاقائی ادب صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھتا ہے۔ اگر ہم نے علاقائی ادب کو نظر انداز کیا تو ہم خود اپنی وراثتوں کو ہی گم کر بیٹھیں گے۔ علاقائی ادب نے جس طرح قومی ادب کو مستحکم کیا ہے وہ ایک واقعہ ہے۔ اس کی خوشبو نے تمام مرکزی ادب کو معطر کیا ہے۔ اس لیے اس کی قدر دانی ہم سب کی ذمے داری ہے۔

ایک زمانے تک علاقائی ادب حاشیے کا حصہ بنا رہا۔ وہ جن توجہات اور نظر التفات کا حقدار تھا اس سے محروم رہا لیکن موجودہ دور میں عالمی سطح پر علاقائی ادب پر توجہ دی جارہی ہے اور اسے شرف قبولیت سے بھی نوازا جارہا ہے۔ ابھی کچھ دنوں قبل ہی کنڑ ادیبہ بانو مشتاق کے افسانوی مجموعے 'ہرٹ لیمپ' کو انٹرنیشنل بوکر پرائز دیا گیا۔ اس سے قبل بھی علاقائی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کو نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا نام تو ہندوستان کے رویندر ناتھ ٹیگور کا ہے۔ انھوں نے خود ہی گیتا نجلی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد لاطینی امریکہ کی گبریلا مسترال کو 1945 میں چلی کی علاقائی زبان میں شاعری پر نوبل انعام دیا گیا۔ انھوں نے مادری جذبات، تعلیم، غربت اور خواتین کے حقوق جیسے موضوعات کو دنیا کے سامنے فنی ہنرمندی سے پیش کیا تھا۔ محبت اور مقامی رنگ بھی ان کی شاعری کا اختصاص بن گیا تھا۔ ان کے علاوہ ہالڈور لکسنس کو 1955 میں آئس لینڈک زبان میں تخلیق کیے گئے ادب پر نوبل انعام ملا۔ انھوں نے شاعری کی، افسانے اور ناول لکھے اور اخباروں میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کی تخلیقات میں علاقائی اثرات ونقوش بہت واضح طور پر نظر آئے۔ 2006 میں ترکی ادیب اورہان پامک کو نوبل انعام دیا گیا۔ ان کے ناولوں میں قارئین کو علاقائی خصوصیات نظر آئیں۔ ان کا ناول استنبول: یادیں اور شہر کو علاقائی ناولوں کی فہرست میں سے ایک اہم ناول شمار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے دوسرے ناولوں میں علاقائی خصوصیات موجود ہیں۔ ابھی گزشتہ سال ہان کانگ کے ناول 'دی ویجیٹیرین' کو نوبل انعام دیا گیا ہے۔ یہ ناول بھی علاقائی زبان میں لکھا گیا ہے اور مقامی تہذیب وثقافت اور مسائل وموضوعات کو پیش کرتا ہے۔

علاقائی ادب کا مطلب وہ ادبی فن پارے ہیں جو کسی مخصوص خطے کے زبانی خلقیے کو جذب کر لیتے ہیں اور وہاں کی ثقافت وتہذیب اور معاشرتی ماحول اس علاقائی زبان میں ترویج پاتے ہیں۔ علاقائی ادب کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ زبان وتہذیب اور سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ اس خطے کے مسائل وموضوعات اور اسلوب وانداز اور کردار اور ذہنی عوامل نے بھی مصنّفین کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ ہندوستان میں بہت ساری علاقائی زبانوں میں ادب کی تخلیق ایک حیران کن واقعہ ہے۔ ترجمہ شدہ علاقائی ادب زندگی کے وسیع، گھنے اور گہرے تجربے اور گوں ناگوں علاقائی خصوصیتوں کی سطح پر ہمارے افکار وجذبات کو متاثر کرتے ہیں۔ بھارت سرکار نے ہمیشہ علاقائی ادب پر خصوصی توجہ دی ہے اور ہندوستان کی چوبیس زبانوں کی ترویج وترقی کے لیے کوشاں رہی ہے۔ ان ہندوستانی زبانوں میں جہاں زبان کی سطح پر تنوع ہے، وہیں ان کا ادب پورے ملک کی فکری اور ادبی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علاقائی زبانوں میں لکھے گئے ادب کو ترجمہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ علاقائی ادب کی پوری دنیا تک رسائی کے لیے ترجمہ ہی واحد راستہ ہے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب نئی ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کی وجہ سے علاقائی ادب کی نئے سمت ورفتار سے آشنائی ہو رہی ہے اور اسے سوشل میڈیا کے ذریعہ اپنے علاقوں سے باہر پوری دنیا میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

شمس اقبال

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2025 کا شمارہ بروقت باصرہ نواز ہوا، ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی اردو زبان و ادب کی قدر و منزلت کا استعارہ ہے، اس دورِ پرآشوب میں اردو زبان و ادب کی آبیاری کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ تمام مشمولات معیاری اور اردو درس و تدریس کے نصاب کے تقاضوں کو پُر کرتے ہیں۔ اردو دنیا کا ہر شمارہ تپتے ہوئے صحرا میں ابرِ کرم کا بدل ہے۔

رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جمشید پور، جھارکھنڈ

اردو دنیا ہندوستان کا ایک باوقار رسالہ ہے جو تقریباً ستائیس برسوں سے لگاتار شائع ہو رہا ہے اور اپنے قارئین کو مختلف النوع مضامین، تبصرات اور اردو سے متعلق خبروں سے آگاہ کر رہا ہے۔ اردو دنیا کے قارئین اس کا ہر ماہ بے صبری سے انتظار کرتے ہیں، یہ اس رسالے کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اداریے میں یوگا کی اہمیت و افادیت اور اس کی تاریخ پر بہت ہی منظم گفتگو کی گئی ہے۔ 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کی آرا کو جگہ دی گئی ہے۔ مشمولات کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہمیشہ کی طرح مضامین کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون محمد جہانگیر عالم کا سماجی رویے اور معذور طلبا ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ اس میں معذور طلبا کے حوالے سے بہت اہم گفتگو کی گئی ہے۔ معذور طلبا کے لیے جو رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں ان رکاوٹوں کو کیسے اور کس طرح دور کیا جا سکتا ہے اسے مختلف مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ آج جب کہ زندگی کے ہر شعبے میں ٹیکنالوجی حاوی ہے معذور طلبہ بھی خود کو بااختیار بنانے میں اس کا مثبت استعمال کر سکتے ہیں۔ ٹیکنالوجی نے معذور طلبہ کے لیے نئے دروازے کھول دیے ہیں اور انھیں وہ رکاوٹیں عبور کرنے میں مدد دی ہے جو پہلے ناممکن لگتی تھیں۔ یوگا پر ایک خصوصی گوشہ ہے جس کے تحت تین مضامین نازش احتشام اعظمی، رئیس احمد اور عبدالعلیم کا ہے۔ مجھے رئیس احمد کا مضمون یوگ شعور کی تہہ میں اترتا سکون بے حد پسند آیا۔ اس میں یوگ کی تعریف، یوگ کی تاریخ اور یوگ کے فوائد کو مختلف حوالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ یوگا کے بہت سے فوائد ہیں جیسے اس سے جسمانی صحت، ذہنی سکون، روحانی ترقی، دائمی مسائل کا حل، ہارمونل توازن اور جوانی اور تازگی وغیرہ کا حصول ممکن ہے۔ یوگا کوئی معمولی ورزش نہیں بلکہ ایک ایسی قدیم مشق ہے جو جسم، دماغ اور روح کو ایک خوب صورت ہم آہنگی میں

باندھتی ہے۔ یوگا اصل میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے سکون اور صحت کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے ان دونوں پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر ہی اس کی افادیت اور اہمیت کو کماحقہ سمجھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عباس رضا نیر کا مضمون پروفیسر محمود الٰہی زخمی گورکھپوری حیات و خدمات بھی اچھا مضمون ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا کماحقہ علم ہو جاتا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مختلف اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور ان کی شاعری بھی کافی پسند کی جاتی تھی ایسی اہم شخصیت

پر شاندار مضمون کے لیے مضمون نگار کو دلی مبارکباد۔ نثار احمد کا مضمون بلراج مین را بطور افسانہ نگار بھی اچھا مضمون ہے۔ اس مضمون میں بلراج مین را کی افسانہ نگاری اوران کے فن پر خاطر خواہ گفتگو کی گئی ہے۔ مصنوعی ذہانت اوراردو امکانات اور جدید رجحانات بھی بے حد معلوماتی مضمون ہے جسے راشد قادری نے تحریر کیا ہے۔ اس طرح کے مضامین کی ضرورت ہے اور مدیر محترم سے درخواست ہے کہ اس طرح کے اور مضامین کو اس رسالے میں جگہ دی جائے تا کہ اردو کے قارئین بھی نئی نئی ٹیکنالوجیز اوراس کے فوائد سے واقف ہوسکیں۔ تصوف اور بھکتی عبدالحی کا شاندار مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تصوف اور بھکتی کے حوالے سے بڑی کارآمد اور مدلل گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ اس خوب صورت اور دیدہ زیب رسالے کے لیے میں مدیر، نائب مدیر، مشیر اور معاونین کو مبارکباد دیتا ہوں کہ صرف ایک سو صفحات میں اتنی اہم اور معلوماتی چیزوں کو سمیٹ دیا ہے۔

ابصار: شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی 2025 کے شمارے میں معنویت سے بھرپور اردو حروف تہجی کو شائع کیا گیا ہے تا کہ نسل نو اردو زبان سیکھے اور جو ناواقف ہیں وہ بھی اردو سیکھ سکیں۔ 'ہماری بات' میں مدیر نے مادری زبان کی اہمیت، عظمت، افادیت وفوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ یقیناً مادری زبان اردو پڑھنے، لکھنے سے فرد کی شخصیت سازی، کردار سازی، سیرت سازی، اخلاق سازی اور روحانیت سازی ہوتی ہے اور اخلاق و تہذیب جنم لیتی ہے اس لیے اردو زبان نسل نو کو سکھانا ناگزیر ہے۔ 'ربط و التفات' کا کالم تنقیدی شعور عطا کرتا ہے اور شمارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ ایاز احمد خاں کا مضمون 'مادری زبان میں درس و تدریس' اچھا مضمون ہے۔ ابراہیم افسر نے بابا فریدالدین گنج شکر اور ان کے کلام میں ان کی حیات اور کرشمہ کرامات کلام کا حوالہ دے کر تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہندوستان قدیم زمانے سے رشیوں، منیوں، جوگیوں، درویشوں، فقیروں، ولیوں، صوفیوں، بزرگوں کا ملک رہا ہے۔ محمد مستحسن کا الطاف حسین

حالی بہ حیثیت غزل گو اچھا مضمون ہے اور مجھے اس کو پڑھ کر اچھا لگا۔ قسیم اختر نے 'اردو غزل میں کرداروں کی اہمیت' پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ محمد اکبر نے 'خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت' میں خواجہ صاحب کے انشائیوں کی مختلف خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ عبدالرزاق زیادی نے 'غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ غیاث احمد گدی کے افسانے بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ زبان وتعلیم، ادب زاویے اور جہات، شخصیات، یاد رفتگاں، جہان آگہی، کتاب دریچہ، ٹیکنالوجی، تراجم، شمع راہ، خسرو شناسی، خصوصی گفتگو، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا، خبرنامہ کے تحت مضامین میں جو مواد پیش کیا گیا وہ عام قاری کے علاوہ اردو زبان و ادب کے طلبا و اسکالر کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس کا باقاعدہ مطالعہ کر کے اردو کے JRF Net و دیگر مسابقتی امتحانات میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ رسالوں کی دنیا کا یہ واحد پرچہ ہے جس میں مختلف موضوعات پر تنقیدی، تحقیقی مضامین پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اردو دنیا کے اسٹاف کو صمیم قلب سے مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ حضرات اردو قارئین کی ذہنی، علمی، ادبی آبیار کر رہے ہیں۔ 100 صفحات میں ادب کے تعلق سے بہت کچھ ملے گا جو آپ چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ واکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل: 9603018825

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبان ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

طبع انسانی اور آغازِ تعلیم

مصنف: ڈی ایس گورڈن
مترجم: خلیل الرحمٰن سیفی پریمی

تعلیم اور حصول تعلیم

نسلِ انسانی جتنی پرانی ہے تعلیم بھی تقریباً اتنی ہی پرانی ہے۔ اصل میں انسان اپنی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت کی بنا پر ہی ادنیٰ درجے کے حیوانات سے ممیّز سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم دنیا میں حیوانات کی ادنیٰ قسم امیبا سے لے کر اعلیٰ قسم یعنی دودھ پلانے والے حیوانات تک کی شکلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی ایک اہم خصوصیت تعلیم پذیری نظر آتی ہے۔ ادنیٰ درجے کے اجسام نامی کو صریحی طور پر تعلیم نہیں دی جا سکتی اور جیسے ہی ہم اس سطح سے اوپر پہنچتے ہیں ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس نوع کے حیوانات میں حصول تعلیم کے آثار نمایاں ہیں۔ حالیہ برسوں میں اس قسم کے حیوانات مثلاً سفید چوہوں، خرگوشوں، امریکی چوہوں، گھوڑوں اور کتوں میں حصول تعلیم کی پرکھ کے لیے اختبارات کیے گئے ہیں۔ ان اختبارات نے ادنیٰ درجے کے حیوانات میں ان کی تجربے سے سیکھنے کی قابلیت کے بجائے ان کے حصول تعلیم کے حدود کو واضح کر دیا ہے جو ذہانت کی یقینی علامت ہے۔

مثال کے طور پر، پروانے کو لیجیے۔ شمع، رات کو روشن ہوتی ہے اور پروانہ روشنی کی جانب مائل ہوتا ہے۔ وہ شعلے یا بجلی کے بلب تک پہنچتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ اس کے پر جھلس گئے لیکن وہ اس تجربے سے بھی کچھ نہیں سیکھتا۔ وہ اس پر بار بار گرتا ہے یہاں تک کہ مر جاتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پروانے میں حصول تعلیم بدرجہ صفر ہے۔

ہمیں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ شہد کی مکھی اور چیونٹی ذہین مخلوقات ہیں۔ لوگوں نے ادب میں شہد کی مکھی کے چھتہ بنانے کے ہنر کی توصیف کی ہے۔ انھوں نے

حالیہ برسوں میں اس قسم کے حیوانات مثلاً سفید چوہوں، خرگوشوں، امریکی چوہوں، گھوڑوں اور کتوں میں حصول تعلیم کی پرکھ کے لیے اختیارات کیے گئے ہیں۔ ان اختیارات نے ادنی درجے کے حیوانات میں ان کی تجربے سے سیکھنے کی قابلیت کے بجائے ان کے حصول تعلیم کے حدود کو واضح کر دیا ہے جو ذہانت کی یقینی علامت ہے۔

چھتے کے خانوں کی باقاعدہ اقلیدی شکل اور شہد جمع کرنے کی محنت کو سراہا ہے۔ اسی طرح چیونٹی کے اناج اکٹھا کرنے اور ذخیرہ کو مستقبل میں کام لانے کی پیش بینی کو سراہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت سلیمان کے قول کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے:

''اے آرام طلب شخص! چیونٹی کے پاس جا، اس کی روش پر غور کر اور عقل مند بن جا۔''

یہ اور اسی طرح کے اقوال ہمارے لیے اخلاقی سطح پر مفید ہو سکتے ہیں لیکن سائنسی نقطۂ نظر سے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مخلوقات صرف ان ہی باتوں پر عمل پیرا ہوتی ہیں جنھیں ان کی طبع نے ان کا مقدر بنا رکھا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کی زندگی پر کلیۃً جبلت کی فرماں روائی ہوتی ہے۔

مہیج جوابی عمل

ماہرین نفسیات اس رائے پر متفق ہیں کہ آموزش بنیادی طور پر مہیج اور جوابی عمل کا معاملہ ہے۔ فرض کیجیے ایک مخلوق کا کسی خاص انداز میں ایک مخصوص مہیج کے تحت جوابی عمل ہوتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ بعض غیر تشفی بخش یا ناخوش گوار نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ پھر اگر شاید چند ناکام کوششوں کے بعد، وہ اپنے جوابی عمل کو مناسب طور پر بدل دیتی ہے اور اس طرح خاطر خواہ نتائج حاصل کر لیتی ہے تب ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ

مخلوق تعلیم پذیر ہے۔

مثلاً فرض کیجیے کہ ایک ڈبے میں غذا رکھ دی گئی ہے اور چوہا کئی ناکام کوششوں کے بعد غذا والے خانے کے دروازے کو کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر اس تجربے کے بعد ناکام کوششوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ اس بنیاد پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس مخلوق میں تجربے سے سیکھنے کی کچھ صلاحیت موجود ہے۔

آموزش میں سعی و خطا کا یہ طریقہ، حصول تعلیم کی جانب ایک اشارہ ہے۔

طویل المدت طفولیت کی اہمیت

انسان کے علاوہ اکثر جان دار صرف جبلت کی رہنمائی میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے نوزائیدوں کو اس معاملہ میں مکمل طور پر وہ جوہر ودیعت ہوا ہے کہ وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کا اہتمام کر سکتے ہیں اور اپنے والدین کی بہت کم مدد کے سہارے پروان چڑھ سکتے ہیں۔ ان کی مجبوری کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک انسان کے بچے کا اس چھوٹے چوزے سے موازنہ کیجیے جو ابھی انڈے سے نکلا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں چوزہ خود کو سنبھالنے کے لائق ہو جاتا ہے جب کہ آدمی کا بچہ لاچاری کے تحت مہینوں حتی کہ برسوں اپنی ماں کا دست نگر رہتا ہے۔ یہ طویل المدت بے چارگی اور ناپختگی کا زمانہ تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اگر دوسرے حیوانات کی طرح انسان کے بچے کو پیدائش کے وقت اتنے مکمل طور پر ایک مجموعہ جبلت ودیعت ہوتی تو اس کی آموزش کی صلاحیت واقعی بہت محدود ہو جاتی۔

انسان کا بچہ اپنے پورے دور انحصار میں کردار کے بعض نمونے ان لوگوں سے سیکھتا ہے جنھیں وہ دیکھتا ہے اور ان کی نقل کرتا ہے۔ انسانی بچہ جن لوگوں کو دیکھتا ہے اور نقل اتارتا ہے وہ ان لوگوں سے اپنے دور انحصار میں مخصوص کردار سیکھتا ہے۔ یہ اس کا سماجی ورثہ ہے جو اس کے جسمانی ورثہ سے ممیز ہے۔ ادنیٰ حیوانات تقریباً مکمل طور پر ترقی یافتہ جبلتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی صرف جبلی سطح ہی پر گزرتی ہے اس لیے ایک نسل سے دوسری نسل تک کوئی فروغ یا ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ ہمارے گرد و پیش کے پرند اور چرند کسی طرح اس سے مختلف طور پر زندگی بسر نہیں کرتے جس طریقے پر ان کے آبا و اجداد صدیوں سے زندگی گزار چکے ہیں۔ ان کے کردار کے انداز متعین اور تقریباً غیر مقلب نظر آتے ہیں۔ اور اگر ایک نسل اپنے والدین سے کچھ سیکھ بھی لے تو یہ بات بہت مشتبہ ہے کہ یہ اکتسابی خصوصیات آئندہ نسل میں ورثہ کے طور پر پہنچ جاتی ہیں۔ اکتسابی خصوصیات کے سلسلے میں اختیارات کیے گئے ہیں اور اب بھی کیے جاتے رہے ہیں لیکن نتائج قطعی تصفیہ کن نہیں ہیں۔

سماجی ورثہ کی ترسیل

اس لیے فی الحال ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر نسل بالکل ابتدا سے سیکھتی نظر آتی ہے اور دوسری نسل تک بمشکل ہی آموزش کی ترسیل ہوتی ہے لیکن بنی نوع انسان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ ہم نہ صرف اپنے ذاتی تجربوں سے سیکھتے ہیں بلکہ دوسروں کے تجربے کی بنیاد پر بھی سیکھتے ہیں دوسرے لفظوں میں ہمارے اندر لامتناہی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسل انسانی صدیوں میں جو کچھ سیکھتی ہے اس کو ضرور محفوظ رکھنا اور نسل در نسل منتقل کرتے رہنا چاہیے۔ ایک اہم بات جس نے ہمیں اس کام میں سہارا دیا ہے وہ قوت گویائی ہے۔ ادنیٰ حیوانات میں اگر خیالات ہوں بھی تو وہ ان کی ترسیل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے بعض بنیادی جذبات مثلاً خوشی اور خوف کے لیے بلند آوازیں پیدا کر لی ہیں۔ بہر حال انسان نے نہ صرف تقریر بلکہ تحریر کو جنم دیا ہے جو اس کے سماجی ورثہ کی ترسیل کے لیے نہایت قابل قدر آلہ کار ہے کیونکہ اس میں ثبات ہے۔ ایک شخص نے جو کچھ کہا ہے وہ کچھ عرصے کے بعد بھلا دیا جا سکتا ہے لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

انسان صدیوں میں اس بیش قیمت ورثہ کو نسل در نسل پہنچانے کی ضمانت کے لیے قدم اٹھائے ہیں؟ اس نے کس طرح اس بات کا اطمینان کر لیا ہے کہ ریاضت و کاوش سے حاصل کیا ہوا علم تلف نہ ہوگا بلکہ وہ محفوظ رہے گا اور منتقل ہوتا رہے گا اور بعد کی نسلیں اس میں اضافہ اور ترقی کرتی رہیں گی۔ ان سوالوں کا جواب ایک لفظ یعنی تعلیم میں مل سکتا ہے۔ انسان نے اپنی نشو و نما کی ہر منزل پر ہمیشہ تعلیم کا کچھ نہ کچھ اہتمام کیا ہے۔

تعلیم کیا ہے؟

یہ بات ہمیں اس امر کی تفتیش تک لے جاتی ہے کہ تعلیم کیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے اور اس کا جواب دینا آسان نہیں ہے جیسا کہ سر جان ایڈمس نے ظریفانہ انداز میں کہا ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ کتا کیا ہے لیکن اگر ایک ہال میں روشن خیال لوگوں کے مجمع کو سزائے موت کا خطرہ دلا کر کتے کی تعریف بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو اس ہال میں بھیا تک اتلاف جان واقع ہوگا۔ اس بیان میں جو نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم بہت سی چیزوں کو جانتے یا جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں جن کی ہم ٹھیک ٹھیک تعریف بیان نہیں کر سکتے۔ بہر حال یہ ایسی کوئی نئی چیز نہیں ہے جس کو ہم نئی نسل والوں نے دریافت کیا ہے۔ یہ تحقیق اتنی ہی قدیم ہے جتنا سقراط۔ نیک نام سقراط کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر صبح کو اپنے گھر سے نکل جاتا تھا اور ایتھنز کی سڑکوں پر اپنے شکار کی تلاش میں گھوما کرتا تھا۔

دور ہی سے وہ انھیں دیکھ لیتا تھا اور اتنی احتیاط سے ان کے قریب پہنچتا تھا جیسے مکھی کے پاس مکڑہ پہنچتی ہے۔ ان سے ملاقات کے بعد وہ بظاہر معصوم انداز میں موسم یا کسی معمولی معاملہ کے متعلق بات چیت کا آغاز کرتا تھا اور پھر دھیرے دھیرے ان کو پھسلا کر مشکلات میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ ان سے ان الفاظ کی تعریف پوچھتا تھا جو انھوں نے گفتگو میں استعمال کیے تھے۔ وہ ان سے معلوم کرتا تھا کہ صداقت، حسن، نیکی وغیرہ کا ان کے نزدیک کیا مفہوم ہے۔ وہ جب انھیں ایہام اور تناقض بالذات میں مبتلا کر لیتا تھا، وہ جب ان فلسفیوں کی بے مائیگی علم کو بے نقاب کر دیتا تھا جنھوں نے دوسروں کو درس دینے کے لیے اکادمی قائم کر رکھی تھیں، اس وقت سقراط خاموشی سے چل دیتا تھا۔ سقراط کی سب سے اہم تعلیم یہ تھی کہ لاعلمی کا شعور ہی علم کا آغاز ہے۔

رسمی اور غیر رسمی تعلیم

تعلیم ایک ایسا لفظ ہے جس کی تعریف بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ لوگ اس کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف وہ عمل ہے جو مدرسوں اور کالجوں میں برتا جاتا ہے لیکن سچ پوچھیے تو تعلیم اپنے وسیع معنوں میں ایک طریق عمل ہے جو پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور موت پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح تعلیم کے بارے میں سوچنے کے دو انداز ہیں:

1. غیر رسمی اور 2 رسمی

غیر رسمی تعلیم میں تبدیلی لانے والے وہ تمام اثرات شامل ہیں جن کے تحت ایک شخص کو زندگی بھر رہنا پڑتا ہے جب کہ رسمی تعلیم اس طرف اشارہ کرتی ہے جو گھر، گرجا یا مدرسہ جیسے بعض تعلیم دینے والے وسائل کے ذریعہ شعوری طور پر عمل میں لایا جاتا ہے۔

غیر رسمی تعلیم جیسی بھی ہے اچھی ہے لیکن اس کی بعض حدود ہیں اولاً تو وہ غیر منتظم ہے۔ جن تجربات کو وہ پیش کرتی ہے ان کا انحصار اتفاق پر ہوتا ہے۔ یہ تجربات منظم نہیں ہوتے اور کسی منطقی ترتیب یا تاریخی تسلسل کے تحت پیش نہیں کیے جاتے۔ لہٰذا جو علم پہنچانا مقصود ہوتا ہے اس کے اندر بہت سے خلا باقی رہ جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تجربے سے سیکھنا، فضول، خطرناک اور مہنگا ثابت ہوسکتا ہے بعض باتیں ذاتی تجربے سے سیکھی جا سکتی ہیں لیکن بیشتر باتوں کو نسل انسانی کے اجتماعی تجربے سے سیکھنا پڑتا ہے۔ رومن کہاوت ہے کہ ''آرٹ عریض ہے اور وقت کے پر لگے ہیں۔'' تاوقتیکہ انسانی زندگی ستر برس کی عام عمر سے غیر معمولی طور پر طویل نہ ہو جائے ہر چیز کو تجربے سے سیکھنے کی کوشش کرنا یقیناً عمل رائگاں ثابت ہوگا۔

''
تعلیم ایک ایسا لفظ ہے جس کی تعریف بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ لوگ اس کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف وہ عمل ہے جو مدرسوں اور کالجوں میں برتا جاتا ہے لیکن سچ پوچھیے تو تعلیم اپنے وسیع معنوں میں ایک طریق عمل ہے جو پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور موت پر ختم ہوتا ہے۔
''

لیکن یہ خطرناک اور مہنگا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آگ سے جلا ہوا بچہ آگ سے ڈرتا ہے۔ ایک بچہ جس کی انگلیاں جھلس گئی ہیں آگ کے نزدیک پھر کبھی نہیں جائے گا۔ بچے نے ذاتی تجربے سے کچھ سیکھا ہے لیکن اس طرح کا تجربہ بعض اوقات بہت زیادہ مہنگا پڑ سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک بچہ ایسے تار کو چھوتا ہے جس میں بجلی دوڑتی ہے۔ وہ فوراً مر سکتا ہے۔ اس تجربے سے اس بچے کو مرنے کے بعد کیا فائدہ پہنچے گا۔ تاہم تعلیم کے موضوع پر لکھنے والے عظیم مصنفین نے بتایا ہے کہ تجربے سے سیکھنا ہی کسی چیز کو سیکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔

مثلاً روسو نے کہا تھا کہ اس کا ایمیل فطرت سے ہر بات کو سیکھ لے گا اور اس کو کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ بعدازاں ہربرٹ اسپنسر نے نظریہ تعزیر سے بحث کرتے ہوئے اپنے فطری نتائج کے مشہور نظریہ کو پیش کیا جس کے مطابق اس کا یہ عقیدہ تھا کہ فطرت کی طرف سے جو سزا ملتی ہے وہ انسان کی دی ہوئی سزا کے مقابلے میں زیادہ برتر ہوتی ہے۔ اس نے بتایا کہ قدرتی سزائیں ناگزیر ہوتی ہیں اور یہ کہ جب قدرت کسی شخص کو سزا دیتی ہے تو وہ خود بخود کچھ نہ کچھ اس تجربے سے سیکھ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک شخص ضرورت سے زیادہ کھا لیتا ہے یا کوئی ایسی غذا کھاتا ہے جس سے بدہضمی ہو جائے تو وہ سیکھ لیتا ہے کہ اگلی بار اس غلطی سے کیسے بچا جائے۔

یہی خیال کہ تجربہ ہی بہترین مکتب آموزش ہے، ہماری حالیہ تعلیمی ترقی میں ظاہر ہوتا ہے جیسے اکتشافی طریقہ۔ اس طریقے کے مطابق شاگرد کو کسی چیز پر پہلے سے یقین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو ہر بات کی خود تفتیش کرنا چاہیے۔ اس طریق کار کی اہمیت کو بحیثیت ایک طریق آموزش سے بے تامل تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ بغیر سمجھے ہوئے کتابی آموزش یا کسی بتائی ہوئی بات کی بنیاد پر آموزش کے لیے طریقہ اصلاح کا کام کرتا ہے۔ یہ شخصی تجربے کے ذریعے آموزش کو حقیقی بناتا ہے۔ لیکن اس طریقے سے آپ ہر ایک بات نہیں سیکھ سکتے کیونکہ اس طریقے میں مذکورہ بالا غیر رسمی تعلیم کی تمام کوتاہیاں شامل ہو جاتی ہیں۔

دوسری طرف رسمی تعلیم میں بعض یقینی فائدے ہیں۔ یہ غیر منظم نہیں ہے۔ اس سے ہمارے علم میں خلا باقی نہیں رہتا۔ اس کے تحت ان تمام تجربات کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کو نسل انسانی نے سودمند سمجھا ہے اور ان تجربات کو بچے کے سامنے منظم اور مرتب انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں بچہ ضروری باتوں کو مناسب وقت پر سیکھ لیتا ہے۔

■

ماخذ: اصول تعلیم اور عمل تعلیم، **مصنف:** ڈی ایس گورڈن، **مترجم:** ڈاکٹر خلیل الرحمن سیفی پریمی، **تیسری طباعت:** 2016، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سید محمد کہف الوری

ہندوستانی علمی ورثہ اور جدید تعلیمی نظام

ہندوستانی علمی نظام (IKS) ہزاروں سالوں میں ترقی پانے والا ایک اہم نظام ہے، جو آیورویدمیں صحت عامہ، یوگا اور مراقبہ کے ذریعے جسمانی و ذہنی نشوونما، ویدک ریاضی، ماحولیاتی نظم و نسق، فلکیات، تعمیرات، اور فلسفے جیسے شعبوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظام وید، اپنشد، اور پران جیسے قدیم متون پر مبنی ہے اور زندگی کو ایک ہمہ گیر اور مربوط انداز میں دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے، جو اخلاقی طرز زندگی اور ماحولیاتی تحفظ کے اصولوں پر مبنی ہے۔ IKS درحقیقت ایسے اصولوں اور عملی طریقوں کا مجموعہ ہے جو فرد کی فلاح و بہبود اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں، جہاں فکری پختگی اور روحانی گہرائی ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔

تاہم، ہندوستانی علمی نظام کی اس وسعت اور گہرائی کے باوجود، جدید تعلیمی نظام مغربی ماڈل پر مبنی ہے، جو تکنیکی اور سائنسی علوم کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس وجہ سے روایتی علمی نظام اور جدید تعلیم کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہوگئی ہے، جس کے نتیجے میں نئی نسل اپنی ثقافتی وراثت سے کم واقف ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں ثقافتی شناخت اور مقامی دانش کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے، حالانکہ یہی علم جدید دور میں ذہنی صحت، ماحولیاتی پائیداری، اور اخلاقی حکمرانی کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

اس خلیج کو پر کرنے کے لیے قومی تعلیمی پالیسی 2020 (NEP 2020) نے ہندوستانی علمی نظام کو مرکزی دھارے میں شامل کرنے کی بنیاد رکھی ہے، جو ثقافتی شناخت کو تقویت بخشنے اور علم کے ایک ہمہ گیر تصور کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ IKS کو نصاب میں مؤثر انداز میں کیسے شامل کیا جائے؟ اسے جدید سائنسی معیارات پر کیسے پرکھا اور مستند بنایا جائے؟ اور ان ثقافتی و نسلی تعصبات پر کیسے قابو پایا جائے جو اکثر مقامی علمی ورثے کی قدر کم کرنے کا سبب بنتے ہیں؟

یہ مضمون IKS کو ایک جامع تعلیمی وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی نصاب میں شمولیت کے راستے میں حائل بڑی رکاوٹوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ مزید برآں، ہم ہندوستانی علمی نظام کے بنیادی عناصر کو جدید تعلیمی ضروریات اور سماجی تقاضوں کے مطابق ترتیب دیتے ہیں۔ آخر میں، ہم اس نظام کے ریکارڈ کی عدم دستیابی، نصابی شمولیت، سائنسی توثیق، اور عالمگیریت سے جڑے چیلنجز پر روشنی ڈالتے ہیں اور پالیسی سازوں، ماہرین تعلیم اور محققین کے لیے ایسی حکمت عملیوں اور سفارشات کا خاکہ پیش کرتے ہیں جو IKS کے فروغ اور تحفظ کو یقینی بنا سکیں، تاکہ روایتی علم اور جدید دنیا کے تقاضوں کے درمیان ایک متوازن ہم آہنگی قائم کی جا سکے۔

ہندوستانی علمی نظام (IKS) ہندوستان کی ثقافتی اور روحانی زندگی کے ساتھ گہرے طور پر جڑا ہوا ہے۔ ویدک متون، جو 1500 سے 500 قبل مسیح کے دوران مرتب کیے گئے، کائنات، فلکیات، اخلاقیات اور فنون کے مختلف شعبوں میں ہمہ گیر علم کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، بھگوت گیتا جیسے متون نفسیاتی استحکام اور مثبت طرز عمل کے اصول فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح، بدھ مت اور جین مت نے عدم تشدد، اجتماعی فلاح و بہبود، اور مراقبے کی تعلیمات کے ذریعے IKS کو مزید وسعت دی۔ اس عظیم علمی ورثے کی جھلک ان مختلف شعبوں میں دیکھی جا سکتی ہے جنھوں نے نوآبادیاتی دور میں مغربی سائنس پر اثر ڈالا، جب ہندوستانی طب اور ریاضی جیسے علوم کے ابتدائی تراجم کیے گئے۔

ہندوستان کا موجودہ تعلیمی نظام بڑی حد تک نوآبادیاتی دور کی میراث ہے اور مغربی تعلیمی ماڈلز سے جڑا ہوا ہے، جو تکنیکی اور صنعتی مہارتوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور مقامی دانش کو کم اہمیت دیتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 (NEP 2020) نے اس ضرورت کو تسلیم کیا ہے کہ ہندوستانی علمی نظام کو مرکزی نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ ثقافتی شناخت، پائیدار طرز زندگی، اور ہمہ گیر نشوونما کو فروغ دیا جا سکے۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ IKS میں موجود ویدک ریاضی اور آیوروید جیسے علوم تنقیدی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی مہارتوں کو فروغ دیتے ہیں اور علم کو دیکھنے کا ایک متبادل نظریہ پیش کرتے ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ ہندوستانی علمی نظام کو جدید تعلیمی نظام میں اس طرح ضم کیا جائے کہ وہ اپنے اصل جوہر کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تعلیمی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ پالیسی سازوں، ماہرین تعلیم، اور محققین کو ایسی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے جو IKS کو مؤثر طریقے سے تعلیمی نصاب میں شامل کرے، تاکہ طلبہ مقامی علمی ورثے سے جڑے رہیں اور اسے جدید دور کی ضروریات کے مطابق بروئے کار لایا جا سکے۔

آیوروید ہندوستان کا قدیم طبی نظام ہے، جو جسم، ذہن اور ماحول کے درمیان توازن پر زور دیتا ہے۔ یہ نظام جسمانی اور ذہنی صحت، احتیاطی تدابیر، متوازن غذا، جڑی بوٹیوں کے علاج، اور طرز زندگی میں تبدیلی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ آیوروید کے بنیادی اصول، جیسے دوشہ (Doshas) یا جسمانی مزاج، موجودہ دور میں ذاتی نوعیت کی طبی سہولیات (Personalized

(Medicine) کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ذہنی صحت وطرز زندگی سے متعلق بیماریوں کے علاج میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

یوگا اور مراقبہ ہندوستانی علمی نظام کا بنیادی حصہ ہیں، جو افراد کو ذہنی وضاحت، جسمانی صحت، اور روحانی ترقی حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ آج دنیا بھر کے اسکولوں میں جسمانی تعلیم کے ایک حصے کے طور پر یوگا پڑھایا جاتا ہے، جو اس کی عالمی مقبولیت اور اثر انگیزی کی علامت ہے۔ جسمانی فوائد کے علاوہ، IKS سے ماخوذ مراقبہ کی مشقیں، جیسے وپاسنا (Vipassana)، ذہنی دباؤ کو کم کرنے، ذہنی آگاہی بڑھانے، اور جذباتی لچک کو فروغ دینے میں مدد دیتی ہیں۔

ویدک ریاضی ذہنی حساب کتاب کا ایک متبادل نظام پیش کرتی ہے، جو طلبہ کی علمی صلاحیتوں اور مسئلہ حل کرنے کی مہارتوں کو بہتر بناتی ہے۔ یہ نظام قدیم سنسکرت متون سے ماخوذ ہے اور طلبہ میں ذہنی چستی، تیز رفتاری، اور درستگی پیدا کرتا ہے، جو خاص طور پر ان طلبہ کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے جو روایتی ریاضی کے طریقوں میں مشکلات محسوس کرتے ہیں۔ تعلیمی ادارے اب ویدک ریاضی کو استعمال کر رہے ہیں تا کہ طلبہ کی ریاضیاتی مہارت اور اس میں دلچسپی کو فروغ دیا جا سکے۔

ہندوستانی علمی نظام میں روایتی ماحولیاتی علم (TEK) زرعی پیداوار، پانی کے تحفظ، اور جنگلاتی نظم و نسق جیسے پہلوؤں کو شامل کرتا ہے۔ یہ جدید ماحولیاتی چیلنجز جیسے ماحولیاتی تبدیلی (Climate Change) کے لیے پائیدار متبادل پیش کرتا ہے، جو ماحولیاتی تحفظ اور وسائل کے دانشمندانہ استعمال کو فروغ دیتا ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ماحولیاتی تعلیم میں روایتی ماحولیاتی علم کو شامل کرنا ضروری ہے تا کہ پائیدار ترقی کو فروغ دیا جا سکے اور حیاتیاتی تنوع (Biodiversity) کے احترام کو یقینی بنایا جا سکے۔

ہندوستانی علمی نظام کے یہ بنیادی اجزا نہ صرف تعلیمی و سائنسی ترقی کے لیے مفید ہیں بلکہ معاشرتی و ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا، تعلیمی پالیسی سازوں اور ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ وہ IKS کو جدید نصاب میں اس انداز میں شامل کریں کہ روایتی اور جدید علوم کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

ہندوستانی علمی نظام (IKS) کو جدید تعلیم میں ضم کرنے سے سیکھنے کے عمل کو مضبوط بنانے، ثقافتی ورثے کو فروغ دینے اور موجودہ دور کے چیلنجز کے حل کے لیے بے شمار مواقع حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ IKS کو سمجھنا اور اس کی قدر کرنا ایک ایسا نصاب تیار کرنے کے دروازے کھولتا ہے جو طلبہ کی ثقافتی شناخت سے براہ راست جڑا ہو۔ درج ذیل پہلو IKS کے تعلیمی مواقع کو عملی جامہ پہنانے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

جدید نصاب میں IKS کے انضمام سے ہمہ گیر (holistic) ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، جو آج کے سماج کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ IKS علم کے باہمی تعلق پر زور دیتا ہے، جس سے صحت، ماحولیاتی

ہندوستانی علمی نظام میں روایتی ماحولیاتی علم (TEK) زرعی پیداوار، پانی کے تحفظ، اور جنگلاتی نظم و نسق جیسے پہلوؤں کو شامل کرتا ہے۔ یہ جدید ماحولیاتی چیلنجز جیسے ماحولیاتی تبدیلی (Climate Change) کے لیے پائیدار متبادل پیش کرتا ہے، جو ماحولیاتی تحفظ اور وسائل کے دانشمندانہ استعمال کو فروغ دیتا ہے۔

تحفظ اور اخلاقی زندگی جیسے شعبوں میں جامع تفہیم پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، آیورویدک کے روایتی اصولوں کے ذریعے، انسان صرف جسمانی صحت ہی نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی توازن بھی حاصل کر سکتا ہے، جو ایک متوازن زندگی کی بنیاد رکھتا ہے۔

تعلیم میں IKS کا تحفظ طلبہ کی ثقافتی پہچان اور فخر کو بڑھا سکتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں، جہاں ثقافتی یکسانیت (Cultural homogenization) عام ہوتی جا رہی ہے، مقامی علمی نظاموں کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنا اس کا بہترین حل ہو سکتا ہے۔ IKS کے ذریعے، طلبہ اپنی ثقافتی جڑوں کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں اور اپنے ماضی، روایات، اور تاریخ کی قدر کر سکتے ہیں۔ اس سے تعلیمی شوق میں اضافہ اور سیکھنے کی تحریک میں بہتری آتی ہے۔

IKS ماحولیاتی استحکام اور فطرت کے دانشمندانہ استعمال سے متعلق مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ روایتی ماحولیاتی علم (Traditional Ecological Knowledge) حیاتیاتی تنوع کے تحفظ اور پائیدار وسائل کے استعمال جیسے پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، روایتی زرعی طریقے جدید زراعت میں پائیداری کے اصولوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اگر ماحولیاتی تعلیم میں IKS کے عناصر شامل کیے جائیں، تو یہ طلبہ میں ماحولیاتی تحفظ کی جستجو پیدا کر سکتا ہے۔

IKS مختلف علمی شعبوں کے درمیان ربط پیدا کر کے بین العلومی (interdisciplinary) مطالعہ کو فروغ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، ویدک ریاضی منطقی استدلال (reasoning logical) اور مسئلہ حل کرنے کی مہارتوں کو بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے، جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جدید تعلیمی نصاب میں IKS کی شمولیت سے اساتذہ مختلف علوم کو آپس میں جوڑ سکتے ہیں، جس سے طلبہ کے لیے تنقیدی سوچ اور علم کی جامع تفہیم ممکن ہو سکتی ہے۔

IKS کو جدید نصاب میں شامل کرنے سے ہندوستان کی علمی میراث کو عالمی سطح پر فروغ ملے گا۔ دنیا بھر میں مقامی علمی نظاموں (Indigenous Knowledge Systems) میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے باعث، ہندوستان اپنے علمی ورثے کو عالمی سطح پر متعارف کروا سکتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر علمی تبادلہ اور تحقیق کی بنیاد پر، IKS کو جدید تعلیم میں شامل کرنے سے بین الثقافتی تفہیم کو فروغ مل سکتا ہے، جو دنیا بھر میں علم کی ترقی میں معاون ہوگا۔

IKS موجودہ معاشرتی مسائل کے حل میں بھی معاون ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، ذہنی صحت کے مسائل سے نمٹنے کے لیے IKS میں موجود دھیان (mindfulness) اور مراقبہ کی تکنیکوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ آج کے دور میں طلبہ ذہنی دباؤ اور اضطراب کا شکار ہیں، اگر تعلیمی اداروں میں IKS کی بنیاد پر یوگا اور مراقبہ کی مشقیں سکھائی جائیں، تو یہ ان کی جذباتی مضبوطی میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ہندوستانی علمی نظام کو جدید تعلیم میں ضم کرنے کے بے شمار مواقع موجود ہیں، جو تعلیمی ترقی، ثقافتی تحفظ، اور پائیدار ترقی کے لیے اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ پالیسی سازوں، ماہرین تعلیم، اور محققین کو چاہیے کہ وہ IKS کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کے لیے ٹھوس

اقدامات کریں تا کہ جدید تعلیم اور روایتی علم کے درمیان توازن قائم ہو سکے۔

ہندوستانی علمی نظام (IKS) کو جدید تعلیم میں محفوظ رکھنے اور ضم کرنے میں کئی چیلنجز درپیش ہیں۔ ان میں ثقافتی نظریات میں فرق، علمی نظاموں کی سائنسی توثیق کی ضرورت، اور مناسب تعلیمی ڈھانچے کی عدم موجودگی شامل ہیں۔ اگر IKS کو تعلیمی نظام میں مؤثر طریقے سے شامل کرنا ہے تو ان مسائل کا حل نکالنا ضروری ہے۔

عالمگیریت (Globalization) اور مغربی تعلیمی ماڈلز کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث مقامی علمی نظام جیسے IKS کو کم اہمیت دی جا رہی ہے۔ گلوبلائزیشن نے ثقافتی یکسانیت (Cultural homogenization) کو فروغ دیا ہے، جس کی وجہ سے مغربی تعلیمی اور سائنسی طریقے زیادہ مستند سمجھے جانے لگے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، جدید ہندوستانی نوجوان اپنی ثقافتی وراثت سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور IKS کو پرانے یا غیر متعلقہ تصورات کے طور پر دیکھتے ہیں۔

مزید یہ کہ، جب IKS سے متعلق علوم عالمی سطح پر مقبول ہوتے ہیں، تو ان کی اصل ثقافتی اہمیت کھو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، یوگا آج دنیا بھر میں مشہور ہے، لیکن اکثر اسے اس کی روایتی روحانی اور فلسفیانہ بنیادوں سے کاٹ کر محض جسمانی ورزش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس کی اصل معنویت کمزور ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی علمی نظام (IKS) کو جدید تعلیمی فریم ورک میں مؤثر طریقے سے ضم کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے مختلف طریقہ کار اپنائے جا سکتے ہیں۔ پالیسی سازوں، ماہرین تعلیم ڈیجیٹلائزیشن اور محققین کی اجتماعی کوششوں سے اس عمل کو تیز کیا جا سکتا ہے۔

IKS کے مخطوطات، متون، اور زبانی روایات کو محفوظ کرنے کے لیے ان کی ڈیجیٹائزیشن اور مناسب دستاویز بندی پر توجہ دی جانی چاہیے۔ حکومت اور تعلیمی اداروں کو مل کر ایسے منصوبے شروع کرنے چاہئیں، جن میں قدیم علمی ذخائر کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے محفوظ رکھا جا سکے۔ Reddy (2023) کے مطابق، "IKS کے تحفظ کے لیے ڈیجیٹلائزیشن اور ایک مربوط آن لائن ذخیرہ بنایا جانا چاہیے، جس تک عوام اور محققین کو رسائی حاصل ہو۔

مزید برآں، آیوروید، یوگا اور قدرتی وسائل کے پائیدار استعمال جیسے موضوعات پر سائنسی تحقیق کو فروغ دیا جانا چاہیے تا کہ IKS کے اصولوں کو سائنسی طور پر جانچا جا سکے۔ اس سے نہ صرف اس کی ساکھ مضبوط ہوگی بلکہ پالیسی سازوں کو اسے جدید تعلیمی نصاب میں شامل کرنے میں مدد بھی ملے گی۔

IKS کو جدید نصاب میں شامل کرنے کے لیے ایسے کورسز تیار کیے جانے چاہئیں، جو تعلیمی معیارات کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ روایتی علوم کو بھی محفوظ رکھیں۔ مثال کے طور پر، ویدک ریاضی کو جدید ریاضی کے نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے تا کہ اس کے عملی فوائد کو اجاگر کیا جا سکے۔ مزید برآں، اسکولی سطح پر IKS کے اختیاری مضامین متعارف کرائے جا سکتے ہیں، جو طلبہ کو ثقافتی علوم کی طرف راغب کریں گے، مگر بنیادی نصاب پر غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالیں گے۔

ہندوستانی تعلیمی ادارے بین الاقوامی تحقیقی تعاون کو فروغ دے سکتے ہیں تا کہ IKS کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہو اور اس کی سائنسی بنیاد کو مزید مستحکم کیا جا سکے۔ عالمی جامعات اور تحقیقی اداروں کے ساتھ مشترکہ مطالعات کے ذریعے بین الثقافتی علمی تبادلہ ممکن ہوگا، جس سے IKS کے مستند اصولوں کی ترقی ممکن ہو سکے گی۔ بین الاقوامی سطح پر تعاون سے IKS کو پائیدار ترقی اور ذہنی صحت جیسے شعبوں میں ایک قیمتی علمی شراکت کے طور پر تسلیم کروایا جا سکتا ہے۔

IKS کی افادیت اور اس کے مختلف عملی اطلاقات سے متعلق عوامی شعور بیدار کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ورکشاپس، سیمینارز، اور عوامی لیکچرز منعقد کیے جا سکتے ہیں، جن میں آیوروید، یوگا، اور ماحولیاتی پائیداری جیسے موضوعات پر گفتگو ہو۔ اسکولوں اور جامعات میں طلبہ کو مقامی ماہرین یا روایتی علوم کے ماہرین سے جوڑ کر IKS کے عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

جب IKS کی ترویج نچلی سطح سے کی جائے گی، تو طلبہ اس کی عملی افادیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے، جس سے ان میں اپنی ثقافت کے لیے فخر اور شناخت کا احساس پیدا ہوگا۔

ہندوستانی علمی نظام (IKS) ایک بھرپور ثقافتی ورثے، سائنسی بصیرت، اور جامع حکمت کا مظہر ہے، جو صدیوں سے لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جدید تعلیم کے لیے سب سے بڑا چیلنج اور موقع یہ ہے کہ IKS کو عالمی ترقی اور تکنیکی انقلاب کے ساتھ ہم آہنگ رکھتے ہوئے اسے محفوظ رکھا جائے اور تعلیمی نظام میں ضم کیا جائے۔ اگرچہ گلوبلائزیشن نے تعلیمی شعبے کو کئی فوائد پہنچائے ہیں، لیکن اس کے منفی اثرات میں IKS جیسے روایتی علوم کو حاشیے پر ڈالنا بھی شامل ہے، جس کی وجہ سے انہیں پرانے یا غیر متعلقہ سمجھا جانے لگا ہے۔ تاہم، ثقافتی ورثے، پائیداری، اور جامع تعلیم میں بڑھتی ہوئی دلچسپی نے ایک نیا موقع پیدا کیا ہے، جس کے ذریعے IKS کو ذہنی صحت، ماحولیاتی انحطاط، اور ثقافتی اجنبیت جیسے مسائل کے حل میں مؤثر طریقے سے شامل کیا جا سکتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی (NEP) 2020 نے IKS کو قومی نصاب میں شامل کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ پالیسی IKS کو ثقافتی فخر، اخلاقی ترقی، اور پائیدار طرز فکر کو فروغ دینے کے ایک اہم عنصر کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ تاہم، اس وژن کو حقیقت میں بدلنے کے لیے کئی رکاوٹوں کو عبور کرنا ہوگا، جن میں منظم دستاویز بندی کی کمی، سائنسی توثیق کے چیلنجز، اور معلمین و طلبہ کے درمیان موجود تعصبات شامل ہیں۔ ہندوستانی تعلیمی ادارے مناسب پالیسیوں، تحقیقی فنڈنگ میں اضافے، بین الاقوامی تحقیقی تعاون، اور مربوط نصاب کے ذریعے IKS کو مرکزی تعلیمی دھارے میں شامل کر سکتے ہیں، جس سے نہ صرف تعلیمی تجربہ بہتر ہوگا بلکہ ثقافتی شناخت بھی محفوظ رہے گی۔

ہندوستان عالمی تعلیمی منظرنامے میں ایک اہم مقام حاصل کرنے کی سمت گامزن ہے، اس لیے IKS کا انضمام نہ صرف قومی مفاد میں ہوگا بلکہ صحت، پائیداری، اور اخلاقی طرز حکمرانی جیسے شعبوں میں دنیا کو نئے علمی زاویے فراہم کرے گا۔ IKS کی گہرائی کو جدید تعلیمی طریقوں کے ساتھ متوازن رکھنے سے ایک جامع تعلیمی نظام تشکیل دیا جا سکتا ہے، جو آنے والی نسلوں کو ان کے ثقافتی ورثے سے جوڑے رکھے گا اور انہیں ایک عالمی ماحول میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرے گا۔

■

Syed Md. Kahful Wara
Asst. Professor
Maulana Azad National Urdu University
College of Teacher Education
Darbhanga- 846002 (Bihar)
Mob.: 9709676493
kahf894@gmail.com

احمد حسین

دورِ جدید کے آئینے میں اساتذہ کا کردار

تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی اور استحکام کا بنیادی ستون ہے، اور اساتذہ اس نظام کے معمار ہیں۔ جدید دور میں، جہاں ٹیکنالوجی اور علوم و فنون کی نئی راہوں نے تعلیمی منظرنامے کو یکسر تبدیل کر دیا ہے، اساتذہ کا کردار مزید اہمیت اختیار کر گیا۔ وہ محض علم کی منتقلی تک محدود نہیں رہے، بلکہ طلبہ کی اخلاقی، سماجی اور ذہنی تربیت میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کو معیاری تعلیم فراہم کرتے ہیں، جوان کی علمی ترقی کا باعث بنتی ہے۔ وہ نصاب کی تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تنقیدی فکر اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھاتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کو اخلاقی اقدار، مثلاً ایمانداری، احترام اور ذمے داری کا درس دیتے ہیں، جوان کی شخصیت سازی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وہ طلبہ کو معاشرتی مسائل کا شعور دیتے ہوئے انھیں ایک ذمے دار شہری بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جدید دور میں، جہاں آن لائن تعلیم اور ڈیجیٹل وسائل کا استعمال بڑھ رہا ہے، اساتذہ طلبہ کو ٹیکنالوجی کے مؤثر اور محفوظ استعمال کی تربیت کے ساتھ ساتھ وہ آن لائن علوم و معارف کی صداقت اور اس کے درست استعمال کا شعور دیتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کی ذہنی صحت کا خیال رکھتے ہوئے انھیں مشورہ بھی دیتے ہیں نیز تعلیمی دباؤ، ذاتی مسائل، اور مستقبل کے منصوبوں کے حوالے سے طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں، جس سے ان کی مجموعی فلاح و بہبود میں اضافہ ہوتا ہے۔ اساتذہ کی مسلسل پیشہ ورانہ ترقی ان کی تدریسی صلاحیتوں کو بہتر بناتی ہے۔ جدید تدریسی طریقوں اور ٹیکنالوجی کے استعمال کی تربیت اساتذہ کو مزید مؤثر بناتی ہے، جس سے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی میں بہتری آتی ہے۔ اس لیے، اساتذہ کا کردار محض معلومات کی منتقلی تک محدود نہیں رہا، بلکہ وہ طلبہ کی ہمہ جہت ترقی میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔ تعلیمی، اخلاقی، سماجی، اور ذہنی تربیت کے ذریعے اساتذہ طلبہ کو مستقبل کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان کی رہنمائی اور مشورہ طلبہ کی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں لاتا ہے، جو معاشرے کی مجموعی ترقی کا باعث بنتی ہیں۔

تعلیمی ترقی میں اساتذہ کا کردار کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور اس کی کامیابی کا اہم ذریعہ ہے۔ اساتذہ وہ ستون ہیں جو طلبہ کی علمی، فکری اور عملی نشو و نما میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ جدید دور میں تعلیمی ترقی کا مطلب صرف نصاب کی تدریس نہیں، بلکہ طلبہ میں نقد و تخلیق کی صلاحیتوں اور مسائل کو حل کرنے کی اہلیت بھی پیدا کرنا ہے۔ اساتذہ اپنے تجربات، علم اور مہارت کے ذریعے طلبہ کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ مستقبل کے چیلنجز کا سامنا کر سکیں۔ وہ نہ صرف تعلیمی مواد کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں بلکہ طلبہ کو مطالعے کی عادت، تجزیاتی فکر، اور سائنسی نقطہ نظر اپنانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ اساتذہ طلبہ کی تعلیم کو عملی زندگی سے جوڑتے ہیں تاکہ وہ اپنی سیکھنے کی صلاحیتوں کو معاشرتی اور معاشی مسائل کے حل میں استعمال کر سکیں۔ مزید برآں، وہ طلبہ کو ٹیم ورک، قیادت، اور انفرادی ذمے داریوں کی اہمیت سکھاتے ہیں، جو کسی بھی کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے۔

اساتذہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلبہ کے اندر خود اعتمادی پیدا کریں، انھیں اپنی قابلیت پر یقین دلانے میں مدد کریں، اور تعلیمی ترقی کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ وہ طلبہ کو صرف کتابی علم تک محدود نہ رکھیں بلکہ عملی تجربات اور مباحثوں کے ذریعے ان کی فکری وسعت کو بڑھانے کی کوشش کریں۔ جدید تعلیمی نظام میں، جہاں ٹیکنالوجی نے تعلیم کا انداز تبدیل کر دیا ہے، اساتذہ طلبہ کو آن لائن وسائل کے مؤثر استعمال سے آگاہ کریں، جس سے ان کی تحقیقی اور علمی مہارتوں میں بہتری آئے۔

اساتذہ کا کردار صرف کمرہ جماعت تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ طلبہ کو مختلف سماجی اور ثقافتی مواقع بھی فراہم کریں، جہاں وہ اپنی مہارتوں کو عملی شکل دے سکیں۔ وہ طلبہ کو جدید تدریسی حکمت عملیوں جیسے گروپ پروجیکٹس، تحقیقی سرگرمیوں، اور عملی تجربات کے ذریعے ایک نیا نقطہ نظر اپنانے کا موقع فراہم کریں۔ اس لیے کہ ان کی رہنمائی کے بغیر طلبہ کے

لیے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچاننا اور انھیں ترقی دینا ممکن نہیں ہے۔

تعلیمی ترقی میں اساتذہ کے کردار کو مزید مؤثر بنانے کے لیے انھیں جدید تدریسی تکنیکوں، ٹیکنالوجی، عملی تحقیق سے آگاہ رہنا چاہیے، تاکہ وہ اپنی تدریسی صلاحیتوں میں مزید بہتری لاسکیں۔ ان کے اس عمل کا براہ راست اثر طلبہ کی علمی لیاقت پر پڑتا ہے اور یہی لیاقت ایک مضبوط معاشرے کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

> تعلیمی ترقی میں اساتذہ کا کردار کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور اس کی کامیابی کا اہم ذریعہ ہے۔ اساتذہ وہ ستون ہیں جو طلبہ کی علمی، فکری اور عملی نشوونما میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ جدید دور میں تعلیمی ترقی کا مطلب صرف نصاب کی تدریس نہیں، بلکہ طلبہ میں نقد و تخلیق کی صلاحیتوں اور مسائل کو حل کرنے کی اہلیت بھی پیدا کرنا ہے۔

اخلاقی اور سماجی تربیت میں اساتذہ کا کردار کسی بھی معاشرے کی بنیاد کو مستحکم بنانے میں بہت اہم ہے، کیونکہ یہ کردار طلبہ کی شخصیت سازی اور ان کی عملی زندگی کی تیاری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ تعلیم صرف کتابی علم تک محدود نہیں ہے بلکہ طلبہ کو معاشرتی اور اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے کا ذریعہ بھی ہے اور یہ اساتذہ کا ہی کام ہے کہ وہ ان اقدار کو طلبہ کی زندگی کا حصہ بنائیں۔ اساتذہ اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے طلبہ کو ایمانداری، احترام، انصاف اور برداشت جیسی بنیادی اخلاقی اقدار سے روشناس کراتے ہیں۔ وہ طلبہ کو یہ سکھاتے ہیں کہ اچھے اخلاق اور مثبت رویے نہ صرف ان کی ذاتی ترقی میں مددگار ہوتا ہے بلکہ یہ معاشرتی ہم آہنگی اور امن کے قیام کے لیے بھی ضروری ہیں۔ اساتذہ طلبہ کو سکھاتے ہیں کہ وہ دوسروں کے جذبات کا احترام کریں، تنقید کو مثبت انداز میں لیں اور اختلافات کو خوش اسلوبی سے حل کریں۔

اساتذہ کا کردار اس وقت اور بھی اہم ہو جاتا ہے جب وہ طلبہ کو سماجی مسائل کے حوالے سے آگاہ کرتے ہیں۔ جیسے کہ ماحول کی حفاظت، سماجی انصاف کا فروغ، اور دیگر لوگوں کی مدد کرنے کی اہمیت۔ اساتذہ طلبہ کو کمیونٹی سروسز، رضا کارانہ سرگرمیوں اور سماجی منصوبوں میں حصہ لینے کے لیے ترغیب بھی دیں تاکہ وہ عملی طور پر اپنے سماجی فرائض کو سمجھیں اور ان پر عمل پیرا ہو سکیں اور طلبہ کے اندر قائدانہ صلاحیتیں اجاگر ہوں تاکہ وہ سماج میں مثبت تبدیلیاں لانے کے لیے اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اساتذہ کا کام طلبہ کے رویے کو مثبت سمت میں لے جانا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے اعمال کے نتائج کے بارے میں خود محاسبہ کی عادت ڈال سکیں۔ اساتذہ طلبہ کو تعصب، فرقہ واریت، اور غیر متوازن سوچ سے بچنے کی تعلیم دیں تاکہ وہ ایک متوازن اور پرامن معاشرے کے رکن بن سکیں۔ جدید دور میں، جہاں سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع طلبہ کے افکار و خیالات پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔ ایسے میں اساتذہ ان کے لیے رہنما کا کردار ادا کرسکتے ہیں ساتھ ہی وہ ان ذرائع کا مثبت استعمال اور ذمہ داریوں سے آگاہ بھی ہو سکتے ہیں۔

اساتذہ کو طلبہ کو متنوع ثقافتوں، گوناگوں مذاہب اور نظریات کی عزت کرنے کی تعلیم بھی دینی چاہیے تاکہ وہ مختلف لوگوں کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کر سکیں۔ وہ انھیں سکھائیں کہ مختلف نظریات کے باوجود معاشرتی ہم آہنگی کو کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

اساتذہ طلبہ کو ٹیکنالوجی کی اخلاقیات کے بارے میں آگاہ کرتے رہیں، جیسے کہ کاپی رائٹ قوانین، سائبر جرائم سے بچاؤ اور آن لائن سیکورٹی کے اصول۔ وہ اس بات پر زور دیں کہ وہ ٹیکنالوجی دوسروں کو نقصان پہنچانے یا منفی مقاصد کے لیے استعمال نہ کریں بلکہ اسے اپنے علم کو بڑھانے اور دوسروں کی مدد کے لیے استعمال کریں۔ جدید دور میں جہاں سوشل میڈیا طلبہ کی زندگی کا اہم حصہ بن چکا ہے، اساتذہ انھیں اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے بارے میں باخبر کریں اور انھیں بتلائیں کہ سوشل میڈیا پر اپنی ذاتی معلومات کا تحفظ کیسے کریں اور اس کا تعمیری استعمال کیسے کیا جاسکتا ہے۔

ٹیکنالوجی کے ذریعے تعلیم کو مزید دلچسپ، بامعنی و بامقصد بنانے کے عمل میں اساتذہ مختلف تعلیمی ایپس اور سافٹ ویئرز کے استعمال سے طلبہ کو واقف کرائیں۔ وہ طلبہ کو ورچوئل لیبارٹریز، سمولیشنز اور انٹرایکٹو ویڈیوز کے ذریعے سیکھنے کے نئے اور مؤثر طریقوں کی رہنمائی کریں۔ اس کے علاوہ، اساتذہ طلبہ کو ٹیکنالوجی کی مدد سے پروجیکٹ بیسڈ لرننگ اور مسائل کی افہام و تفہیم اور اس کی عملی سرگرمیوں میں شامل کریں، جس سے ان کی عملی صلاحیتوں میں اضافہ اور نکھار پیدا ہو۔

اساتذہ خود بھی ٹیکنالوجی کے استعمال میں مسلسل

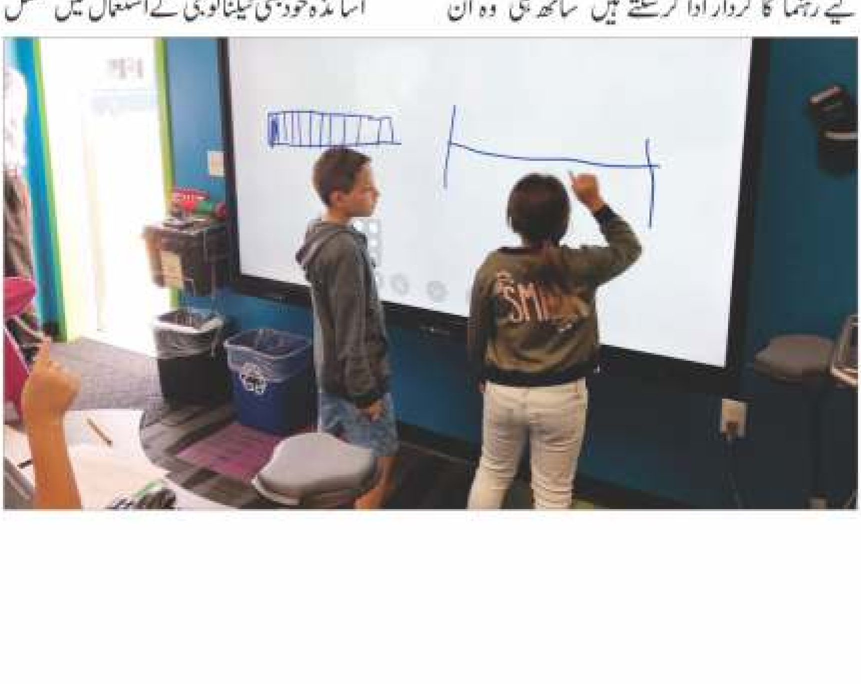

تربیت حاصل کرتے رہیں تاکہ وہ طلبہ کو جدید ترین تدریسی طریقے فراہم کرسکیں۔ وہ آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کی نگرانی کریں، ان کے نتائج کا تجزیہ کریں اور انفرادی سطح پر رہنمائی فراہم کریں اس کے ساتھ ساتھ، اساتذہ طلبہ کو آن لائن کلاسز کے آداب، جیسے کہ وقت کی پابندی، آن لائن تعاون اور مثبت گفتگو کے اصولوں کے بارے میں بھی باخبر کرتے رہیں۔

اساتذہ کا کردار صرف تکنیکی مہارت تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ طلبہ کو یہ بھی سکھائیں کہ ٹیکنالوجی کو اپنے کیریئر کی منصوبہ بندی اور ترقی کے لیے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ طلبہ کو آن لائن کورسز، ڈیجیٹل سرٹیفکیشنز اور دیگر پروفیشنل ڈیولپمنٹ کے مواقع کے بارے میں رہنمائی فراہم کریں۔ اس طرح، اساتذہ نہ صرف طلبہ کو ٹیکنالوجی کے ذریعے موجودہ چیلنجز سے نمٹنے بلکہ انھیں مستقبل کے لیے بھی تیار کرسکیں گے، جہاں ٹیکنالوجی کے استعمال کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہوگی۔ اساتذہ کی یہ رہنمائی طلبہ کی تعلیمی، پیشہ ورانہ اور ذاتی زندگی پر مثبت اثر ڈالتی ہے، جو ایک کامیاب اور متوازن زندگی کے لیے ضروری ہے۔

اساتذہ کا طلبہ کی ذہنی صحت اور مشاورت میں کردار نہایت اہم ہے، کیونکہ جدید دور میں تعلیمی دباؤ، سماجی دباؤ اور ٹیکنالوجی کے اثرات نے طلبہ کی ذہنی حالت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اساتذہ نہ صرف تعلیمی میدان میں رہنمائی فراہم کریں بلکہ طلبہ کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کو بھی سمجھنے اور حل کرنے میں معاون بنیں۔ وہ طلبہ کے رویے، جذباتی ردعمل اور تعلیمی مراحل کی مشکلات کو سمجھتے ہوئے ان کے لیے آزاد اور دوستانہ ماحول فراہم کریں، جہاں وہ اپنی مشکلات کا اظہار کرسکیں۔ یہ کردار اس وقت اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے جب طلبہ اپنی ذاتی زندگی کے مسائل یا تعلیمی دباؤ کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ اساتذہ انھیں حوصلہ دیں، ان کی بات سنیں، اور ان کے مسائل کے حل کے لیے عملی مشورے بھی دیں۔

اساتذہ ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لیے طلبہ کو وقت کی صحیح تنظیم، مثبت فکر، اور خود اعتمادی کے فروغ کی تعلیم دیں۔ وہ طلبہ کو یہ سمجھائیں کہ ناکامی زندگی کا حصہ ہے اور اس سے سیکھنا لازمی ہے۔ وہ طلبہ کو مشکلات کے باوجود اپنے اہداف پر توجہ مرکوز رکھنے کا درس دیں اور انھیں مختلف تدابیر کے ذریعے پریشانیوں سے نمٹنے کے قابل بنائیں۔ اس کے علاوہ، وہ طلبہ کو تعلیمی منصوبہ بندی میں مدد فراہم کریں، جس سے ان کی کارکردگی بہتر ہو اور وہ اپنے وقت کو مؤثر طریقے سے استعمال کرسکیں۔

جدید دور میں اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی کا رول تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور طلبہ کی تعلیمی کارکردگی میں بہتری لانے کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ بدلتے ہوئے تعلیمی نظام، نصاب اور ٹیکنالوجی کے دور میں اساتذہ کو اپنی مہارتوں کو مسلسل بہتر بنانے کی ضرورت

اساتذہ ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لیے طلبہ کو وقت کی صحیح تنظیم، مثبت فکر، اور خود اعتمادی کے فروغ کی تعلیم دیں۔ وہ طلبہ کو یہ سمجھائیں کہ ناکامی زندگی کا حصہ ہے اور اس سے سیکھنا لازمی ہے۔ وہ طلبہ کو مشکلات کے باوجود اپنے اہداف پر توجہ مرکوز رکھنے کا درس دیں اور انہیں مختلف تدابیر کے ذریعے پریشانیوں سے نمٹنے کے قابل بنائیں۔ اس کے علاوہ، وہ طلبہ کو تعلیمی منصوبہ بندی میں مدد فراہم کریں، جس سے ان کی کارکردگی بہتر ہو اور وہ اپنے وقت کو مؤثر طریقے سے استعمال کر سکیں۔

ہے تاکہ وہ طلبہ کی ضروریات کے مطابق تدریسی عمل کو زیادہ مؤثر اور منظم بنا سکیں۔ پیشہ ورانہ ترقی کے ذریعے اساتذہ نہ صرف اپنے تدریسی طریقوں کو بہتر کر سکتے ہیں بلکہ وہ نئے تعلیمی نظریات، تحقیقاتی نتائج اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر سکتے ہیں، جو ان کی تدریسی کارکردگی کو مزید نکھارنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ تربیت کے مواقع، مثلاً ورکشاپ، سیمینار، کانفرنس اور آن لائن کورس وغیرہ، ان کی علمی اور عملی صلاحیتوں میں اضافے کا باعث ہیں۔ یہ مواقع انھیں نئے تدریسی طریقوں اور مہارتوں کے بارے میں جاننے کا موقع فراہم کرتے ہیں، جیسے کہ تخلیقی تدریس، طلبہ کی مختلف تعلیمی ضروریات کے مطابق تدریس اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے ذریعے تدریسی و اکتسابی عمل کو بہتر بنانا۔ اساتذہ جدید تعلیمی ٹیکنالوجی، جیسے کہ اسمارٹ بورڈز، آن لائن پلیٹ فارمز اور تعلیمی سافٹ ویئرز کا استعمال سیکھ کر طلبہ کو ایک متحرک اور دلچسپ تعلیمی تجربہ فراہم کر سکتے ہیں۔

جدید دور میں اساتذہ اور ان کے ذریعے رہنمائی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اساتذہ معاشرے کی تعمیر اور طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ تعلیم، جو کسی بھی قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے، اساتذہ کی رہنمائی اور محنت کے بغیر نامکمل ہے۔ آج کے تیزی سے بدلتے دور میں، جہاں ٹیکنالوجی نے تعلیم کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے، اساتذہ کا کردار محض علم کی منتقلی تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ طلبہ کی اخلاقی، سماجی اور ذہنی نشوونما کے ضامن بھی ہیں۔ اس لیے اساتذہ نہ صرف طلبہ کو علمی ترقی کے راستے پر گامزن کریں بلکہ انھیں زندگی کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار کریں۔ وہ اخلاقی اقدار، سماجی شعور اور ذمے داری کا درس دے کر طلبہ کو ایک ذمے دار شہری بننے کی راہ دکھائیں۔ ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال کے تناظر میں، اساتذہ طلبہ کو جدید وسائل کے صحیح استعمال کے تئیں انھیں مشاورت اور رہنمائی فراہم کرائیں، جو ان کے اعتماد اور کارکردگی میں اضافہ کر سکے۔ پیشہ ورانہ ترقی کے ذریعے اساتذہ اپنی تدریسی صلاحیتوں کو مزید مؤثر بنائیں، جس سے تعلیمی نظام کی مجموعی کارکردگی میں بہتری آئے۔ یوں اساتذہ کی رہنمائی اور کردار طلبہ کی زندگیوں میں ایک مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، جو نہ صرف انفرادی کامیابی کا باعث ہے بلکہ معاشرے کی مجموعی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس طرح اساتذہ کی رہنمائی ہر دور میں تعلیم اور معاشرتی استحکام کے لیے ناگزیر رہی ہے اور رہے گی۔

■

Ahmad Husain
Assistant professor
MANUU, CTE
Bhopal - 462036 (MP)
ahmadhusainamu@gmail.com

تقابلی ادب کے اساسی تصورات

ارشاد نیازی

تقابلی ادب، ادب کا ایک سائنسی طریقۂ کار اور ڈسپلن ہے۔ اس ڈسپلن کے دو اہم اجزا ہیں، ’ایک تقابل اور دوسرا تجزیہ‘۔ یہ خود کسی دبستان اور نظریے کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اس کا عمل دخل تمام دبستانِ فکر و نظر میں یکساں طور پر حاوی ہے۔ وہ اس لیے کہ کسی فن یا فن پارہ اور فنکار پر دورانِ بحث مطالعہ کرنے والا تخلیق اور تخلیق کار کا جب تجزیہ کرکے قدر و قیمت متعین کرتا ہے تو فطری طور پر وہ تقابلی مطالعے کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ مطالعہ کیسا بھی ہو، کسی بھی طرح کے تنقیدی نظریات ہوں تقابلی مطالعے کی ایک زمین یا حصہ داری اس میں ضرور ہوتی ہے۔

’تقابلی ادب، ادب کی تفہیم اور پرکھ کا ایک اہم منظرنامہ ہے، جو زمانۂ موجود کی سب سے بڑی ضرورت بن کر سامنے آیا‘۔ یہاں پہلے تو کسی ایک ہی زبان کے حدود میں دو یا دو سے زیادہ شاعروں، ادیبوں اور میلانات و اوصاف کا تقابل کیا جاتا ہے۔ جیسے اردو میں خواجہ میر درد اور شاہ نیاز احمد بریلوی کی صوفیانہ شاعری کا تقابلی مطالعہ وغیرہ۔ لیکن اس طرح کے مطالعے کو اگر ہم نے حرزِ جاں بنا لیا تو یہ ہماری اپنی کم مائیگی یا احساسِ کمتری ہوگی کہ ہم ایک ہی زبان اور ادب سے متعلق ہو کر رہ گئے یا اسے اپنی چار دیواری تک محدود کر دیا، جو کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تقابلی مطالعے کو وسعت دی جائے یعنی اپنی زبان کے دائرے سے نکل کر دوسری زبانوں کے فن، تکنیک، موضوع اور اصناف کے حوالے سے بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ جیسے اردو۔ ہندی غزل کا تقابلی مطالعہ یا ہندی اور اردو افسانوں پر تقسیمِ ملک کے اثرات وغیرہ۔ تیسری صورت مطالعہ کی یہ ہے کہ ایک ملک کی سرحد سے پرے دوسرے ملک کی زبان اور ادب کے ساتھ علم و احساس کے دوسرے شعبوں کا بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ تقابلی مطالعے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ لیکن اتنی نئی بھی نہیں ہے کہ اسے گلوبل ولیج کے تصور کے ساتھ منہا کرکے دیکھا جائے۔ وہ اس لیے آپ کوئی سی اور کتنی بھی چھوٹی لکیر کھینچیں، اس کی عمر ڈیڑھ۔ دو سو سال تو ہو ہی جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ گلوبل ولیج کے تصور کے ساتھ آ رہی تبدیلیوں کو تقابلی مطالعے کے ماہرین نے شدت سے محسوس کیا کہ دنیا کے مختلف ممالک کے اختصاصات اور ترجیحات بدل چکے ہیں۔ ایسے میں اثر و نفوذ اور تطابق و تخالف کا اثر انداز ہونا لازم ہے۔

سوال یہ ہے کہ اختصاص و ترجیحات، تطابق و تخالف اور اثر و نفوذ کے ساتھ فنکاروں، فن پاروں، اثرات و خصوصیات مرتبے اور درجات کی ضرورت کیا ہے؟ جواب یہ ہونا چاہیے کہ جب جب علمی، تہذیبی، مذہبی، معاشیاتی یا قدرتی سبب سے ہجرت ہوتی ہے، تب تب Contactuality بھی قائم ہوتی ہے۔ یہی قربت تقابلی ادب کے مطالعہ کی بنیاد ہے۔ نئے رشتوں اور تعلقات کے قائم ہونے کے ساتھ خوبیوں، خامیوں اور مماثلتوں کی بحث بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ ادبی تعلقات اور آپسی رشتوں کا مطالعہ تقابلی ادب کی بنیاد کے پتھروں میں سے ایک ہے۔ یہ مطالعہ فنونِ لطیفہ، تاریخ، سماجیات، سائنس، مذہب، مذہبی معاملات، فلم، لوک ادب، بین تہذیبی اور Marginalised people وغیرہ کے ساتھ علوم کے مختلف شعبوں کے آپسی رشتوں کا بھی مطالعہ ہے۔ اس طرح کا مطالعہ ایک طرح سے فکری تاریخ کا بھی مطالعہ ہوتا ہے، جس کے مرکز میں خاص نقطہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ادب کے توسط سے ایک سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں اور ادب کو متاثر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک ادب کے عناصر اور اقدار و روایات کا کس طرح سے دوسرے ادب میں استقبال کیا جاتا ہے۔ اسی Acceptance کے جذبے میں اس کے حسن کا جذبہ کارفرما ہے اور عزت بھی مضمر ہے۔ وہ اس لیے کہ خود سے باہر دوسروں کو سمجھنے کے لیے قرأت سے زیادہ اور زیادہ عزت دینے کا کیا جذبہ اور طریقہ ہو سکتا ہے۔ دو زبانوں، تہذیبوں اور ملکوں کے ادب کو جب ایک ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو Textuality -Co کی صورت تو بن ہی جاتی ہے، نیز قرأت سے ہم آہنگی کی جو روشنی پھیلتی ہے، اس سے روشن خیالی ذہن و دل میں در آتی ہے۔ اس طرح کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ممالک اور تہذیب و ثقافت سے وابستہ مصنفین، انصاف، انسانیت، استحصال، نابرابری، رنگ و نسل، بھید بھاؤ اور تعصب وغیرہ انسانی برتاؤ کی گہرائی اور گیرائی کے اختصاص کو کس زاویے سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ دو

مختلف زبانوں کی تخلیقات کی اساس میں سماجی ترغیبات اور معاشرتی ترقی کے نشیب وفراز کے ساتھ تاریخ کا پورا علم ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ادبیاتِ عالم میں جو فنی، فکری، موضوعاتی، لسانی اور اسلوبیاتی اشتراک وامتزاج ہے ان کی بازیافت بھی لازم ہے۔

اس لیے کہ تقابلی مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک ادب، دوسرے ادب سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح یونانی افکار اور ادب نے ساری دنیا کو متاثر کیا اور کس طرح یونانی ادب لاطینی ادب سے مربوط ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا جب علم کی روشنی سے محروم تھی، ہندوستان کا علم و ادب روشنی بن کر سارے عالم میں پھیلا اور ہندوستانی علم وادب نے ایرانی اور مشرق وسطی کے ادب پر اثر ڈالا۔ معلوم یہ ہوا کہ ہر قوم وملت کے ادب نے دوسری قوم وملت کے ادب میں کم وبیش اثر و نفوذ کیا ہے۔ فرانس کا عہد نشاۃ ثانیہ یونان اور رومی ادب سے خالی نہیں ہے۔ رومی ناقدین کے الفاظ و اصطلاحات اکثر یونانی تنقید سے ماخوذ تھے۔ رومیوں کے وسیلے سے یونانی نقادوں کے الفاظ و اصطلاحات اور تعبیرات فرانسیسی نقادوں تک عہد نشاۃ ثانیہ میں پہنچے۔ ان کے علاوہ مشرق میں سریانیوں اور عربوں کے یہاں بھی ان کے الفاظ اور اصطلاحات کا ایک حصہ نقل اور ترجمہ ہوکر ہمارے ادیبوں اور نقادوں میں رائج الفاظ اور اصطلاحات بن گئے ہیں۔ اسلام کے سیاسی تسلط و غلبہ نے ایران کے شاعروں اور ادیبوں کے لیے عربی ادب کی تنقید کے دروازے کھول دیے۔ سترہویں صدی کے وسط سے مشرق کے علمی ذخیرے یوروپ کی توجہ کا مرکز بنے اور مستشرقین نے اسلامی ادب کے ایک بڑے ذخیرے کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا۔ یہی نہیں، کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ فارسی میں ہوا اور پھر اس ترجمے کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ آج یہ حال ہے کہ اس کو اسلوب کی سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ خود عربوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انھوں نے غیر ملکی علمی سرمائے سے استفادہ کیا۔ جاحظ کے قول کے مطابق عربوں نے علم بلاغت ہندوستان سے سیکھا۔'' Paul Hazard نے اپنی کتاب 'تقابلی ادب' میں لکھا ہے کہ فرانس نے انگریزی اور جرمن ادب کا مطالعہ کرکے اس سے اپنا فکری و ادبی افق روشن کیا اور اس میں وسعت وعظمت پیدا کرلی۔

تقابلی ادب کے مطالعے کے دو اسکول ہیں ایک فرانسیسی اور جرمن اسکول۔ دوسرا امریکی اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان دونوں اسکولوں کے ادبی تصورات یکساں نہیں ہیں۔ فرانسیسی اور جرمن اسکول میں ادبی تاریخ اور روایتوں کو مطالعے کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے مطالعہ کے دوران یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ادب کس طرح دوسرے ادب کو متاثر کرتا ہے یا اثر انداز ہوتا ہے۔ اثر ونفوذ یا قبولیت، مطالعہ فرانسیسی

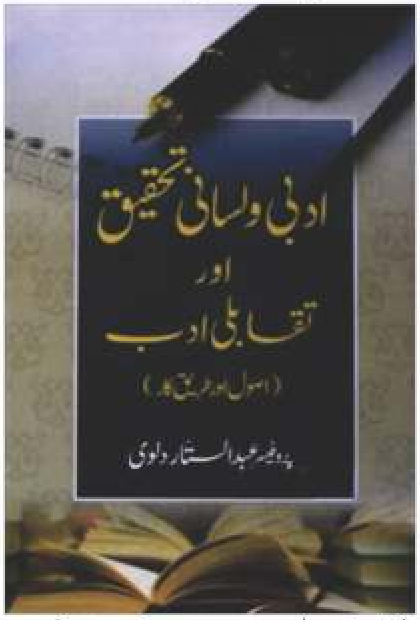

اسکول کے تقابلی ادب کا جوہر ہے، جس نے کافی وقت تک تقابلی ادب کے مطالعے کو متاثر کیا۔ سب جانتے ہیں کہ اثر ونفوذ مطالعے کے شعبے میں Affinity ، Analogy، Legacy (ربط وتعلق، میراث، مطابقت و مشابہت) کے کردار کی پرکھ کی جاتی ہے۔ یعنی کس طرح ایرانی ادب ہندوستانی ادب پر اثر انداز ہوا اور کس طرح یونانی ادب نے دنیا کے دوسرے ممالک کے ادب کو متاثر کیا۔ قدیم ماخذات سے ان تہذیبی و ثقافتی لین دین، تطابق وتخالف کا اندازہ ہوتا ہے، جو برسوں سے ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک قوم سے دوسری قوم تک جاری تھا اور جس نے ادب کو متاثر کیا۔ اس گروہ کے لوگ ادبی شہ پاروں اور ادبی تحریکات وتخلیقات کی توضیح وتفسیر میں تاریخ کی مدد لیتے ہیں اور ان کے ارتقا میں مختلف قوموں کے ارتقائی منازل اور ان کے اثرات سے بحث کرکے نتائج اخذ کرتے ہیں۔

دوسرا اسکول امریکی اسکول ہے۔ امریکی اسکول نے تقابلی ادب کے شعبے کو جو وسعت بخشی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ ادب کا تقابلی مطالعہ تو ٹھیک ہے بنیاد میں تو ادب ہی ہے۔ وہ اس لیے کہ ادب کوئی گرین ہاؤس میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ادب تخلیقِ انسانی ہے۔ انسان چونکہ سماج میں رہتا ہے اس لیے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور سیاسی سبھی تاثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ادب کے تقابلی مطالعے میں ان کے ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی امریکی اسکول میں تقابلی ادب کے مطالعے کے دوران ان ادبیات کے اندرونی ڈھانچے، تحریکات، ادبی روایات وتصورات، فن پاروں کی جمالیاتی اور اسلوبیاتی خصوصیات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ بائزکہ اسٹرامین نے امریکی ادب کی اس خصوصیت کی نشان دہی کی ہے۔ اسٹرامین کی اس فکر کی موافقت 'کوئی پیرنگٹن' Main Current in American Thought اور آرتھر الوجوائے کی تصنیف The Great Chain Bein: Study of the History of an Idea سے بھی ہوتی ہے۔ اس گروہ کے نظریے کے مطابق تقابلی مطالعے میں وہ انسانی نفس سے متعلق جذبات ہیں، جو وجدانی طور پر شعر وادب میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسانی نفس کی گہرائیوں میں جنم لیتے ہیں، مگر ادیب اپنی صلاحیت سے ان کو ادبی شکل عطا کرتا ہے۔ اس کا ذوق انسانی قلب اور نفس کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ عالمِ وجدانی کا عطیہ ہے، جو فکر و فن کو متاثر کرتا ہے۔

امریکہ کو تقابلی ادب کی تلاش اس لیے بھی کرنی پڑی کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے آس پاس یوروپی دانشوروں نے اپنے ملک کی Dictatorship والی حکومت اور تاناشاہی سیاستدانوں کی ظالمانہ اور سفاک حکمتِ عملی سے ہجرت کرکے امریکہ میں پناہ لی تھی۔ فطری طور پر ان کے ساتھ ان کا ادب بھی آیا۔ ان کے ادب کو مقام اور ان کا مطالعہ، تقابلی مطالعے کے توسط سے ہی ممکن تھا۔ اس کے لیے American Comparative Literature Association (ACLA) بنایا گیا۔ ACLA میں ایک قانون بنایا گیا کہ دس سال میں ایک رپورٹ تیار کی جائے، جس کا ایک معیار متعین کیا جائے۔ اس کے بعد 1990 کی دہائی میں معیار کی جگہ Status Report کا استعمال کیا جانے لگا۔ شاید اسی لیے اس اسکول کے ماہرین تقابلی

مطالعے کو شعریات و جمالیات کا ڈسپلن نہیں بلکہ ایک تاریخی ڈسپلن مانتے ہیں۔اس کا تعلق سچائی سے ہے۔ اسے مختلف ممالک کے مصنفین، حقیقت پسندانہ آگہی اورعزم وخیال سے بھی اسے متعلق جانتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ امریکی دانشور ہنری ریمارک کی تعریف نے اسے Interdisciplinary بنا دیا۔

تقابلی ادب جہاں ادبی مطالعے کے لیے روشنی فراہم کرتا ہے اوراس سے Perspective میں وسعت آتی ہے۔ وہیں یہ مطالعہ ملک کی سرحدوں کو توڑتا ہوا مختلف قوموں اوران کے تہذیبی اثرات اورتحریکات کی تلاش کرتا ہے اور انسان کے دوسرے علمی کاموں کے ساتھ ادب کے تعلقات کو جانچتا اور پرکھتا ہے، جس سے ہمارے ذہن میں وسعت آتی ہے اور عالمی ادب کے درمیان ربط پیدا ہوتا ہے۔اس کا بنیادی مقصد جوڑنا، دوریاں کم کرنااورعالمی برادری کا جذبہ پیدا کرنا ہے نیز زبانوں کے اختلافات کوکم کرنا بھی اس کا فن ہے۔زبانوں،نظریوں اور تہذیبوں کے توسط سے تطابق وتخالف کا جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر کرنااس کا خاص مطمح نظر ہے۔تقابلی ادب کا مقصد اثر اورشعور کو وسعت دے کر انسان کو انسانی سطح پر لانا،انسانیت کوفروغ دینا ہے۔جاننے والے جانتے ہیں کی دنیا کے غیرمعمولی حسن، نادرات و عجائبات اور اقدار و روایات وغیرہ کا تعارف تقابلی ادب سے ہی ممکن ہوسکا ہے۔

اس مطالعے کے دوران بہت سے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں، جن کا احساس عام حالات میں کسی کو نہیں ہوسکتا ہے۔تقابلی مطالعے کے ادبی، فکری، لسانی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی رجحانات کے اس لین دین، تطابق وتخالف سے جہاں ادب کو ترقی ملتی ہے، وہاں بہت سے نئے الفاظ، اصطلاحات، محاورات، کہاوتیں اورضرب الامثال وغیرہ ایک ادب سے دوسرے ادب میں منتقل ہوکر اس کے Canvas کو وسیع کرتے ہیں اور قاری بیک وقت دو ادب اورتہذیب وثقافت سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ یہی نہیں تقابلی ادب کے مطالعے سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی ادبی ثقافتوں کے بین Otherness کے احساس کوکم کر کے باہمی اتفاق Togetherness کے احساس کوفروغ دے کر بین الاقوامی تہذیب وثقافت اور بین الاقوامی ہم آہنگی

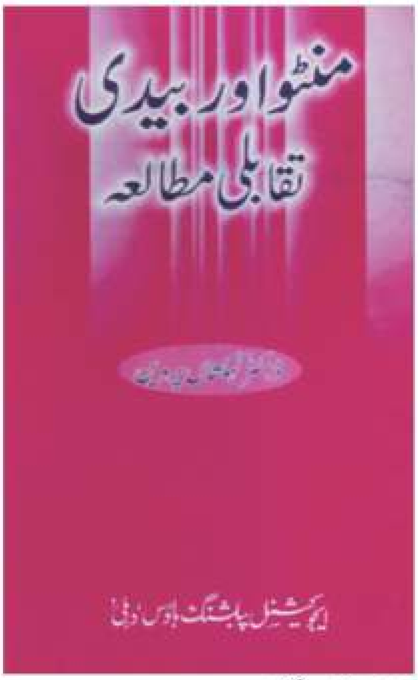

کو مضبوط کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان ایک کثیر مذہبی، تہذیبی اور لسانی ملک ہے۔ ہندوستان اپنی شناخت کے لیے کثرت میں وحدت کا تصور عام ہے۔اس تصور پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ صرف اپنی زبان، اپنے ادب اورصوبائی پہچان کی بنیاد پر کوئی بھی پورے ہندوستان کو جاننے اور پہچاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اپنی زمین کے اندر جو جڑیں ہیں ان کی رسائی کہاں تک ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہماری زمین پر قبضہ کرکے کہاں سے کہاں تک پہنچی ہوئی ہیں اورکہاں کہاں سے آب حیات مجتمع کر رہی ہیں۔لازم ہے کہ ہم اپنی زمین سے آگے خود کواورادب کو جاننے پہچاننے کی کوشش کریں۔تقابلی مطالعہ کا ڈسپلن روح کے اس عظیم الشان تسلسل میں ہمارا سب سے بڑا معاون ہے۔

ہندوستانی پس منظر میں تقابلی ادب کی اساسی فکر یہی ہے کہ مختلف ہندوستانی زبانوں کے درمیان مختلف رنگ وروپ کے باوجود ان سبھی میں معنوی یکسانیت موجود ہے۔ اسی کے پیش نظر تقابلی ادب کے ذریعہ ہندوستانی ادب میں پوشیدہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی اساسی یکجہتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عہد، رجحان اورادب کے فطری تفاعل کی بنیاد پر پورے ہندوستانی ادب کی پرکھ ہونی چاہیے۔ یہ کام کسی ایک زبان کو اساس بنا کر کیا جاسکتا ہے، جس کا ادب زیادہ سے زیادہ تہذیبوں کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس سے نہ صرف تقابلی ادب کے مطالعے کی تاریخ تیار ہوگی بلکہ ہندوستانیت کی شناخت، قومی امتیازات، سماجی، تہذیبی، سیاسی اور فلسفیانہ ومفکرانہ ادب کی سطح پر Communication میں آسانی ہوگی۔اردو زبان اس کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے کیونکہ اس کا دائرہ کار آغاز سے ہی وسیع رہا ہے۔ اردو ادب کو مرکز میں رکھ کر دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب کے تقابلی مطالعے کے ذریعہ ہندوستانی تہذیبی وثقافتی ہم آہنگی کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔اس سے قومی ادب، بین الاقوامی ادب اورعام ادب General Literature کی جو تعقلی وراثت Intelletcual Heritage ہے اس سے تنقید کو منسلک کرنے میں تقابلی ادب ایک اہم رول ادا کرسکتا ہے اور ادبی ثقافت کے میدان میں صوبائی اور علاقائی سرحدوں کو مسمار کر کے غیر ملکی جینوفوبیا Geneo Fobia سے بھی نجات دلا سکتا ہے۔تقابلی ادب میں زیر مطالعہ ادب کے امتیازات اور ان کے مابین پائے جانے والے مشترک Inter Commonality بین متونیت Inter Textuality کو پہچاننے کی جو طاقت ہے اس سے ہمیں اپنے ادب اور پرائے ادب کو سمجھنے کے لیے (Bifocal Vision ملتی ہے اوراس طرح مختلف ادبی رجحانات میں بین ثقافتی احساس یا بین ثقافتی سمجھ پیدا کرکے قاری یا سامع کومہذب بنانے کی جو پوشیدہ صلاحیت ہے اس کا ہم زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔[1]

یعنی تقابلی ادب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ملکی اور عالمی ادب کے اتحاد کے ذریعے انسانوں میں اتحاد بڑھے اور لسانی سطح پر اختلاف کی وجہ سے جو ملکی اور عالمی سطح پر ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگئی ہے اسے کم کیا جائے۔ اس طرح تقابلی مطالعہ ہمارے محدود علم میں اضافہ وتوسیع کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔لیکن ''ہر تقابلی مطالعہ کی بنیاد ظاہر ہے ترجمے پر ہوگی۔فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں مثلاً رقص، موسیقی اورمصوری کی طرح ادب نے کوئی عالمگیر زبان ایجاد نہیں کی اور زبان، ادب کا وسیلۂ اظہار ہے اور ہر اہم زبان سے واقفیت اور وہ بھی اتنی اور ایسی واقفیت کہ اس کے ادب سے بہرمند ہوا جاسکے، کسی ایک فرد کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے تراجم پر انحصار لازم ہے۔''[2] مگر اس کے لیے ہمیں ''سب سے پہلے اچھا عالم نہیں، اچھا مطالعہ کنندہ

بننا چاہیے۔''

اردو کے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ دو غیر زبانوں کے فنکاروں یا فن پاروں کا موازنہ و مقابلہ صحیح نہیں ہے۔ ان ناقدین کا کہنا ہے کہ ادب کی روح زبان ہے اور زبان، تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مثلاً غزل کے خیال کو منتقل کیا جاسکتا ہے مگر اس کے سوز و گداز اور کیفیت کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''تراجم اکثر ناقابل اعتبار اور ناقص ہوتے ہیں، خاص طور پر تخلیقی ادب اور اس میں بھی شاعری کے تراجم نہ تو صحت مضمون کی ضمانت کرتے ہیں نہ حسن اسلوب کی۔ ترجمہ کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو اصل کا بدل نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کسی ادب پارے کے ذریعہ ادا ہونے والے مضامین، احساسات و افکار ہی کو پیش کرسکتا ہے۔ جبکہ ادب کا معاملہ الفاظ کے ذریعے کیفیات کی ترسیل کا ہے اور ان کیفیات کا تعلق الفاظ کے پیچھے کارفرما لہروں سے ہے، جو مختلف رنگ و آہنگ بکھیرتی ہیں اور ہر زبان کی مخصوص روایات اور تلازموں میں رچی بسی ہوتی ہیں، مترجم ان لہروں کو گرفت میں نہیں لے سکتا۔''[3]

یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے، لیکن اس رائے سے مکمل اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر زبان اور اس کی تعلیقات کی اپنی تہذیب اور اپنے امکانات ہوتے ہیں، جس میں ترجمے کے توسط سے داخل ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لیے کہ مترجم ایک ایک لفظ کو اپنی گرفت میں لینے کے باوجود اس روح کی یافت نہیں کرپاتا، جو اس میں مضمر ہے جبکہ ترجمہ صرف لفظوں تک رسائی کا عمل نہیں ہے بلکہ روح کی یافت ہے، جو اجنبی پن کو ختم کرتا ہے۔ مترجم جب تک مصنف کے جذبات و احساسات اور خیالات تک رسائی نہیں حاصل کرلیتا اور تخلیق کے کرب کو نہیں پالیتا، جس سے تخلیق کار گذرا ہے، تب تک وہ انصاف نہیں کرسکتا ہے۔ یہ سوال پھر بھی ذہن میں رہتا ہے کہ مترجم اس ناقابل ادراک حالت سے اس طرح گزر سکتا ہے، جس طرح تخلیق کار گذرا ہے؟ جی ہاں کچھ ایسے مترجم بھی ہوئے ہیں اور ہیں، جنھوں نے اپنے ترجمے سے تخلیق کی روح کی یافت کرکے مصنف کو عالمی سطح پر متعارف کرادیا۔ میری مراد فیٹز زرالڈ سے ہے، جنھوں نے 1859 میں عمر خیام کی 75 رباعیوں کا ترجمہ کیا تھا، اس ترجمے کا شمار دنیا کے اہم ترجموں میں ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص دونوں زبانوں سے اچھی طرح واقف ہے تو وہ شعر کے مفہوم کو اسی سوز و گداز کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرسکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف خیال ہی لطف اندوزی اور اہمیت کا حامل نہیں ہوتا ہے۔ اگر اس میں ادبی توانائی اور خیال ارفع و اعلیٰ ہو تو وہ تمام زبانوں کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ قوموں، ملکوں اور خطوں کی تقسیم کے باوجود انسانی جذبات کی دنیا میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ لوگوں کے لباس، اشیائے خورد و نوش، آداب معاشرت، رسم و رواج، مذہبی تصورات اور طریقۂ غور و فکر میں زبردست اختلافات کے باوجود دل کی دنیا میں تقریباً ایک ہی طرح کا ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ خوشی سے انبساط کا حاصل ہونا، غم سے دل کا بجھ جانا، وصل میں مسرت اور ہجر میں تکلیف... حسن سے لگاؤ اور بدصورتی سے نفرت۔ یہ امتیازی باتیں ایسی ہیں، جن سے کوئی ملک اور قوم خالی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تاریخی، جغرافیائی، سماجی اور تہذیبی حالات کے تقاضوں سے ان کے مدارج میں فرق آتا ہے اور طریقۂ اظہار مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ مختلف علاقوں کے بسنے والوں سے ان اعلیٰ انسانی قدروں کو، جنھیں علما نے حسن، خیر اور حق سے تعبیر کیا ہے اور ایک دوسرے سے بالکل متضاد تسلیم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے اختلاف کے باوجود مختلف علاقوں کے بسنے والے بنیادی انسانی خصوصیات کے سلسلے میں ایک ہی طرح کے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام 'آفاقیت' ہے۔ ارسطو نے اعلیٰ شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے، جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ یہی آفاقیت ہے۔ دنیا کی اعلیٰ شاعری میں اس کی وجہ سے یکسانیت، وحدت اور مماثلت پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک انسانی جذبات اور محسوسات کا تعلق ہے، ان میں زیادہ تر انسان فطری طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ایک ملک کے انسان دوسرے ملک کے انسانوں سے بالکل الگ ہوجائیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا رشتہ قائم ہی نہ ہوسکے گا۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک علاقے کے ادب میں زندگی کے جو قانون پیش کیے گئے ہیں، دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے بالکل گونگے کا خواب ہوں گے اور کسی قسم کا جذباتی ردعمل نہ پیدا کرسکیں، لیکن جب ہم ساری دنیا کے اعلیٰ ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بنیاد میں سب کہیں نہ کہیں فن کی ایک منزل پر پہنچ کر یکساں ہوجاتے ہیں اور جذبات کی حدوں کے اندر بھی اچھی خاصی مشابہت پیدا کرلیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہومر، ورجل، غالب، انیس، والمیکی، ویاس، کالی داس، فردوسی، شیکسپیئر، ملٹن، کبیر وغیرہ کو صرف اپنے علاقوں اور اپنے ہم مذہبوں میں خصوصیت اور اہمیت حاصل ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بنیادی اخلاقی تصورات کے لحاظ سے اور فطرتِ انسانی کے پیش نظر ہندوستان کا بسنے والا ہومر میں اور جرمن کا بسنے والا کالی داس میں غیر معمولی دلچسپی لیتا ہے اور شاعری کے اعلیٰ درجہ پر اپنی بلندئ فکر اور تفسیرِ جذبات کی وجہ سے یہ سارے شعرا اپنی قومی خصوصیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی عالمگیر اور آفاقی ہوجاتے ہیں۔''[4]

وہ اس لیے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے لوگوں میں ذات پات مذہب وغیرہ کے اختلاف کے باوجود ان کے ذہن و دل میں یکسانیت اور ان میں کچھ مشترکہ خصوصیت پائی جاتی ہیں... دنیا کی تمام زبانوں کے ادب پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عالمی ادب میں دوڑتی ہوئی انسانیت کی روح اور اس میں یکسانیت اس بات کی علامت ہے کہ احساسات علاقائی اختلاف و عصبیت سے ماورا ہوتی ہے۔''[5]

حواشی

1. لسانی ہم آہنگی اور اردو زبان: عبدالرشید صدیقی، ص 4
2. مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ: محمد حسن، ص 364
3. مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ: محمد حسن، ص 364
4. انیس اور فردوسی کا تقابلی مطالعہ: سید فدا حسین، ص 1,2
5. تلناتمک شودھ اور سمیکشا: پی۔ ادیشور راؤ، ص 2

■

Dr. Irshad Niazi
Dept of Urdu, Dehli University
Delhi- 110007 (UP)
Mob.: 9650467303
niaziirshad@yahoo.com

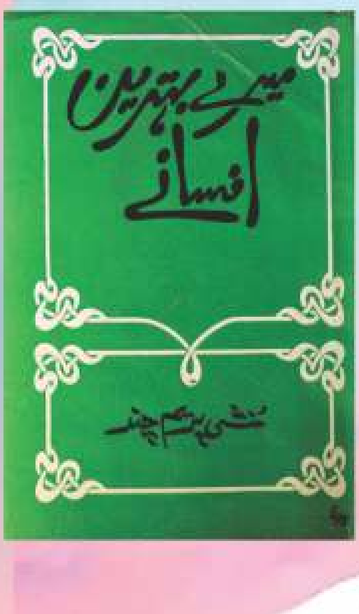

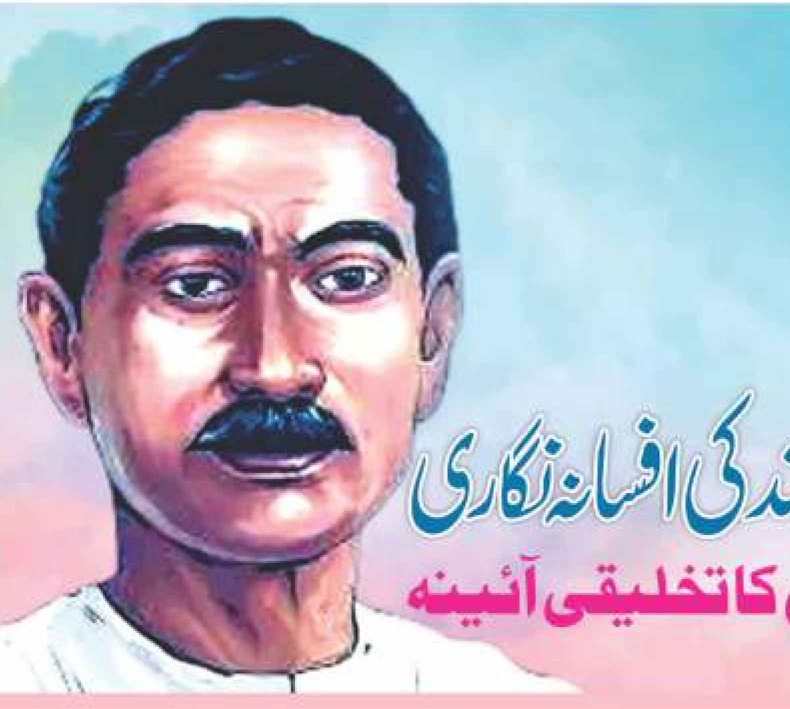

ریاض توحیدی

پریم چند کی افسانہ نگاری

فکر و فن کا تخلیقی آئینہ

"ادب سماج کے اچھے اور برے اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔"

نفسیاتی سطح پر دیکھیں تو انسان کی سوچ وفکر کا اثر اس کی تحریر وتقریر اور الفاظ واعمال سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے اور اگر وہ کوئی نظریہ رکھتا ہو تو پھر اس نظریے کی تشہیر اس کی فکری مجبوری بھی بن جاتی ہے۔ ادب میں بھی، چاہے کوئی کتنا بھی انکار کرے، فکر ونظر کے اثرات اپنی جگہ بنا ہی لیتے ہیں اور یہ کوئی غیر ادبی کام بھی نہیں ہے کیونکہ ایک ادیب بھی تو سماج کا ایک فرد ہے، اس کی سوچ وفکر پر بھی سماجی اثرات مرتسم ہوجاتے ہیں اور ادب تو ادیب کی سوچ وفکر کا ہی تحریری یا تخلیقی ثمر ہوتا ہے۔ ادب کا کام صرف تخریب کو اجاگر کرنا نہیں ہے بلکہ تعمیر کی طرف بھی توجہ دینا ہے، مگر یہ ادبی دائرے میں ہو نہ کہ واعظانہ یا ناصحانہ اسلوب کی بھینٹ چڑھے۔ اس کے باوجود ادب میں فن کاری سے متعلق یہ خیال بھی پیش نظر رہے کہ ہر تخلیق صرف اچھے برے کے پیغام کی حامل ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے کیونکہ فن میں کبھی کبھار فن کاری کے جوہر ہی نظر آتے ہیں جو انسان کو جمالیاتی سطح پر محظوظ کرتے ہیں۔ اس لیے اس قسم کے ادب کی بھی اپنی فنی اہمیت ہوتی ہے۔ اردو فکشن میں افادی یا مقصدی فکر یا ادب برائے زندگی (Art for life's sake) کا رجحان جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے اور... پریم چند کی فکشن نگاری کے بغائر مطالعہ سے مظہر ہے کہ مجموعی طور پر، پریم چند کا فکشن سماج کے اچھے اور برے اقدار کی عمدہ عکاسی کرتا نظر آتا ہے جو کہ افادی یا مقصدی فکر اور ادب برائے زندگی کی واضح مثال ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ پریم چند کا اصلاحی فکر کا حامل ہونا ہے۔

پریم چند کی فکشن نگاری خصوصاً افسانہ نگاری پر توجہ مرکوز رکھیں تو پریم چند کا بیشتر فکشن افادی یا مقصدی نوعیت کا ہے اور یہ مقصدآمیز اصلاحی فکر ان کے ناولوں اور افسانوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے جو کہ فن کی افادیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس افادی یا اصلاحی فکر میں حب الوطنی، انقلابی سوچ، تعمیر کا مقصد، سماجی ہم آہنگی، استحصال اور سماج کی اچھائی اور برائی وغیرہ کو اجاگر کرنا شامل ہے۔ ادب کے تعلق سے، پریم چند کی اس قسم کی مقصدی فکر کا اندازہ ان کے اقوال سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے۔ جیسے:

"مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میں اور چیزوں کی طرح فن کو بھی افادیت کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔"

"ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ ادب کو ہماری زندگی پر تبصرہ کرنا چاہیے۔"

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"2

ادب کے ضمن میں پریم چند کے خیالات کا اطلاق ان کی فکشن تخلیقات پر کریں تو ان میں واضح طور پر یہ سب باتیں کسی نہ کسی پہلو سے آشکار ہوجاتی ہیں۔ (ترقی پسند تحریک یا ان کی سیاسی وابستگی کی بحث اپنی جگہ پر۔) تاہم ان نظریاتی مباحث کے باوجود پریم چند کی فکشن نگاری کا معیار ان کی فن کاری پر ہی ہے کیونکہ اگر فکشن میں فنی لوازمات نہ برتے جائیں پھر وہ کتنا ہی اصلاحی یا مقصدی نوعیت کا کیوں نہ ہو وہ اپنی ادبی شناخت قائم رکھنے میں ناکام ہی ہوگا۔ کیونکہ فکشن کے اپنے فنی و تکنیکی تقاضے ہیں اور ان فنی وتکنیکی تقاضوں کا شعور ہونا لازمی ہے۔ ایک اور بات یہ کہ ادبی تخلیق، تخلیقی بصیرت مندی (Creative vision) کی حامل ہو اور یہی تخلیقی وژن اس کو فن کے دائرے میں لاتا ہے، پریم چند کے فکشن کو یہی فنی وتکنیکی عوامل اور تخلیقی بصیرت مندی اعلی فکشن کے زمرے میں شامل کردیتی ہے اور انھیں اردو کا اولین معتبر افسانہ نگار کا درجہ عطا کرتی ہے۔ یہ سبھی فنی وتخلیقی اور افادی خصوصیات ان کے ناولوں 'ہم خرما و ہم ثواب' (سماجی اصلاح)، 'نرملا' (بے جوڑ شادی اور اقتصادی مسائل)، 'میدان عمل' (انگریزی اقتدار سے نفرت)، 'چوگان ہستی' (صنعتی تہذیب) اور 'گئودان' (کسان کی معاشی ومعاشرتی زندگی) وغیرہ اور افسانوی مجموعوں سوز وطن، پریم پچیسی: حصہ اول، پریم بتیسی: حصہ دوم، خاک پروانہ، خواب وخیال، فردوس خیال، پریم چالیسی، آخری تحفہ، زاد راہ، دودھ کی قیمت اور 'واردات' وغیرہ کے بیشتر افسانوں میں نظر آتی ہیں۔

پریم چند کے فکشن خصوصاً افسانہ لکھنے کے تخلیقی مراحل درجہ بہ درجہ ارتقا کی جانب بڑھتے رہے۔ ابتدا میں جو موضوعات یا مسائل پیش ہوئے تھے رفتہ رفتہ ان میں وسعت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ نکھار بھی آتا گیا۔ پریم چند کے افسانوں کے فکری وفنی ارتقائی مراحل کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"ان کے افسانوں کے مختلف مجموعوں پر نظر ڈالنے سے ان کی افسانہ نگاری میں بتدریج ارتقا نظر آتا ہے۔

اگر ایک طرف 'سوز وطن' کو رکھا جائے اور دوسری طرف ان کے آخری دور کے مجموعہ 'واردات' اور 'زادراہ' کو تو ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔ ان کے آخری دور کے افسانے 'قطرۂ شبنم' کی طرح اپنے اندر ایک مکمل دنیا رکھتے ہیں۔ ان میں گہرائی اور حسن دونوں زیادہ ہیں۔"3

پریم چند کی افسانہ نگاری فن، فکر اور افادیت کا مجموعہ ہے اور ان افسانوں میں اصلاح پسندی بھی نظر آتی ہے اور انقلابی فکر بھی، لیکن فنی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے۔ فنی تقاضوں کے پیش نظر جب ان کے افسانوں پر ارتکاز کریں تو ان میں پلاٹ سازی کا بھی ماہرانہ اہتمام نظر آتا ہے اور کردار نگاری، موضوعاتی برتاؤ کا تکنیکی و تخلیقی اظہار، جزئیات نگاری، کردار سازی، وحدت تاثر اور مشاہدہ و واقعہ کو فکشن بنانے کی ہنرمندی کا شعور بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ فن اور فکر کی عمدہ خوبیاں پریم چند کے کئی افسانوں میں نظر آتی ہیں جن میں دنیا کے سب سے انمول رتن، کفن، پوس کی رات، عیدگاہ، حج اکبر، بڑے گھر کی بیٹی، راہ نجات، نمک کا داروغہ، شکوہ شکایت، زیور کا ڈبہ، شطرنج کے کھلاڑی اور ٹھاکر کا کنواں وغیرہ شامل ہیں۔

پریم چند کے افسانے متنوع موضوعات کی تخلیقی عکاسی کرتے ہیں۔ تخلیق کار گردوپیش کے ماحول سے ضرور متاثر ہوجاتا ہے۔ پریم چند کا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' بھی اس وقت کے سیاسی و سماجی ماحول کے زیر اثر تخلیق ہوا ہے۔ اس وقت ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا اور ہندوستانی اس غلامی سے آزاد ہونے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ چونکہ پریم چند بھی وطن کی آزادی کا جذبہ دل میں سموئے ہوئے تھے تو ایک تخلیق کار کی حیثیت سے انھوں نے بھی اپنے افسانوں میں حب الوطنی کا اظہار کرتے ہوئے آزادی کے متوالوں کی قربانیوں کو موضوع بنایا، جس کا نمونہ افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' ہے (اشاعت 1907)۔ افسانہ داستانوی اسلوب کا حامل ہے اور تخیل کی بنیاد پر مرکزی کردار عاشق 'دلفگار' اور اس کی معشوقہ 'ملکہ دلفریب' کی عشقیہ کہانی بیان ہوئی ہے۔ دراصل اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ آزادی کے حق میں کوئی بھی کھلے طور پر نہیں لکھ سکتا تھا جس کا ثبوت پریم چند کے پہلے افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' کو انگریزی سرکار کی جانب سے جلانے کا واقعہ ہے اور جس میں یہ افسانہ بھی شامل تھا۔ اگر اس افسانے کی کہانی، کردار نگاری اور پیغام کو ردتشکیل تھیوری (Deconstruction theory) کے مطابق بین المتن (Inter text) معنی و مفہوم پر غور کریں اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر (Point of view) کے پیش نظر دیکھیں تو افسانہ نگار نے بظاہر اس افسانے میں ایک عشقیہ کہانی بیان کی ہے لیکن علامتی سطح پر یہ ایک محبِ وطن عاشق 'دلفگار' وطن کی سرزمین

معشوقہ 'ملکہ دلفریب' اور وطن کی آزادی کے لیے دنیا کی پیش بہا شے 'انسانی خون' کی قربانی کا سارا ماجرا علامتی نوعیت کا بن جاتا ہے اور افسانہ پڑھ کر یہ ساری حقیقت کھل کر ظاہر ہوجاتی ہے۔ ملکہ دلفریب جب

فن اور فکر کی عمدہ خوبیاں پریم چند کے کئی افسانوں میں نظر آتی ہیں جن میں دنیا کے سب سے انمول رتن، کفن، پوس کی رات، عیدگاہ، حج اکبر، بڑے گھر کی بیٹی، راہ نجات، نمک کا داروغہ، شکوہ شکایت، زیور کا ڈبہ، شطرنج کے کھلاڑی اور ٹھاکر کا کنواں وغیرہ شامل ہیں۔

اپنے عاشق دلفگار کے عشق کا امتحان لینے کے لیے اس کے سامنے یہ شرط رکھتی ہے کہ:

"اگر تو میرا سچا عاشق ہے۔ تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔"4

تو دلفگار اپنے عشق کی لاج رکھنے اور معشوقہ کو پانے کے لیے یہ شرط قبول کرتا ہے اور پھر پریشانی کے عالم میں جنگل جنگل، بستی بستی اس بیش بہا شے کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دوران کہانی میں دلفگار کی طرف سے دو چیزیں لانے کا ذکر ہوا ہے۔ ایک آنسو اور دوسرا ستی کی راکھ لیکن معشوقہ دونوں چیزوں کی قدر کرتی ہے تاہم پھر بھی اسے اصلی قیمتی شے لانے کو کہتی ہے۔ یہاں پر واضح ہوجاتا ہے کہ آزادی آنسو کے بہانے سے حاصل نہیں ہوتی ہے اور نہ غیر ضروری تو ہماتی قربانیاں دینے سے ہی بلکہ اس کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے وہ اس افسانے کا بنیادی مقصد اور افسانہ نگار کا نقطۂ نظر ہے۔ جو افسانے کے انجام سے واضح ہوجاتا ہے اور یہی چیز افسانے کو معیار عطا کرتی ہے۔ قیمتی شے کی تلاش میں دلفگار بھٹکتا رہتا ہے اور ایک دفعہ وہ میدان کارزار میں ایک محبِ وطن زخمی بہادر کو دیکھتا ہے جس نے بہت سارے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور خود بھی زخمی ہوا تھا۔ دلفگار جب اسے پوچھتا ہے کہ 'اے جواں مرد تو کون ہے؟' تو وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور دلیرانہ لہجے میں کہتا ہے:

"کیا تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لخت جگر ہوں۔"5

یہی سے افسانہ اپنے اصلی تھیم کی طرف مڑ جاتا ہے نہیں تو اس سے پہلے یہ ایک عشقیہ داستان کا تاثر چھوڑتا ہے۔ افسانہ نگار نے عمدہ تکنیکی وسیلے کا استعمال کر کے افسانے کو بنیادی موضوع کی طرف ٹرن کیا ہے اور دلفگار اس زخمی محبِ وطن کے خون کے قطرے کو یہ سوچتے ہوئے ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے کہ "بے شک دنیا میں اس قطرہ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہوسکتی۔"

کلائمکس میں جب دلفگار اس خون کے قطرے کو لے کر ملکہ دلفریب کے دربار میں پہنچتا ہے اور اس کی خدمت میں حاضر کرتا ہے تو وہ خوش ہوجاتی ہے اور کہتی ہے کہ "آج سے تو میرا آقا اور میں تیری کنیز ناچیز۔" اس کے بعد ملکہ صندوقچہ منگواتی ہے اور اس سے ایک تختی نکالتی ہے جس پر آب زر سے لکھا ہوتا ہے:

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے 'دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔"6

اس طرح افسانہ اپنے عنوان، موضوع، پیغام اور انجام میں عمدہ فنی ربط قائم کرنے میں کامیاب رہا ہے اور پریم چند کی حب الوطنی، آزادی کی دھن اور انقلابی فکر کو بھی اجاگر کرتا ہے اور ساتھ ہی اس زمانے میں لوگوں کے اندر آزادی کا جو جذبہ ابھر رہا تھا وہ بھی دلفگار کی کردار نگاری سے سامنے آتا ہے۔

پریم چند انگریزی ادب سے واقف تھے کیونکہ گریجویشن کرنے کے دوران تاریخ، فارسی اور انگریزی بھی

ان کے سبجیکٹ تھے اور ٹالسٹائی کے فکشن کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ہوسکتا ہے انھوں نے انگریزی کے دوسرے افسانے بھی پڑھے ہوں جوان کی فن افسانہ نگاری پر گرفت سے ظاہر ہے۔ فلمی دنیا میں بھی چلے گئے اور ایک فلم 'مزدور' کی کہانی لکھی تھی اور اس میں ایک رول بھی ادا کیا تھا لیکن فلمی ماحول سے دلبرداشتہ ہوکر واپس آ گئے۔

پریم چند خود دیہات کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ان کے بیشتر افسانے دیہی زندگی، رسم و رواج، غربت اور دیہاتی لوگوں کی فکر وسوچ کی نفسیاتی وسماجی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں سماجی ہم آہنگی، پیار ومحبت اور گھریلو مسائل وموضوعات کا افسانوی روپ بھی دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ 'عید گاہ' میں اگرچہ ایک غریب مسلم گھرانے کی زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو موضوع بنایا گیا ہے، لیکن اس کا ایک اہم اور قابل ستائش پہلو یہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار 'حامد' جو کہ ابھی کم سن ہی ہے اور والدین کے انتقال کے بعد اپنی غریب دادی کی پرورش میں ہے، غریب ہونے کے باوجود حساس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک خوددار کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ حامد جب عید گاہ جانے کے لیے اسرار کرتا ہے تو دادی مجبوراً اسے تین پیسے دیتی ہے۔ لیکن عید گاہ میں پہنچ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے بچوں کے پاس بہت سارے پیسے ہیں اور اس کے پاس بہت کم تو کیا خریدے کیا نہ خریدے۔ وہ کھانے کی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر خود کو تسلی دیتا ہے۔ جب اسے وہاں کے جان پہچان والے لوگ مفت میں جھولے کی سواری کے لیے کہتے ہیں تو اس کی خودداری اسے مفت کی سواری کرنے سے روکتی ہے۔ افسانے میں اس کی ذہانت کو اچھی فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ جب کھلونے کے بجائے ایک سستا سا چمٹا خریدتا ہے تو دوسرے دوست اس پر ہنستے ہیں کہ چمٹے کا کیا کرے گا، لیکن وہ اپنی ذہانت سے چمٹے کی اتنی تعریف کرتا ہے کہ بچوں کو اپنے قیمتی کھلونے بے رنگ لگتے ہیں، لیکن مٹھائی کھانے یا کھلونے خریدنے کے بجائے دست پناہ (چمٹا) خریدنے کی حامد کو کیا ضرورت پڑی یا اس نے کس مقصد کے لیے اپنی خوشیوں کو قربان کیا تو اس کی طرف افسانہ فکر انگیز خیال سے اشارہ کرتا ہے:

''حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خرید لے گا۔ اماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ...'' 7

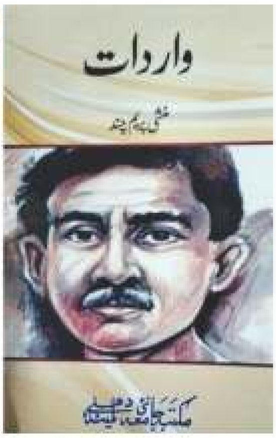

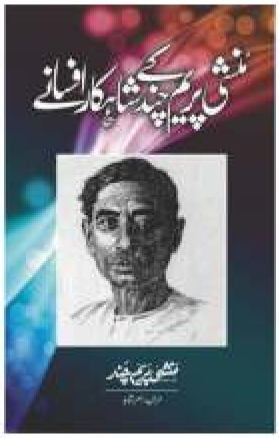

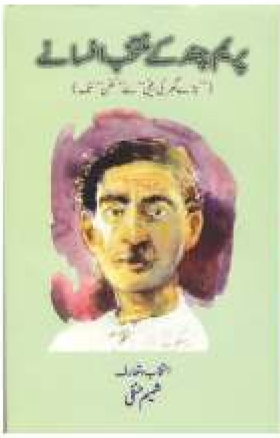

اس طرح افسانہ نگار نے ایک غریب بچے کی ابھرتی ڈوبتی خواہشات کو کھلونے خریدنے کے بجائے دادی اماں کے لیے چمٹا لے جانے کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ افسانے کی کہانی پڑھ کر نظیر اکبرآبادی کی نظم 'مفلسی' کا پہلا شعر یاد آتا ہے۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی

افسانہ 'عید گاہ' اتنا معیاری افسانہ ہے کہ اس کو ادب اطفال کے شاہکار افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار 'حامد' کے علاوہ دوسرے کئی اور کردار بھی بچے ہیں، لیکن بنیادی موضوع غربت اور بچوں کی نفسیات ہے۔ اس کے علاوہ اس میں عید گاہ کی منظر نگاری، روحانی ماحول اور نماز کے دوران اسلامی اخوت و بھائی چارے وغیرہ کو بھی پلاٹ کا حصہ بنایا گیا ہے' جیسے عید گاہ میں نماز کے تعلق سے چند جملے دیکھیں:

''یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہے۔''

''دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔''

''گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔'' 8

پریم چند کی افسانہ نگاری میں جگہ جگہ مقصدیت کا عنصر غالب ہے اور اس مقصدیت میں سماجی اصلاح کے جذبے کا مخصوص تاثر موجود ہے جیسے افسانہ 'بڑے گھر کی بیٹی' اور 'نمک کا داروغہ' دونوں افسانوں کا پیغام اخلاقی نوعیت کا ہے جو اخلاقی وسماجی اصلاح پسندی کی غمازی کرتا ہے۔ ادبی طور پر اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے کہ فکشن میں اصلاحی ومقصدی پہلو ابھر آئے کیونکہ فکشن کا مطالعہ ہر طرح کا ذہن رکھنے والے قارئین کرتے ہیں اور اس کو کسی مخصوص دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا ہے۔ افسانہ 'بڑے گھر کی بیٹی' ایک ایسا سماجی واصلاحی نوعیت کا افسانہ ہے جو خاتون اسے پڑھے گی تو اس کے اندر گھر گرہستی کو خوش گوار ماحول میں چلانے کا مثبت پیغام پیدا ہوگا۔ اسی طرح افسانہ 'نمک کا داروغہ' کسی بھی ذہین انسان کی دیانت داری کا سماجی اعتراف اور سماج میں رشوت خوری کی برائی کو جڑ سے اکھاڑنے کا اخلاقی درس ہے۔ 'بڑے گھر کی بیٹی' کی کردار نگاری میں 'آنندی' کا کردار گھر کا اتحاد واتفاق قائم رکھنے کے لیے اچھے ڈھنگ سے تراشا گیا ہے کیونکہ آنندی ہی گھر کے بٹوارے کو روکنے میں اہم رول نبھاتی ہے جو کہ اس افسانے کو ایک اہم سماجی افسانہ بناتا ہے۔ اسی طرح 'نمک کا داروغہ' ایک ذمے دار شہری اور ایماندار سرکاری عہدے دار کی فرض شناسی کا حامل بہترین افسانہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار منشی بنسی دھر ہے جس کی دلیری' خودداری' دیانت داری اور فرض شناسی کے اردگرد پورا افسانہ گھومتا ہے اور اس کی خوبیوں کی وجہ سے اسے بہت سی مشکلات بھی جھیلنی پڑتی ہیں لیکن بالآخر استحصالی نظام اور بے ایمان لوگوں کی ہار ہو جاتی ہے اور ایمانداری اور فرض شناسی کی جیت بصورت منشی بنسی دھر ہو جاتی

ہے۔اس قسم کے افسانے اپنی موضوعاتی اور اخلاقی اہمیت آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔اس کو ان افسانوں کی ایک اہم خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔

افسانہ نگار بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہوتا ہے اور اگر افسانے میں تخلیقی رنگ نہیں ہوگا تو وہ ایک اطلاعاتی متن (Informative tex) کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا اور اس کی ادبی یا فنی حیثیت کچھ بھی نہیں باقی رہے گی۔پریم چند کا افسانہ 'کفن' فکر و فن اور تخلیقی رنگ سے مزین ایک شاہکار افسانہ ہے۔یعنی یہ اردو کے چند شاہکار افسانوں میں شامل ہے۔اس افسانے میں پریم چند کی فنی ہنرمندی اپنے عروج پر ہے۔افسانے کا عنوان 'کفن' ایک طرح سے پورے افسانے کا علامتی کفن معلوم ہوتا ہے جس کے اندر سماج کے بے بس اور نادار لوگ سسک سسک کر زندگی کی صرف سانسیں لینے تک خود کو محدود رکھتے ہیں نہ انسانیت کی پروا اور نہ ہی غم و خوشی کا احساس' بس روٹی کے دو ٹکڑے دیکھ کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔نہیں تو افسانے کے بنیادی کردار باپ بیٹے' گھیسو اور مادھو' گھر کی عزت مردہ بہو کے لیے جمع کردہ پیسوں سے کفن خریدنے کے بجائے دارو پینے کو ترجیح کیوں دیتے۔وہ کہتے ہیں:

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کھن (کفن) چاہیے۔'' 9

یہ مکالمہ اگرچہ باپ بیٹے کے درمیان ہو رہا ہے لیکن اسی سے افسانہ نگار کا بنیادی مقصد بھی سامنے آتا ہے کہ افسانہ 'کفن' علامتی پیرایے میں سماجی ناانصافی (Social injustice) اور معاشی استحصال (Economic expolitaion) کے پردے چاک کر رہا ہے۔اب اس قسم کی بحث ہم کس طرح افسانے میں چھیڑ سکتے ہیں کیونکہ ایک طرف افسانہ نگار گھیسو اور مادھو جیسے سماجی کرداروں کا تعارف ابتدا میں کاہل' کام چور وغیرہ جیسے منفی خصائل سے کرواتا ہے تو قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب یہ لوگ خود کام دھندہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے تو ان پر استحصال کیسا اور افسانہ پھر کیسے سماجی استحصال کو موضوع بنا رہا ہے؟ تو اس کا اشارہ خود افسانہ نگار افسانے میں اس طرح سے کرتا ہے:

''جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے' کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔''10

اس طرح افسانہ نگار نے بڑی ہوشیاری سے افسانے کے بنیادی مقصد کی حساسیت کو واضح کر دیا ہے' اگر یہ وضاحت نہ ہوتی تو قاری گھیسو اور مادھو جیسے کاہل اور کام چور لوگوں پر اشرافیہ طبقے کے استحصال کو کیسے قبول کرتا کیونکہ یہ لوگ کام ہونے کے باوجود کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور افسانہ موضوعاتی ترسیل میں متنازع پیغام (Controversial message) کا حامل بن جاتا جو کہ اس کے تخلیقی استحکام پر سوال کھڑا کر دیتا۔کیونکہ افسانے میں جس موضوع کو پلاٹ کا حصہ بنایا جاتا ہے تو اس میں موضوعاتی نشیب و فراز کا منطقی ربط رکھنا پڑتا ہے۔دراصل افسانہ نگار نے افسانے میں موضوع کے منطقی ربط کا خیال رکھتے ہوئے سماج کے اس ماحول کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے کہ جہاں سرمایہ دارانہ نظام (Captalistic syestem) کی اجارہ داری ہو تو اس نظام کے زیر اثر مجبور و محکوم لوگوں کی سوچ و فکر اور زندگی گزارنے کے طور طریقے کس قسم کے بن جاتے ہیں۔

یہاں پر افسانے کا مفصل جائزہ مقصود نہیں ہے بلکہ اس افسانے کے بنیادی قضیے اور فن کاری پر توجہ دینی ہے۔افسانہ مشاہدہ، تخیل، فن کاری اور تخلیقی اسلوب کی عمدہ عکاسی کرتا ہے اور مشاہدے کی بنیادی طور پر ایک ایسے سماج کی زمینی صورت حال کو فن کے قالب میں ڈھالتا ہے جہاں سماجی سطح پر استحصال کا دور دورہ اتنا ہے کہ اب اس استحصال کے زیر اثر دبے کچلے انسانوں کی انسانیت بھی مر چکی ہے اور ان کا ضمیر بھی مردہ ہو چکا ہے یہاں تک کہ گھر میں لاش پڑی ہے اور یہ لوگ مانگے ہوئے پیسوں سے کفن خریدنے کے بجائے شراب پینے میں مست ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹی تسلی دیتے رہتے ہیں۔فن کاری میں مشاہدے کو تخیل کا حصہ اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ پورے افسانے کا پلاٹ تخلیقی نوعیت کا بن گیا ہے۔راوی پورے افسانے میں کہانی کو گھماتا رہتا ہے اور حسب موقع کرداروں کے مکالمے پیش کرتا رہتا ہے۔کردار نگاری میں غضب کا مشاہدہ نظر آتا ہے کیونکہ ہر کردار کی نفسیات' سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور عملی پہلوؤں کو بڑی باریک بینی سے پلاٹ کا حصہ بنایا گیا ہے۔پیامی سطح پر کہیں کہیں طنز و طلیح بھی نظر آتا ہے اور تکنیکی سطح پر ڈرامائی موڑ بھی دکھائی دیتا ہے جو کہ کہانی میں نکھار لاتا ہے:

''سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔پھر دونوں ناچنے لگے۔اچھلے بھی۔کودے بھی،گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر گر پڑے۔''11

پریم چند فن افسانہ کے تکنیکی و تجرباتی شعور کا ملکہ رکھتے تھے جس بنا پر وہ کسی بھی موضوع کو بڑی ہنرمندی سے فکشن بناتے تھے۔وہ کسی بھی سماجی موضوع کو تخلیقی اسلوب میں اس طرح بیانیہ میں ڈھالتے کہ افسانہ پلاٹ مکالمہ نگاری، کردار سازی اور کہانی پن کی دلکشی سے سنور جاتا تھا۔ان کے افسانوں کا اسلوب بھی سادہ تھا جو کہ قاری کے مطالعاتی دلچسپی کا باعث بنتا تھا اور وہ کسی بھی سماجی موضوع کو کہانی کے روپ میں اس طرح پیش کرتے تھے کہ اس میں قصہ پن بھی ہوتا ہے اور کہانی کا روایتی انداز بھی جو کہ قاری کی پسند کا موجب بنتا تھا۔

حواشی

1. Literatureand Society (S. Keerthiks). Journal: International Journal of Seience, Engineering and Managments. P: 472, April2018) :
2. پریم چند: خطبہ صدارت: انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس، بحوالہ: کتاب مضامین پریم چند' مرتب: عتیق احمد، ص 176-77، انجمن ترقی اردو، 1981
3. منشی پریم چند، شخصیت اور کارنامے۔مرتب: پروفیسر قمر رئیس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، علی گڑھ ص 421
4. افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' منشی پریم چند (افسانوی مجموعہ: سوز وطن، مقدمہ و حواشی علی احمد فاطمی، ناشر: تہذیب نو پبلیکیشنز، الہ آباد
5. ایضاً
6. ایضاً
7. افسانہ 'عیدگاہ' منشی پریم چند، افسانوی مجموعہ: دودھ کی قیمت، ناشر: عصمت بک ڈپو دہلی
8. ایضاً
9. افسانہ 'کفن'' منشی پریم چند، کتاب: پریم چند کے منتخب افسانے، انتخاب: شمیم حنفی، ناشر: انجمن ترقی اردو نئی دہلی
10. ایضاً،
11. ایضاً

■

Reyaz Tauheedi Kashmiri
Wadipora Handwara
Kashmir - 193221 (J & K)
Cell: 9906834877
Email: drreyaztawheedi777@yahoo.com

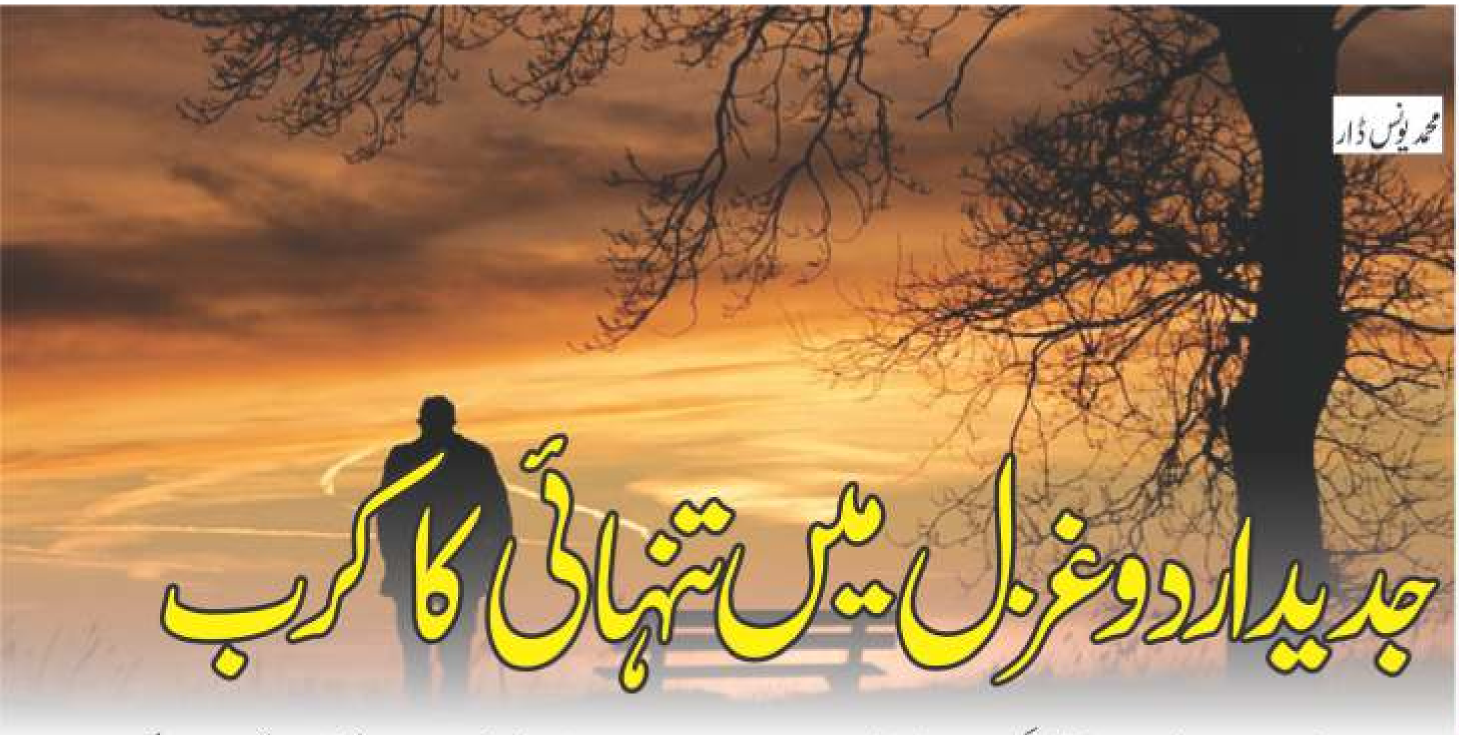

محمد یونس ڈار

جدید اردو غزل میں تنہائی کا کرب

1960 کے بعد جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھی جانے والی غزل 'جدید غزل' کہلاتی ہے۔ 'یہ غزل جدید انسان اور جدید معاشرے کی حسیت اور اس کی ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں اور مسائل کی عکاس ہے۔' اس غزل کی تشکیل میں دو عالمی جنگوں اور تقسیم ہند کے المیے کا بڑا ہاتھ ہے۔ عالمی جنگوں سے جہاں انسان اپنے وجود کی ارزانی سے باخبر ہوا وہیں تقسیم کے المیے سے ''خاک وخون کے ہنگاموں نے ذہنوں کو زخموں کی کائنات سے آشنا کیا، دل شکن ماحول اور درد خیز فضا نے آزادی کے معنی بدل دیے۔''1

کلاسیکی تنہائی کا تصور خدا کے تصور تنہائی سے الگ ہوتا تھا کہ خالق کائنات سب سے بڑا فن کار ہے لہٰذا وہ سب سے تنہا ہے۔ چنانچہ ہر بڑا فنکار اپنے عہد میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے یعنی زندگی میں نئی معنویت کی تلاش کے لیے تنہائی نے پیغمبروں، ولیوں، مفکروں، فلسفیوں، دانش وروں اور شاعروں کو اپنے مقصد، مشن اور وژن کی تکمیل کے لیے گوشہ نشینی اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تنہائی کی مثالیں ہمیں کلاسیکی ادبیات میں بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ غرض تنہائی کا تصور روزِ اول سے ادب کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ لیکن آج کی تنہائی میکانکی اور صنعتی زندگی کے جبر کی ایجاد کردہ ہے جو مادیت پرستی، ہوس پرستی، لالچ اور خودغرضی کی بنیادوں پر استوار' انفرادیت سے عاری اور داخلیت سے خالی ہے، جس میں وجود کی بے چارگی کا احساس فن کار کو موت کی تمنا کا طالب بنا دیتا ہے تاکہ اس کی ازلی تنہائی کا ازالہ ہو سکے۔

اگرچہ ہندوستان میں مغرب جیسی ترقی، دوڑ دھوپ، خوش حالی اور خودغرضی نہ تھی جو تنہائی اور اکیلے پن کو رزق فراہم کرتی لیکن اس خطے کی انسانیت کو کچھ ایسے سنگین حالات کا سامنا تھا جن سے یہاں کا فرد تنہائی کی گود میں اپنی عافیت محسوس کرتا تھا۔ ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

''مغرب کی تہذیبی جارحیت، فوجی مادیت، اقتصادی آمریت، استحصالی صارفیت اور ہندوپاک میں تہذیبی ولسانی عصبیت، فرقہ وارانہ منافرت، قبیلہ جاتی عداوت، تقلیدی مذہبیت، ظلم و بربریت، افلاس وغربت، بیماری و جہالت، بنیاد پرستانہ سیاست، بوالہوسی وخودغرضی وغیرہ جیسے متعدد مہلک اور خطرناک مسائل نے اردو سائکی کو مزید بحران وانتشار میں مبتلا رکھا ہے۔ جس کے نتیجہ میں تنہائی کا احساس شدید تر ہو گیا۔''2

جدید شاعری نے انسان کے جس بنیادی مسئلہ کی نشاندہی کی ہے وہ تنہائی ہے۔ اردو کی دیگر اصناف سخن کے ساتھ غزل کا عہد آفرینش سے تنہائی کے ساتھ رشتہ استوار ہے بلکہ یہ تنہائی کی گود اور رزق سے پلی بڑھی ہے۔ اس نے وقتاً فوقتاً تنہائی کی عکاسی اور اس سے متعلق دیگر کیفیات کو بھی اپنے دامن میں سمو کر ان کی خوب سے خوب تر عکاسی کی ہے۔ جدید دور میں جب میکانکی سماج اور مشینی تمدن سے سیاسی، سماجی اور تمدنی اقدار کی شکست وریخت نے انسان سے اس کی انفرادیت اور داخلیت چھین لی تو اس کے اندر بے چینی اور اضمحلال پیدا ہوا۔ دل اور روح کی جگہ جسم اور مادیت کی ریل پیل نے اعلیٰ قدروں کی تلاش کو بے معنی بنا دیا۔ جس سے ایک طرح کی تھکن نے جنم لیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی نت نئی مصنوعی ایجادات، معاشرے میں رشتوں کے تقدس کی پامالی اور اجنبیت نے وجود کی بے معنویت کو فروغ دے کر فرد کو بھیڑ میں بھی تنہا کر دیا۔ بریں سبب اس کو اپنے ہر عمل کا فیصلہ خود کرنا پڑے گا اور اس عمل کے نتائج کا وہ تنہا ذمہ دار بھی ہوگا جو نفسیاتی سے زیادہ وجودی عمل معلوم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح — لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا
(احمد فراز)

اس سفر میں بس مری تنہائی میرے ساتھ ہے — ہر قدم کیوں خوف مجھ کو بھیڑ میں کھونے کا تھا
(شہریار)

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں — ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں
(ظفر اقبال)

عمر بھر کانٹوں میں دامن کون الجھاتا پھرے — اپنے ویرانے میں آ بیٹھا ہوں دنیا دیکھ کر
(ساقی فاروقی)

کیوں چلتے چلتے رک گئے ویران راستو — تنہا ہوں آج میں ذرا گھر تک تو ساتھ دو
(عادل منصوری)

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مر گئے — وہ صدا کو ڈھونڈتی تھی جنگلوں میں کھو گئی
(پرکاش فکری)

بھرے شہروں میں بھی تنہائی، بھیڑ میں بھی تنہائی کی ہم راہی، ریت کی طرح

بکھر جانا، ویرانے میں بیٹھنا، تنہا ویران راستوں سے گھر تک کا ساتھ مانگنا، اکیلے پن کے ہاتھوں مرجانا، دفتر سے گھر تک تنہائی کا احساس وغیرہ ایسی بے شمار مثالیں جدید غزل میں موجود ہیں جن سے موجودہ عہد کے انسان کی میکانکی خصوصیات کا حامل ہونا آنکھوں کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔

اگرچہ سائنس اور ٹکنالوجی نے دنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کیا ہے اور انسانوں کے درمیان خارجی دوریوں کو پاٹ دیا ہے لیکن آج کے دور کا انسان اندر سے تنہا ہوگیا۔ جس کی بنیادی وجہ اس کی تمام تر روحانی و اخلاقی اقدار، مقررہ نظریوں اور فارمولوں سے ناوابستگی کا اظہار ہے "چونکہ یہ عمل بہت کٹھن ہے اور اس کے سارے سہارے چھن چکے ہیں اس لیے زندگی کا کرب اسے اکیلے جھیلنا پڑتا ہے۔"[3]

میکانکی سماج اور مشینی معاشرے کی پیداوار سے انسان کی زندگی جہاں آسائش اور سہولیت سے بسر ہونے لگی اور زندگی کے معیار، غور وفکر کے اسلوب اور تخیل کی وسعت میں تبدیلی واقع ہوئی، وہیں وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہوکر وجودی ہوگیا۔ وہ اپنی فکر کو افادی پہلو کے مدنظر رکھنے لگا جس سے اس کے اندر لالچ کا مادہ بڑھ گیا۔

ان روایتی نفسیاتی سہاروں کے چھوٹ جانے سے نہ صرف تنہائی نے اس کا تعاقب کیا بلکہ تنہائی سے وابستہ دیگر رجحانات ومیلانات جیسے اجنبیت و بیگانگی، اداسی، انتشار، اکیلا پن، بیزاری، بے چہرگی، بے قدری، بے معنویت، خوف و دہشت، ناامیدی اور محرومی وغیرہ کا منبع بھی یہی احساسِ تنہائی قرار پایا۔ ان سے فرار کا بظاہر کوئی راستہ تو نہیں ملتا اور ایک طرح کی گھٹن محسوس ہوتی ہے تاہم اس گھٹن کا حصار توڑنے کے لیے وہ تشدد، خودکشی، جنس، موت، منشیات وغیرہ کا استعمال عمل میں لاتا ہے۔

میکانکی سماج اور مشینی معاشرے کی پیداوار سے انسان کی زندگی جہاں آسائش اور سہولیت سے بسر ہونے لگی اور زندگی کے معیار، غور وفکر کے اسلوب اور تخیل کی وسعت میں تبدیلی واقع ہوئی، وہیں وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہوکر وجودی ہوگیا۔ وہ اپنی فکر کو افادی پہلو کے مدنظر رکھنے لگا جس سے اس کے اندر لالچ کا مادہ بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی دوڑ میں مشین بن کر جذبات سے عاری ہوگیا۔ نتیجتاً وہ اپنے رشتوں کو وقت نہ دے سکا جس سے اگر ایک ہاتھ سے یہ رشتے چھوٹ گئے تو دوسرے ہاتھ سے ان رشتوں کے خلوص سے بھی محروم ہوگیا۔ لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

"فرد مشین بن چکا ہے یا ایک بڑی مشین کا ادنیٰ سا پرزہ جو ایک محدود دائرے میں حرکت پر مجبور ہے۔ مشین کوئی زندہ دھڑکتا ہوا وجود نہیں رکھتی۔ نہ وہ خواب دیکھ سکتی ہے اور نہ اس میں جذبۂ محبت اور تخلیقی اپج کی صلاحیت ہے، اپنی پسند و ناپسند کی بنیاد پر آزادانہ عمل و حرکت سے قاصر فرد کسی جماعت اور گروہ میں ضم ہونے پر مجبور ہے۔ وہ داخلیت و انفرادیت سے محروم تقلید اور Conformity کی راہ پر چل رہا ہے۔ نتیجتاً ہر شے سے اس کا رشتہ منقطع ہوگیا ہے۔"[4]

اس اقتباس سے دراصل یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ فرد مشینی عہد میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے نتیجتاً خلوص اور محبت کے بجائے زندگی کی بے معنویت کا وہ تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جہاں فرد زندگی سے بددل نظر آتا ہے۔ 'انسان اپنی بقا اور زندگی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہے اور اسے اخلاق، معیار، شرافت، ممنوعات اور امر بالمعروف نہی عن المنکر سب محض ڈھونگ دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ جھوٹی امیدوں پر زندہ رہنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ زندگی کی حقیقت نہیں۔"[5] چنانچہ جدید غزل اس صورت حال کو یوں پیش کرتی ہے۔

عجیب رونا سسکنا نواحِ جاں میں ہے　　　یہ اور کون میرے ساتھ امتحاں میں ہے
(بانی)

بہت دنوں سے گزرگاہ خواب سونی ہے　　　سرائے شام یہاں اور میں رکوں کب تک
(شہریار)

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو　　　اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے
(شہاب جعفری)

اس وجودی فکر سے گوکہ اس میں ذمہ داری کا احساس واحتساب بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن زندگی ایک بوجھ سے کم محسوس نہیں ہوتی جس سے وہ خوف و دہشت، کشمکش اور تشکیک کا شکار ہوکر اپنی شخصیت سے بھی محروم نظر آتا ہے۔ فرد زندگی کی اس شکست وریخت سے تنگ آکر دنیا سے ہی بددل ہوجاتا ہے۔ اقدار کی شکست خوردگی، جنگ وجدل، تیز رفتار تبدیلیاں، بے حسی، ناکامی، سمجھوتہ بازی وغیرہ نے اس ذہنی انتشار اور خود اذیتی کو جنم دیا ہے جس کا براہِ راست تعلق جنگِ عظیم دوم کی ہولناکی سے ہے جس نے انسانی وجود میں لامتناہی خلا پیدا کیا۔ اس سلسلے میں وحید اختر نے لکھا ہے کہ:

"اس دور نے زخم خوردہ اقدار کے زیر سایہ زخم خوردہ شخصیتیں پیدا کیں جو شدید احساس تنہائی کا شکار ہیں۔ ہر روح کے ہاتھ میں اس کا اپنے زخموں کا اعمال نامہ ہے اور دار و گیر عرصۂ حشر میں نفسی نفسی کا وہ غل ہے کہ کوئی کسی کی جزا کو نہیں پہنچتا، سب ایک ہی غم کے اسیر ہیں سب کے درمیان درد کا ایک ہی رشتہ ہے، پھر بھی سب کس قدر تنہا ہیں! جدید ادب اسی انفرادی اور اجتماعی احساس تنہائی کی داستان ہے۔"[6]

بیسویں صدی میں برق رفتاری سے سائنسی اور عقلی تصورات کے پھیلاؤ نے تنہائی کے تصورات کی بڑی حد تک آبیاری کی۔ نطشے، فرائڈ اور کارل مارکس کے نظریات نے جملۂ 'احساسِ تنہائی' کو داخلی رجحان کا ایک اہم جز قرار دیا۔ اس پر مستزاد سائنس کی برکتوں کی بھرمار نے غیر محفوظیت کے رجحان کو فروغ دیا۔ غیر محفوظیت کا یہی رجحان زندگی کی بے معنویت کو جنم دیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

دیارِ دل نہ رہا بزمِ دوستاں نہ رہی　　　اماں کی کوئی جگہ زیرِ آسماں نہ رہی
میں اکیلا ہی سہی مگر کیسے　　　ننگی پرچھائیوں کے بیچ رہوں
(شہریار)

عادت سی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی　　　جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا
(منیر نیازی)

ڈرتا ہوں میرے سر پہ ستارے نہ آ پڑیں   چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا
(شہزاد احمد)

آج خوف و دہشت کے ماحول میں انسان کی خود غرضی اور طاقت ور اقوام کا کمزور اقوام پر اپنا تسلط قائم کرنے کا دور دورہ بھی عروج پر ہے۔ عالمی طاقتوں کی رسا کشی، غریب ملکوں کی مجبوریاں، فرقہ واریت، مصنوعی تہذیب وغیرہ نے انسان کے اندر بیزاری کی صورت حال پیدا کردی۔ سیاسی مکر و فریب کے ہتھکنڈوں سے عام آدمی کی تذلیل، مہنگائی، بے روزگاری، مفاد پرستی، کشت و خون نے نا امیدی اور محرومی کو جنم دیا۔ بڑے بڑے خاندانوں کا گھر کے ایک کمرے میں سمٹ جانا اور پھر ایک دوسرے سے حسد، بغض، کینہ، لالچ پر آمادہ رہنا بیگانگی کا موجب بنا۔ شہری زندگی کا مصنوعی پن، کش مکش، ریاکاری، منافقت، بھیڑ میں تنہائی، ارتباط کا فقدان وغیرہ نے بے چہرگی کو فروغ دیا۔

جدید دور کا انسان ہر سطح پر ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کا جواز رکھتا ہے۔ اس کے پاس بقول فاروقی اپنی مجروح شخصیت کھونے کے علاوہ زندہ دلی کا احساس اور رائے زنی کے سوا کیا ہے جس کو وہ بروئے کار لاسکے۔

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی   تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں
(احمد ندیم قاسمی)

وہ شہر تو آباد تھا لوگوں سے ہمیشہ   یاں لوگ ہی ایسے تھے کہ آباد نہیں تھے
(شجاع خاور)

اس شہر کی کل تک کوئی پہچان رہی ہے   بے چہرہ ہوئے کوچہ و بازار مگر اب
(مخمور سعیدی)

روزگار کی تلاش میں دور دراز جگہوں کا سفر کرنا اور اپنے اہل خانہ بالخصوص اولاد سے دوری اور محبت کی کمی ان کی سائکی کو متاثر کرتی ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر آسائشوں کے سلسلے میں ترقی کے باوجود بھی وہ مطمئن نہیں ہے بلکہ وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے، غلط اور صحیح کی تمیز سے وہ ماورا ہو چکا ہے، اس تشنگی، اضطراب اور بے چینی کے کرب نے اداسی کو اس کا مقدر کردیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسی جگہ نوکری کرنا جہاں اسے اپنائیت کے بجائے جذباتیت کے برعکس ایسے لوگوں کا ہجوم مل جاتا ہے جو صرف اور صرف اس کے کام سے کام رکھتا ہے، جہاں صرف مصنوعی اور بناوٹی فسوں کاری کا سنگم ہے یعنی جہاں اسے بطور مشین کے جانا جاتا ہے، وہ مشین جو جذبات اور احساسات سے عاری ہے، وہ مشین جو خواب دیکھنے سے معذور ہے، جس میں زندگی کی کوئی رمق موجود نہیں۔ جس کے جسم کی قیمت روح کی قیمت سے زیادہ ہے یعنی جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ غرض ایسی صورت حال میں فرد کا اجنبیت اور علیحدگی پسندی کا شکار ہونا طے ہے۔

رشتوں کے نام وقت کے چہرے بدل گئے   اب کیا بتائیں کس کو کہاں چھوڑ آئے ہم
(ندا فاضلی)

یہ اجنبی منزلیں اور رفتگاں کی یاد   تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو
(منیر نیازی)

اب تو اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتا ہوں میں   کون مجھ سے چھین کر میری نشانی لے گیا
(سلطان اختر)

جدید دور کا انسان ہر سطح پر ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کا جواز رکھتا ہے۔ اس کے پاس بقول فاروقی اپنی مجروح شخصیت کھونے کے علاوہ زندہ دلی کا احساس اور رائے زنی کے سوا کیا ہے جس کو وہ بروئے کار لا سکے۔ چنانچہ جدید غزل اس قسم کی صورت حال کے خلاف مزاحمت کا نعرہ سبک، نرم اور لوچ دار آواز سے بلند کرتی ہے۔

گزرنے والے جہازوں کو کیا خبر ہے کہ ہم   اسی جزیرۂ بے آشنا میں زندہ ہیں
(عرفان صدیقی)

آگ ہے اور سلگ رہی ہے حیات   راکھ ہوں اور بکھر رہا ہوں میں
(انور شعور)

کس بے جہت سفر پہ رواں قافلہ ہوا   منزل نہیں مقام نہیں مرحلہ نہیں
(سلیم احمد)

یہ نہ سمجھو کہ بے زبان ہے وہ   چپ اگر ہے کسی کے ڈر سے کوئی
(شہریار)

حاصل کلام، جدید غزل جدید دور کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کی پروردہ ہے۔ میکانکی سماج اور مشینی معاشرے سے پیدا شدہ مسائل اس کے موضوعات ہیں نیز تقسیم کا المیہ، کشت و خون، ہجرت، فسادات، فرقہ واریت، خود غرضی، خود پسندی، انا پرستی، لالچ، مادیت پسندی، بربریت، استحصال اس کے محرکات ہیں۔ چنانچہ فرد کی تنہائی اور اس سے وابستہ رجحانات و میلانات جیسے اجنبیت و بیگانگی، اداسی، انتشار، اکیلا پن، بیزاری، بے چہرگی، بے قدری، بے معنویت، خوف و دہشت، نا اُمیدی، محرومی وغیرہ اس کی علامات ہیں۔ روحانی و اخلاقی اقدار، مقررہ نظریوں اور فارمولوں سے ناوابستگی کا اظہار، رشتوں کے تقدس کی پامالی، تشکیک پسندی، غیر محفوظیت وغیرہ اس کے نتائج ہیں۔ جدید غزل گو شاعر تنہائی اور اس سے وابستہ اس تمام تر صورت حال کو اشعار میں پرو کر اپنے فکر و فن کا دائرہ حتی الامکان وسیع کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ جدید فرد کے گمشدہ اقدار و اہداف اور وقار کی مکمل بازیافت ہو سکے۔

حوالہ جات

1. تنویر احمد علوی، تنویر علوی کا جہانِ معانی (جلد دوم)' مرتب) ثمر جہاں: ڈاکٹر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی 2017، ص 373
2. لطف الرحمٰن، 'جدیدیت کی جمالیات'، صائمہ پبلی کیشن، 1993، ص 175
3. خلیل الرحمٰن اعظمی، جدید تر غزل، مشمولہ 'جدید غزل'، مرتبہ نشاط شاہد، معیار پبلی کیشنز، دہلی 1978، ص 17
4. لطف الرحمٰن 'جدیدیت کی جمالیات، 1993، ص 169
5. سید محمد عقیل، ڈاکٹر، 'نئی علامت نگاری'، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، دسمبر 1974، ص 114
6. وحید اختر، تعارف، اسم اعظم، حاصل سیر جہاں، (کلیات شہریار) 2001، ص 2

■

Dr. Mohd Younis Dar
Deptt. of Urdu
University of Kashmir-190006 (J&K)
younisdar1990@gmail.com

اردو غزل میں بٹر فلائی افیکٹ

انجینئر محمد عادل

بٹر فلائی افیکٹ (Butterfly Effect) ایک سائنسی نظریہ ہے جو کاؤس تھیوری (Chaos Theory) سے تعلق رکھتا ہے۔ کاؤس تھیوری ایک ریاضیاتی اور سائنسی نظریہ ہے جو پیچیدہ نظاموں (complex systems) کے طرزِ عمل کو سمجھنے سے متعلق ہے۔ اس نظریے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ کچھ نظام انتہائی حساس حالات سے شروع ہوتے ہیں، جہاں ابتدائی حالات میں معمولی سی تبدیلی بھی طویل مدتی نتائج میں بڑی تبدیلیاں لا سکتی ہے۔ بٹر فلائی افیکٹ بھی اسی بنیادی خیال سے وابستہ جس میں ایک چھوٹی سی تبدیلی، جیسے کہ تتلی کے پر پھڑپھڑانے سے ہوا میں پیدا ہونے والی ہلکی سی لہر، وقت کے ساتھ بڑی اور غیر متوقع تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہے اور جس کے توسط سے کہیں دور طوفان کا جنم ہوسکتا ہے۔ اگر چہ یہ تصور بنیادی طور پر طبعیات اور ریاضی سے وابستہ ہے، لیکن اگر اس نظریے کے نقطۂ نظر سے ادب، فلسفہ اور انسانی زندگی کے دیگر شعبوں کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

اردو غزل جو اپنی گہرائی، جذباتی شدت اور استعاراتی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے، اس تصور کو اپنے اندر سمونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ لہٰذا راقم الحروف نے اس مضمون میں یہ جائزہ لینے کی سعی کی ہے کہ کس طرح بٹر فلائی افیکٹ کو اردو غزل کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے، اور اس کے عناصر غزل کی روایت کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

بٹر فلائی افیکٹ کی اصطلاح سب سے پہلے امریکی ماہر ریاضی وموسمیات ایڈورڈ لورینز (Edward Lorenz) نے 1960 کی دہائی میں متعارف کروائی۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر ایک تتلی برازیل میں، اپنے پنکھ پھڑپھڑائے تو اس سے ٹیکساس میں ایک بھیانک طوفان آ سکتا ہے۔ ایڈورڈ کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر جاندار چیز سے کوئی بھی کام اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے 'بٹر فلائی افیکٹ' ہوتا ہے جس سے شروع ہونے والا عمل ایک کڑی سے جڑ کر، دوسری کڑی اور اسی طرح جڑتے جڑتے کہیں دور اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

ایڈورڈ نے دریافت کیا کہ موسمیاتی نظام میں چھوٹی سی تبدیلی، جو بظاہر نظر انداز کی جاسکتی ہو، مستقبل میں بڑے پیمانے پر نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس نظریے نے سائنس کے علاوہ ثقافتی اور ادبی دائروں میں بھی اپنی جگہ بنائی، کیونکہ یہ انسانی زندگی کے غیر متوقع پن اور باہمی تعلقات کی پیچیدگی کو اجاگر کرتا ہے۔

اردو غزل جو عمومی طور پر محبت، جدائی، درد اور عارضی زندگی کے موضوعات کو اپنا محور بناتی ہے، اس تصور کے لیے ایک زرخیز زمین فراہم کرتی ہے۔ بٹر فلائی افیکٹ کے حوالے سے اردو غزل کا جائزہ شاعری کی کائنات کو ایک نئے مفہوم اور نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لیے نئی جہت کا در وا کرتا ہے۔ جہاں ایک لمحے کا عمل یا ایک چھوٹی سی بات پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔

اردو غزل کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ اشعار کے علامتی، استعاراتی اور فلسفیانہ پیرائے میں ہمارے شعرا نے ایسے ایسے خیالات قلم بند کر دیے ہیں جو بٹر فلائی افیکٹ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یعنی اشعار میں آیا ایک چھوٹا سا عمل، جذبہ، یا واقعہ قاری اور معاشرے پر بڑے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، محبت کی ابتدا ایک نظر کے تبادلے سے ہوتی ہے، جو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس کے اثرات عاشق کی پوری زندگی کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ غالب کا ایک شعر ملاحظہ کریں جو اس فکر کی منفرد عکاسی کرتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

یہاں اس شعر میں غالب ایک خواہش کا ذکر کر رہے ہیں جو بظاہر ایک چھوٹے سے جذباتی لمحے کے سبب وجود میں آتی ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے اتنی شدت اختیار کر لیتی ہے کہ پوری زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بٹر فلائی افیکٹ کی ایک شاعرانہ تفسیر ہے، جہاں ایک چھوٹا سا جذبہ بڑے نتائج کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ اسی طرح غالب اپنے ایک اور شعر میں کہتے ہیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اس شعر میں غالب ایک چھوٹے سے لمحے کے لیے وصال نہ ہونے کو زندگی کے پورے سفر پر اثر انداز ہونے والے واقعے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اپنے محبوب سے عاشق کی ایک مختصر سی ملاقات یا وصال نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پوری زندگی انتظار اور بے چینی کی کیفیت میں گزری۔ شعر میں یہ ایک چھوٹا سا واقعہ بڑے جذباتی اثرات کا باعث بنتا ہے۔

بٹر فلائی افیکٹ سے تعلق رکھنے والی تتلی اردو شاعری میں خود ایک خوبصورت علامت ہے۔ تتلی کے رنگ

برنگے پر، اس کے پھڑ پھڑانے کی نزاکت، اس کی چال ڈھال کو شعرا نے بڑے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

اپنے پر کھولتی ہے اک تتلی
کوئی طوفان آنے والا ہے (عادل فراز)

یہاں اس شعر میں شاعر نے بٹر فلائی افیکٹ کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ بٹر فلائی افیکٹ جس کی ابتدا تتلی کے پر کھولنے کر پھڑ پھڑانے سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کے پروں سے پیدا ہونے والے ارتعاش کی توانائی دھیرے دھیرے طوفان کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے۔ بظاہر وہ چھوٹا سا واقعہ ہے جو تتلی کے پر پھڑ پھڑانے کی طرح معمولی لگتا ہے، لیکن اس کا اثر بڑا بھیانک اور دیر پا ہوتا ہے۔ اسی طرح کیف بھوپالی بھی اپنے ایک شعر میں تتلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گل سے لپٹی ہوئی تتلی کو گرا کر دیکھو
آندھیو تم نے درختوں کو گرایا ہوگا (کیف بھوپالی)

یہ شعر بٹر فلائی افیکٹ کا براہِ راست استعارہ ہے۔ تتلی، جو نازک اور معمولی سی مخلوق ہے، اس کو شاعر گل سے گرانے کی بات کر رہا ہے۔ گویا کیف بھوپالی تتلی کو گرا کر بٹر فلائی افیکٹ کے عمل کو شروع کرنا چاہتے ہیں۔ تا کہ اس کی جنبش ایک بڑے طوفان یا آندھی کا پیش خیمہ بنے۔ شعر کا دوسرا مصرع ”آندھیو تم نے درختوں کو گرایا ہوگا“ اسی بات کا عکاس ہے۔ شاعر اپنے اس شعر کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایک چھوٹا سا عمل یعنی تتلی کے پھول سے گرنے پر بڑے پیمانے پر تباہی، آندھیوں کا چلنا اور درختوں کے گرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بٹر فلائی افیکٹ کی بنیادی روح کی عکاسی کرتا ہے کہ معمولی واقعات غیر متوقع بڑے نتائج کو جنم دے سکتے ہیں۔

اردو غزل میں نہ صرف تتلی کی پروں سے پیدا ہونے والے اثرات کی ترجمانی ہے بلکہ پرندوں کے پرواز اور پر کھولنے کی منظر کشی بھی بڑے منفرد انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ عمل بٹر فلائی افیکٹ کا بھی ترجمان ہو جاتا ہے۔

کوئی پرندہ سا پر کھولتا ہے اڑنے کو
پھر اک چھناکے سے یہ خاک دان ٹوٹتا ہے (حسن عباس رضا)

یہ شعر بٹر فلائی افیکٹ کا سب سے واضح استعارہ ہے۔ پرندے کا پر کھولنا ایک معمولی حرکت ہے، لیکن اس سے 'خاک دان' یعنی وجود یا کائنات کے ٹوٹنے جیسا بڑا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہاں چھناکا وہ لمحہ ہے جو ایک چھوٹے سے عمل کو بڑے اثرات سے جوڑتا ہے۔

بٹر فلائی افیکٹ کی اصطلاح سب سے پہلے امریکی ماہر ریاضی و موسمیات ایڈورڈ لورینز (Edward Lorenz) نے 1960 کی دہائی میں متعارف کروائی۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر ایک تتلی برازیل میں، اپنے پنکھ پھڑپھڑائے تو اس سے ٹیکساس میں ایک بھیانک طوفان آ سکتا ہے۔

اسی طرح غزل میں شمع، پروانہ، گلاب اور خار جیسے روایتی استعاروں کو بھی اس تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے پر ایک حیرت انگریز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ شمع سے متعلق ایک مثال دیکھیں جس میں شمع کی ایک چھوٹی سی لو پروانے کی زندگی کو ختم کر دیتی ہے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا (نامعلوم)

شاعر اس شعر میں مگس کو باغ میں جانے سے روکنے کی بات کر رہا ہے۔ کیوں کہ مگس (شہد کی مکھی) باغ میں جا کر پھولوں کا رس چوس کر شہد اور موم تیار کرتی ہے۔ موم سے شمع بنائی جاتی ہے۔ رات کو جب شمع روشن ہوتی ہے تو اس کے اردگرد پروانے گردش کرتے ہیں، اور اس کی لو سے جل کر ناحق مارے جاتے ہیں۔ یہ ایک سادہ سا عمل ہے جس کے ساتھ کئی دوسرے عمل منسلک ہو جاتے ہیں اور آخر میں یہ بڑے نتائج کا باعث بنتا ہے۔ اسی نہج کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں۔

اک صدا اٹھی تو اک عالم ہوا پیدا منیر
اک کلی مہکی تو پورا گلستاں ہوتی گئی

غور کریں تو منیر نیازی اپنے اس شعر میں بٹر فلائی افیکٹ کی خوب صورت عکاسی کرتے ہوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب کہیں کوئی آواز بلند ہوتی ہے۔ تو یہ ہوا میں پیدا ہونے والے ارتعاش کے سبب چاروں جانب پھیلنے لگتی ہے اور یہ دھیرے دھیرے وسیع دائرہ بنا لیتی ہے جو ایک عالم کو تخلیق کرتا ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ پہاڑی علاقوں اور خالی کمروں میں ایک معمولی سی صدا زوردار اور گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ٹھیک آواز کی طرح پھول سے اٹھنے والی مہک بھی ہوا کے ساتھ ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔

غزل جس کا گہرا تعلق انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ہمیشہ سے رہا ہے۔ لیکن جب ان احساسات و جذبات کا مطالعہ بٹر فلائی افیکٹ کے تناظر میں کرتے ہیں تو اس کا حسن مزید ابھر کر سامنے آتا ہے۔ فیض احمد فیض کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
(فیض احمد فیض)

فیض اپنے اس شعر میں ایک ایسی بات کا ذکر کر رہے ہیں جو بظاہر معمولی تھی، جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے تھا لیکن اس بات نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ اس کے بڑے جذباتی اثرات مرتب ہوئے اور اس چھوٹی سی بات نے پوری کہانی کے معنی بدل کر رکھ دئے۔

اسی طرح عبدالعزیز فطرت اپنے ایک شعر میں 'لمحہ' کے توسط سے بٹر فلائی افیکٹ کی منفرد ترجمانی کرتے ہیں۔

ہر ایک لمحہ سے پائے ہیں تازہ غم ہم نے
ہر ایک لمحہ نئی عمر کا بہانہ ہوا عبدالعزیز فطرت

یہ شعر لمحات کی اہمیت اور ان کے دوررس اثرات کو اجاگر کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر لمحہ ایک نیا غم یا تجربہ لاتا ہے، جو زندگی کی نئی جہتوں کو جنم دیتا ہے۔ بٹر فلائی افیکٹ کے تناظر میں، یہ لمحات چھوٹے واقعات کی مانند ہیں جو زندگی میں بڑے بدلاؤ یا جذباتی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں، اور ایک لمحے کا فیصلہ یا تجربہ پوری زندگی کے دھارے کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس طرح لمحے کی اہمیت و افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا لمحہ ہی ہوتا ہے جب تتلی اپنے پر کھول کر پھڑ پھڑاتی ہے اور اس سے پیدا ہونے والا ارتعاش دھیرے دھیرے بڑھ کر ایک بڑے طوفان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کی زندگی میں بھی ایک لمحے کی بڑی اہمیت ہے۔ کیوں کہ یہ اس کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

ضائع مت کیجو ایک لمحہ بھی
ایک لمحے میں جانے کیا ہو جائے (احمد سوز)

یہ شعر براہِ راست لمحات کی اہمیت اور ان کے غیر متوقع نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس میں شاعر

کہہ رہا ہے کہ ایک لمحے کو بھی زندگی میں فضول میں ضائع نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس میں بڑی تبدیلی کا امکان پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بٹر فلائی افیکٹ کے تناظر میں جائزہ لینے پر یہ شعر اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ ایک چھوٹا سا لمحہ، فیصلہ، یا عمل غیر متوقع اور بڑے پیمانے پر نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔ عاصم واسطی لمحے کے حوالے سے کہتے ہیں۔

کوئی لمحہ مجھے تبدیل کئے جاتا ہے
کیا تغیر مری تکمیل میں آیا ہوا ہے (عاصم واسطی)

اسی طرح امیر قزلباش بھی ایک شعر میں اپنے جنون کے نتیجے میں سیاہ سمندر سے نور نکالنے کی بات کر رہے ہیں۔

مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا
اسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا (امیر قزلباش)

غور کریں تو یہ شعر امید اور انسانی جذبے کے اثرات کا عکاس نظر آتا ہے۔ شاعر کا جنون جو ایک چھوٹا سے جذباتی یا ذاتی عمل کے سبب وجود میں آتا ہے لیکن ایک بڑے نتیجے یعنی سماج میں موجود برائیوں کے سیاہ سمندر سے نور نکالنے کا باعث بنتا ہے اور ایک نیا انقلاب پیدا کرتا ہے۔ بٹر فلائی افیکٹ کے تناظر میں بھی یہ شعر اس بات کا ترجمان ہوجاتا ہے کہ ایک فرد کا چھوٹا سا عزم یا جذبہ، جو بظاہر تاریک حالات میں معمولی لگتا ہے، مگر بڑی تبدیلی یا روشنی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

بٹر فلائی افیکٹ کے توسط سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے ہوا کی رفتار بھی متاثر ہوتی ہے۔ اور یہ ہوائیں صرف طوفان لانے کا سبب نہیں بنتی بلکہ اگر یہ جنگلات کی طرف رخ کرلیں تو اس کی وجہ سے سوکھے پتوں میں پیدا ہونے والی رگڑ کے سبب جنگلات میں تیز آگ بھی لگ سکتی ہے۔ عزیز حامد مدنی کا شعر دیکھیں۔

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ بنوں میں لو اٹھی
روح تغیر جہاں آگ سے فال لے گئی (عزیز حامد مدنی)

یہاں اس شعر میں تیز ہوا کی چاپ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن اس سے جنگل میں آگ بھڑک اٹھتی ہے، جو بڑے پیمانے پر تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ یہاں 'روح تغیر' کو بٹر فلائی افیکٹ کے استعارہ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے، جہاں ایک معمولی حرکت یعنی ہوا کی چاپ عالم گیر تبدیلی یا تخریب کا آغاز کرتی ہے۔ 'آگ سے فال لینا' اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ تبدیلی غیر متوقع اور بے قابو ہوسکتی ہے۔

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہماری اردو شاعری کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں کائنات کے ہر موضوع کو ڈھال کر پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ہوا کے حوالے سے محسن نقوی کا ایک شعر ملاحظہ کریں جس میں وہ بٹر فلائی افیکٹ کی شاندار منظر کشی کر رہے ہیں۔

کیا جانئے کیوں تیز ہوا سوچ میں گم ہے
خوابیدہ پرندوں کو درختوں سے اڑا کر (محسن نقوی)

یہ شعر بٹر فلائی افیکٹ کے غیر متوقع اور پراسرار پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ تیز ہوا، جو ایک معمولی قدرتی عمل ہے جب چلتی ہے تو پرندوں کو اڑا دیتی ہے، یعنی سکون کو منتشر کر دیتی ہے۔ شعر میں 'ہوا کا سوچ میں گم ہونا' اس بات کی علامت ہے کہ چھوٹے واقعات کے پیچھے کہیں نہ کہیں کوئی گہری وجہ یا نتیجہ ہوسکتا ہے، جو بظاہر نظر نہیں آتا، لیکن اس کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ ایک اور شعر دیکھیں جس میں ادا جعفری 'تیز ہوا کے جھونکے' کا ذکر کر رہی ہیں۔

اس قدر تیز ہوا کے جھونکے
شاخ پر پھول کھلا تھا شاید (ادا جعفری)

یہاں اس شعر میں ہوا کا جھونکا ایک چھوٹا سا عمل ہے، جو نازک پھول کو متاثر کرتا ہے۔ پھول کا کھلنا یا مرجھانا ایک لطیف تبدیلی ہے، جو زندگی کے حسن کی علامت ہے۔ بٹر فلائی افیکٹ کے تناظر میں، یہ جھونکا ایک ایسی تبدیلی کا آغاز کرسکتا ہے جو بڑے پیمانے پر جذباتی یا وجودی اثرات مرتب کرے، جیسے امید کا خاتمہ یا نئی شروعات۔

منور رانا اپنے ایک شعر میں انسانی جذباتی کیفیت کی بڑی حسین منظر کشی کرتے ہیں۔ اس شعر کو بٹر فلائی افیکٹ کے تناظر میں دیکھنے سے اس کا حسن مزید دوبالا ہوجاتا ہے۔

ہزاروں بستیاں آ جائیں گی طوفان کی زد میں
مری آنکھوں میں اب آنسو نہیں سیلاب رہتا ہے
(منور رانا)

یہاں اس شعر میں آنسو سے سیلاب تک کا سفر بٹر فلائی افیکٹ کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک آنسو، جو ایک چھوٹے جذباتی عمل یا واقعہ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے لیکن ایک سیلاب میں بدل جاتا ہے، اور اس کی شدت اتنی بڑھ سکتی ہے کہ یہ بستیوں کو تباہ کرسکتا ہے۔ یعنی کسی جذباتی عمل کے بعد پیدا ہونے والے نامناسب حالات انسانی زندگیوں کو تباہ و برباد کرسکتے ہیں۔ دراصل یہ شعر اندرونی جذبات کے بڑے سماجی یا عالم گیر اثرات کو بیان کرتا ہے۔

اسی طرح افتخار عارف استفہامیہ انداز میں انسانی جذبات کے توسط سے بٹر فلائی افیکٹ کی ترجمانی بڑے دلکش انداز میں کرتے ہیں۔

چھوٹی موٹی ایک لہر ہی تھی میرے اندر
ایک لہر سے کیا طوفان اٹھا سکتا تھا میں (افتخار عارف)

ایک چھوٹی سی 'لہر' اندرونی جذبہ یا حرکت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ جو بظاہر معمولی ہے، لیکن یہ ایک جذباتی طور پر وجود کے اندر ایک طوفان پیدا کرسکتی ہے۔ شاعر نے اس شعر میں استفہامیہ انداز کے ساتھ حیرت و تجسس کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس کے اندر کی ایک معمولی لہر نے کس طرح بڑی تبدیلی یا انقلاب برپا کر دیا۔ گویا افتخار عارف اپنے اس شعر کے ذریعے بٹر فلائی افیکٹ کے عمل کو سمجھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

الغرض مذکورہ تمام اشعار بٹر فلائی افیکٹ کے تصور کو مختلف زاویوں سے بیان کرتے ہیں۔ چاہے وہ ایک لمحہ ہو، ہوا کا جھونکا، ایک آنسو، یا پرندے کا پر پھڑپھڑانا، ہر شعر میں ایک چھوٹا سا عمل بڑی تبدیلی، طوفان، یا انقلاب کا سبب بنتا ہے۔ یہ اشعار نہ صرف جذباتی اور وجودی سطح پر بلکہ سماجی اور کائناتی تناظر میں بھی اس نظریے کی گہرائی کو اجاگر کرتے ہیں۔ اگر ہم اردو غزل کے علاوہ اردو شاعری کی دیگر اصناف مثلاً 'قصیدہ، مرثیہ، مثنوی' میں بٹر فلائی افیکٹ کے عناصر کی تلاش کریں تو وہاں بھی ہمیں اس نظریے متعلق مختلف اشعار دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ اس طرح یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہماری اردو شاعری کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں کائنات کے ہر موضوع کو ڈھال کر پیش کیا جاسکتا ہے۔

■

ER. Mohd Adil
Hilal House, H No.: 4/114, Jagjeevan Colony
Naglah Mallah
Civil Line
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 8273672110
mohdadil75@yahoo.com

اویس احمد

شمس الحق عثمانی

حیات اور تنقیدی افکار

شمس الحق عثمانی 15 فروری 1948 کو محلّہ ابوالمعالی، دیوبند ضلع سہارن پور، اتر پردیش کے ایک علمی اور دیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام شمس الحق ہے اور 'عثمانی' کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُن کی چھٹی کلاس میں شمس الحق نام کا ایک طالب علم تھا؛ چونکہ حاضری کے وقت اساتذہ شمس الحق اوّل اور دوم پکارتے تھے، لیکن نویں جماعت میں فارسی کے ایک استاد احمد جمیل فاروقی نے شمس الحق اول (شمس الحق عثمانی) سے دریافت کیا کہ کس خاندان سے ہو؟ شمس الحق نے جواباً ''شیخ'' کہا۔ فاروقی صاحب نے پھر معلوم کیا کہ کون سے شیخ؟ واضح رہے کہ شمس الحق عثمانی کے ننھیال میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور علامہ عامر عثمانی وغیرہ مشہور و معروف بزرگ گزرے ہیں۔ فاروقی صاحب کے دریافت کرنے پر کہ کون سے شیخ ہو؟ شمس الحق کے منہ سے بے ساختہ ''عثمانی'' نکلا۔ تب سے شمس الحق کے ساتھ عثمانی کی نسبت وابستہ ہوگئی۔ ددھیال کی طرف سے شمس الحق کو ایک گھریلو نام ''چھمن'' ملا تھا۔ شمس الحق عثمانی اپنی پیدائش کے دو سال بعد یعنی 1950 میں اپنی والدہ کے ساتھ دہلی آئے۔ والد صاحب پہلے سے ہی دہلی میں گھڑی سازی کا کام کرتے تھے اور کچھ کمائی کے بعد ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ شمس الحق عثمانی کے والد کا نام حافظ امداد الحق تھا۔ وہ ایک ایسے دور میں دہلی آئے جب بے شمار مکانات، حویلیاں اور محلے ویران ہوگئے تھے اور دہلی سے بے شمار مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ امداد الحق بھی دیوبند سے دہلی بہ سلسلہ روزگار ہی آئے تھے اور یہاں آکر حاجی نجم الدین مرحوم سے فن گھڑی سازی سیکھنے لگے۔ حالانکہ سکونت کا کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا، اس لیے حاجی نجم الدین کے گھر قیام کرتے تھے۔ شمس الحق عثمانی کے والد حافظ قرآن تھے؛ نہایت دیانت دار، ہم درد اور پرہیزگار آدمی تھے۔ نماز کی پابندی، تلاوت قرآن اور احکام الٰہی و فرمان نبی کو اپنی زندگی کا معمول بنایا تھا۔ شمس الحق عثمانی کی والدہ کا نام حسنیٰ تھا جو صوفی سعید حسن کی صاحبزادی تھیں۔ سعید حسن حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے بھتیجے اور مولانا ذوالفقار علی کے پوتے تھے، جو بانیان دارالعلوم دیوبند میں سے تھے۔ شمس الحق عثمانی کی والدہ ایک نیک سیرت اور صوم وصلوۃ کی پابند تھیں۔ شمس الحق عثمانی کا بچپن دہلی اور دیوبند دونوں جگہوں میں گزرا۔ دراصل وہ ددھیال کے بہت لاڈلے تھے اور وہاں جانا پسند کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ کچھ عرصہ دیوبند میں رہتے تھے اور کچھ وقت دہلی میں۔ شمس الحق عثمانی بچپن سے ہی ذہین اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔ شمس الحق عثمانی کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ اس دوران اُنھوں نے اپنے خالو انعام الحق، جو اپنے زمانے کے گریجویٹ تھے اور ہمدرد دواخانے میں ملازم تھے، سے ابتدائی اردو اور انگریزی پڑھی۔ اُس زمانے میں ایک اردو اخبار 'تیج' نکلتا تھا، جس کے خریدار انعام الحق بھی تھے۔ شمس الحق نے اسی اخبار سے اردو سیکھی۔ اس کے علاوہ محلے میں ایک ٹیچر ماسٹر خلیل الرحمٰن تھے، جن سے انگریزی، حساب اور ہندی وغیرہ پڑھی۔ گزشتہ سطور میں اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ شمس الحق کے والد امداد الحق حافظ قرآن تھے۔ اس مناسبت سے خاندانی روایت کے احترام میں شمس الحق کو بھی حفظ کرایا گیا، لیکن بیٹے کا رجحان انگریزی زبان کی طرف دیکھتے ہوئے چھٹی جماعت میں 'اینگلو عربک اسکول' دہلی میں داخلہ کرایا گیا۔ جہاں سے شمس الحق نے 1966 میں ہائر سیکنڈری امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ یہیں سے اُنھیں اردو سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس دوران اُنھیں قاسم صدیقی جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ہائر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل اور جامعہ اردو کے سابق وائس چانسلر سے شرف تلمذ رہا۔ جن کی سرپرستی اور رہنمائی میں شمس الحق نے تحریر و تقریر میں بڑا نام پیدا کیا اور کئی انعامات سے بھی نوازے گئے۔ ہائر سیکنڈری کے بعد اُنھوں نے دیال سنگھ کالج میں بی کام میں داخلہ لیا، لیکن کامرس سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے سبب اُن کا ایک سال ضائع ہوگیا۔ شمس الحق کی شادی 11 اکتوبر 1970 کو اُن کے خالو انعام الحق کی بیٹی روشن بیگم سے ہوئی۔ 1976 میں بی اے آنرس اردو کے لیے ذاکر حسین کالج (شبینہ) دہلی یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ چونکہ والد صاحب معاشی ناآسودگی کا شکار تھے؛ اس لیے اپنے والد کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ سینئر ہائر سیکنڈری سے بی اے آنرس تک اُنھیں دس سال کا عرصہ لگا۔ بی اے آنرس کے بعد ہی 1978 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے ایم۔اے فرسٹ ڈویژن، اے گریڈ کے ساتھ پاس کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہی اُنھیں 1984 میں 'راجندر سنگھ بیدی: شخصیت اور فن' پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ مقالہ اُنھوں نے گوپی چند نارنگ کی نگرانی میں لکھا۔ قرۃ العین حیدر، مسعود حسین خان اور آل احمد سرور اُن کے ممتحن تھے۔

شمس الحق عثمانی کا پہلا افسانہ طالب علمی کے زمانے میں ہی بہ عنوان 'دن کہیں رات کہیں' ہفت وار 'پیام

مشرق، دہلی کے اکتوبر شمارے میں 1965 میں شائع ہوا۔ جب کہ اُن کا پہلا ادبی مضمون بہ عنوان 'حسرت موہانی: رنگارنگ شخصیت' اینگلو عربک کے سالانہ میگزین 'اعتمادیہ' میں 1966 میں شائع ہوا۔ بہ حیثیت نقادان کا پہلا مضمون بہ عنوان 'ساتویں دہائی کا افسانہ' اکتوبر 1972 کے 'شب خون' الہ آباد میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ملک اور بیرون ملک کے تقریباً تمام معیاری ادبی رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں تقریباً 40 افسانے لکھے، جو کہ مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ لیکن تاحال کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ اُس کے بعد افسانہ نگاری سے کنارہ کشی اختیار کر کے ادبی تنقید کی طرف مائل ہوئے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے ایم۔اے کے فوراً بعد یعنی 1979 میں 'نظیر نامہ' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب ترتیب دی، جو کہ نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور فن پر معروف نقادوں کے اٹھارہ منتخب مضامین اور ستائیس نمائندہ منظومات پر مشتمل ہے۔

پی ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے بعد شمس الحق دو سال تک ملازمت کے سلسلے میں کوشاں رہے اور بالآخر 8 ستمبر 1986 کو ان کا تقرر بہ حیثیت پی جی ٹی اردو، جامعہ سینئر سکینڈری اسکول میں ہوا۔ یہ ان کی تدریسی زندگی کا پہلا پڑاؤ تھا۔ یہاں وہ 20 ستمبر 1988 تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اُس کے بعد لیٹین منوڈگری کالج، نوح، ہریانہ میں 2 جنوری 1989 کو ان کا تقرر بہ حیثیت اردو لیکچرر ہوا۔ 22 اکتوبر 1989 کو مستقل لیکچرر شپ سے مستعفی ہوئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 23 اکتوبر 1989 کو کنٹریکچول لیکچرر کی ملازمت اختیار کی۔ بہ حیثیت سینئر لیکچرر اُن کا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 2 جنوری 1994 کو ہوا۔ 2 جنوری 1998 میں ریڈر ہوئے۔ جب کہ 25 جون 2004 سے 28 فروری 2013 تک بہ حیثیت پروفیسر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران وہ 17 مئی 2007 سے 16 مئی 2010 تک صدر شعبہ اردو بھی رہے۔ شمس الحق 28 فروری 2013 کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ شمس الحق عثمانی کو اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اردو اکادمیوں نے انعامات و اعزازات سے نوازا ہے، جن کی فہرست حسب ذیل ہے:

1. کتاب 'بیدی نامہ' (1986) پر اردو اکادمی، دہلی کا انعام، زمرۂ اول، مبلغ تین ہزار روپے۔
2. کتاب 'بیدی نامہ' (1986) پر اُتر پردیش اردو اکادمی لکھنو کا انعام مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام۔
3. 'محبّ وطن' پریم چند اور دیگر مضامین (1989) پر اُتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو کا مبلغ ایک ہزار روپے۔
4. 'دراصل' (1999) پر اُتر پردیش اردو اکادمی لکھنو کا مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے۔
5. 'دراصل' (1999) پر اردو اکادمی، دہلی سے بھی زمرۂ اول، مبلغ پانچ ہزار روپے کا انعام۔
6. مجموعی تنقیدی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے 'ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید' 2007 مبلغ پچیس ہزار روپے کا انعام۔
7. غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے 2014 میں 'غالب ایوارڈ' برائے مجموعی ادبی خدمات مبلغ پچھتر ہزار روپے کا انعام۔

شمس الحق عثمانی کسی مخصوص تنقیدی نظریے کے نقاد نہیں ہیں اور نہ ہی کسی تھیوری یا تحریک سے واضح طور پر متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نظریہ ساز نقاد بننے سے زیادہ اُس قاری کے معاون و مددگار بننا ضروری سمجھتے ہیں جو ادب پڑھنا جانتا ہو اور ادب فہمی کا جذبہ رکھتا ہو۔ وہ اپنی آنکھوں پر بغیر کسی مخصوص نظریے کی عینک کے ادب پارے کو سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب پارے کو ادیب کی اُفتادِ طبع کا زائیدہ تسلیم کرتے ہوئے اُسے ہر طرح کے نظریاتی جبر سے آزاد قرار دیتے ہیں۔ راقم کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران جب اس حوالے سے استفسار کیا گیا کہ کیا تخلیقی و تنقیدی عمل کسی مخصوص نظریے کا محتاج ہوتا ہے؟ تو اُنھوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''ادب بذاتِ خود ایک وجود رکھتا ہے ادب پارہ جب تخلیق ہو رہا ہوتا ہے تو وہ کسی نظریہ کو قبول نہیں کرتا ہے۔ وہ ادیب کی اپنی اُفتادِ طبع سے پیدا ہوتا ہے۔''

(شخصی انٹرویو، شمس الحق عثمانی، 2 جنوری 2015)

مذکورہ بالا رائے سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شمس الحق فن پارے کی تخلیقیت یا معنی خیزی کے عمل میں کسی مخصوص نظریے کو فن پارے کی 'محدودیت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اس ضمن میں مزید اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بعض تخلیق کاروں کے یہاں اس طرح کے تخلیقی رویے پر گرفت کی۔ اُن کا ماننا ہے کہ بعض تخلیق کار ادب کی تخلیقیت میں یک رخا رویہ اس لیے اختیار کرتے ہیں، کیوں کہ تخلیقی عمل کے دوران وہ اپنے پانچوں حواس کو بروئے کار لانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ نتیجے کے طور ادب کو ایک وحدت کے طور پر خلق کرنے کے بجائے کسی مخصوص نظریہ یا رجحان سے متاثر ہوکر ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ادب کی لامحدودیت سے محدودیت کی سمت الٹا تخلیقی سفر کرتے ہیں۔ شمس الحق کا ماننا ہے کہ بعض تخلیق کار، جو اپنی آنکھوں پر مخصوص نظریات اور رجحانات کی عینک چڑھاتے ہیں، تخلیقی عمل کی محدودیت کے ذمہ دار ہیں۔ اُنھوں نے ادب کے اسی موقف کا اطلاقی نمونہ پیش کرتے ہوئے ادب کو قدیم و جدید، اعلیٰ و ادنیٰ جیسے خانوں میں بانٹے بغیر ادب کی تفہیم و تعبیر کی۔ چنانچہ ادب کے دو بنیادی نظریے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کے حوالے سے راقم الحروف کے استفسار پر شمس الحق نے ان نظریات کو 'گروہ بندی کرنے والوں' کی کارستانی سے تعبیر کیا۔ کیوں کہ اُن کے نزدیک ادب پارہ بالکل آزاد ہوتا ہے، جسے مخصوص خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ اس ضمن میں ان کا نظریہ کچھ یوں ہے:

''ادب میں یہ تخصیص واضح نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف پیشہ ور نقادوں کی کارفرمائی ہے... گروہ بندی کرنے والوں نے یہ تقسیم کی ہے ورنہ ادب پارے اپنے طور پر آزاد ہیں۔''

(شخصی انٹرویو، شمس الحق عثمانی، 2 جنوری 2015)

شمس الحق بارہا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''میں، ادب میں قدیم وجدید ادب کے فرق سے معذور ہوں'' (مضمون: منٹو: خلق اللہ کا نہیم)۔ یعنی اُن کے یہاں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدید ادب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں کسی خاص دور یا مخصوص نظریے یا رجحان کے ادب کی تقسیم نہیں ملتی ہے۔ اُنھوں نے کرشن چندر، بلونت سنگھ اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ ساتھ منٹو کا مطالعہ بھی کیا۔ جدید ادیبوں میں بلراج کومل، اختر الایمان، میرا جی، ن۔م۔راشد اور باقر مہدی کا مطالعہ کیا۔ جب کہ ترقی پسندوں میں احمد ندیم قاسمی اور غلام عباس وغیرہ کا مطالعہ بھی کیا۔ اُن کا ماننا ہے کہ اردو ادب میں تخلیق کاروں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے، جنھوں نے زندگی

اور معاملات زندگی کے تئیں یک رُخا رویہ اختیار کر کے ادب کے بعض پہلوؤں سے یکسر منہ موڑ لیا ہے۔ حالانکہ تخلیق کاروں کا ایسا گروہ بھی ہے جو ایک طرف ادب کو 'حصولِ مسرت' اور 'تطہیرِ نفس' کا ذریعہ سمجھتا ہے، لیکن دوسری طرف زندگی اور معاشرتی مسائل کی طرف انگشت نمائی بھی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر شمس الحق کے نزدیک اردو ادب پر بورژوائی طبقے کی بالادستی رہی ہے، جس نے اردو ادب کو معاشرتی مسائل سے چشم پوشی سکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ شمس الحق تفہیم و تعبیر کے دوران فن پارے پر کسی مخصوص رجحان یا تحریک کا لیبل نہیں لگاتے ہیں اور نہ ہی مروجہ تنقیدی نظریات کی روشنی میں فن پارے پر احکامات صادر کرتے ہیں؛ بلکہ فن پارے کو بالکل ایک آزاد شئے تصور کر کے باریک بینی اور دیدہ ریزی سے فن پارے کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ معنی کو کشید کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس معنی خیزی کے عمل میں وہ 'سنجیدہ قاری کو شریک کرنا' اپنا تنقیدی فریضہ سمجھتے ہیں:

''... نقاد کا منصب شاید یہ ہے کہ وہ فن پارے کی مخصوص بصیرت و معنویت تک رسائی پانے کی کوشش کرے ـــــــ اور شاید تنقید کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ قاری کو فن پارے کی مخفی بصیرت سے فیض یاب ہونے کی راہ دکھائے۔''

(شمس الحق عثمانی، بیدی نامہ، بیدی کا فنی رویہ، 1986، ص 118)

یہاں پر شمس الحق عثمانی کا تنقیدی نظریہ کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ اول تو یہ کہ وہ کسی مخصوص تنقیدی نظریے کی تقلید کرتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔ دوم یہ کہ اُنھوں نے اپنا تنقیدی نظریہ کئی نقادوں، دانشوروں اور ادیبوں کے نظریات سے تشکیل دیا ہے، جن کی شناخت ادب میں مختلف ادبی و تنقیدی رجحانات سے ہے۔ شمس الحق تنقید کو تخلیق کا درجہ دیتے ہیں؛ کیونکہ تنقید فن پارے کی بازیافت کرتی ہے۔ تنقید فن پارے کو ایک خام مواد کے طور پر استعمال کر کے تخلیقی درجے کو پہنچتی ہے۔ اس تناظر سے شمس الحق کا یہ اقتباس دلچسپ معلوم ہوتا ہے:

''میرا نظریہ تنقید ـــــــ جسے میں نے محمد حسن عسکری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، ایلن ٹیٹ، کلینتھ بروکس اور ایسے ہی دوسرے بزرگوں اور دانشوروں کے نظریات سے تشکیل دیا ہے ـــــــ مجھے یہ باور کراتا ہے کہ ہر تنقید نگار کسی بھی ادب پارے کو خام مواد کے طور پر استعمال کرتا ہے اور

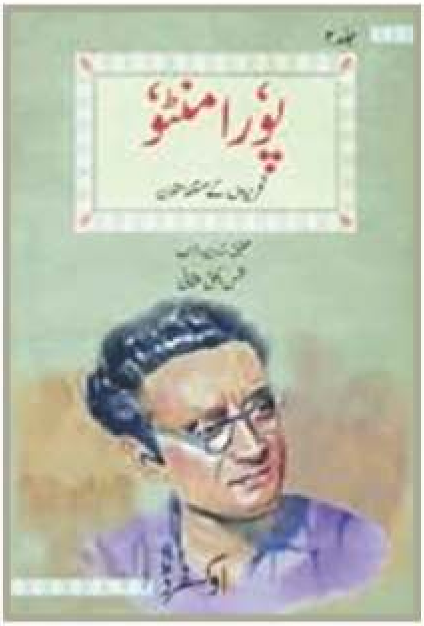

اس خام مواد کی بنیاد پر نہ صرف اپنی تنقید کو تخلیق کا اعتبار اور اعتماد بخشتا ہے بلکہ اس ادب پارے کی بازیافت اور اس کی تخلیقِ مکرر کا اہم ادبی فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔''

(شمس الحق عثمانی، نظیر نامہ، نظیر اور کلام نظیر کچھ اشارے، ص 14)

'تنقید کو تخلیق کا اعتبار اور اعتماد بخشنا' یا تنقید کو 'تخلیق مکرر' تسلیم کرنے سے شمس الحق عثمانی کا تنقیدی نظریہ یہاں تک آتے آتے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ 'تخلیقی تنقید' کے حامل نقاد ہیں۔ تخلیقی نظریہ نقد کے تناظر سے فن پارے کے تفہیمی اور تجزیاتی عمل کے دوران کوئی مخصوص نظریہ قائم نہیں رکھا جا سکتا ہے؛ کیونکہ تخلیق کار جس مرکزی خیال کو لے کر فن پارہ تخلیق کرتا ہے، کبھی لاشعوری اور جذباتی کیفیات اُس مرکزی خیال پر حاوی ہو جاتے ہیں اور ایک ایسا فن پارہ جنم لیتا ہے جس کا گمان تخلیق کار کو بھی نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا جب تخلیق کار کے خیالات دوران تخلیق اپنی ماہیت بدلتے رہتے ہیں؛ تو تفہیم کے دوران کسی فن پارے پر مخصوص نظریے کا اطلاق کیسے ممکن ہے؟ اس طرح دیکھا جائے تو تخلیقی تنقید کسی مخصوص نظریہ کے تناظر سے فن پارے کی تفہیم نہیں کرتی ہے۔ تخلیقی تنقید کے اس نظریے کو ذہن میں رکھیے اور شمس الحق کے مذکورہ بالا اقتباس کو پڑھیے، تو خوب اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کی حدود میں تحلیل ہو کر اپنی تنقیدی حس کو بروئے کار لا کر فن پارے کی بصیرتوں کو آشکار کرنے کو ہی اپنا تنقیدی فریضہ سمجھتے ہیں۔ تفہیم کے دوران وہ فن پارے کے مخصوص تخلیقی عناصر کے بجائے مجموعی تخلیقی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہی ایک طریق کار ہو سکتا ہے، جس سے فن پارے کی مکمل تفہیم ممکن ہے۔ کیوں کہ فن پارہ مخصوص کیفیات کے بجائے مختلف النوع کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا شمس الحق عثمانی کے نزدیک فن پارے کی مکمل تفہیم تب ہی ممکن ہے جب نقاد فن پارے کی فضا و کیفیت میں رہ کر اُسے مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''ادب فہمی کا ایک مشرب یہ ہے کہ فن کار کے مجموعی تخلیقی ذہن اور فن پارے میں خلق شدہ فضا و کیفیت میں تادیر رہ کر بھی فن پارے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔''

(آئینہ حیرت کے اشکارے مشمولہ دراصل، 1999، ص 42)

شمس الحق عثمانی کے ادبی و تنقیدی نظریات کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ناقد ادب اور قاری کے درمیان رشتہ قائم کرنے والا ہوتا ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک نقاد پہلے نقاد ہوتا ہے، بعد میں کسی مخصوص نظریے کی توضیح کرنے والا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ادبی نقاد کو ادبیت کے ساتھ اپنا تنقیدی فریضہ انجام دینا چاہیے، نہ کہ کسی مخصوص نظریے کا ڈھنڈورچی بنے۔ اسی لیے شمس الحق کے نزدیک ایک نقاد کو چاہیے کہ وہ ادب اور ادیب کی اہمیت کو تسلیم کرے اور کھلے ذہن سے فن پارے کا تجزیہ اس انہماک و لگن سے کرے کہ تخلیق کار کے ذہن تک اُس کی رسائی ممکن ہو جائے اور وہ فن پارے سے پوشیدہ معنی و مفہوم کشید کر سکے۔ دوسری طرف شمس الحق اس بات کے بھی قائل ہیں کہ فن پارے سے حاصل ہونے والی مسرت کا احساس قاری کو بھی ہونا چاہیے؛ دیکھا جائے تو یہ تب ہی ممکن ہے جب نقاد جملہ معنیاتی اسرار و رموز کی تلاش کے پیش نظر فن پارے کا مطالعہ کرے۔ اس طرح اُن کے تخلیقی نظریہ نقد میں جمالیاتی عناصر کی تلاش کا بھی دخل ہے۔ بہر صورت شمس الحق عثمانی کے تنقیدی نظریے سے ایسا تجزیاتی مطالعہ مقصود ہے جس میں ایک طرف فن پارے کی تمام اَن کہی باتیں اور بصیرتیں آشکار ہو سکیں تو دوسری طرف ادب کی ادبیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاری کو جملہ ادبی محاسن سے واقف کرایا جا سکے۔

■

Dr. Owais Ahmad Bhat
Dept. of Urdu
Kashmir University
Kashmir-190006
Mob.:9149958892
rafidowais@gmail.com

واثق الخیر

قمر جہاں کے افسانوں میں عورت کے متنوع کردار

بہار کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام قمر جہاں کا ہے جنھوں نے عورت کو موضوع بنا کر بہت ساری کہانیاں لکھی ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔قمر جہاں کے والد سید عطاء الحق تھے اور والدہ بی بی اختر جہاں تھیں۔ ان کی پیدائش 15 مئی 1948 میں قصبہ بزرگ دوار سمستی پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم باڑھ اسکول میں ہوئی، پھر پٹنہ کے بانکی پور گرلس ہائی اسکول سے انٹر کی تعلیم حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی کے مگدھ مہیلا کالج سے اردو میں ایم اے کی سند لی۔ پی ایچ ڈی رانچی یونیورسٹی سے پروفیسر وہاب اشرفی کی نگرانی میں 'اختر شیرانی کی رومانی اور جنسی شاعری' کے موضوع پر کی۔ سندروتی مہیلا کالج بھاگلپور سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پھر تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوکر صدر شعبہ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدے تک پہنچی اور 2010 میں سبکدوش ہوئیں۔ انھوں نے لکھنے پڑھنے کا شوق کبھی نہیں چھوڑا۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز ساتویں دہائی کے بعد ہوا ہے۔ان پانچ دہائیوں میں اردو ادب میں ہو رہی تبدیلیوں اور تغیرات کو انھوں نے نزدیک سے دیکھا اور اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل پر ان تمام بدلاؤ سے اثر قبول کرتے ہوئے اپنے لیے ایک الگ راہ منتخب کی۔ قمر جہاں نے زندگی کے بے شمار چھوٹے بڑے لمحات واحساسات اور واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں عصری حسیت کے ساتھ عصری جبریت بھی موجود ہے۔

ان کا پہلا افسانہ 'جنون وفا' ماہنامہ 'صبح نو' 1964 میں پٹنہ سے شائع ہوا جو انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا۔ ان کی تقریباً 70 سے زیادہ کہانیاں منظر عام پر آچکی ہیں، جس میں چار افسانوی مجموعے 'چارہ گر'، 'اجنبی چہرے'، 'یادنگر' اور 'پنجرے کا قیدی' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک ناولٹ 'ٹھنڈی چھاؤں' بھی ہے۔ان کی کئی تنقیدی کتابیں بھی منظر عام آچکی ہیں۔ جن میں معیار (مجموعہ مقالات)، اختر شیرانی کی جنسی اور رومانی شاعری، کلام عبداللہ حافظ مشکی پوری، تانیثی تنقید: ممتاز شیریں سے عہد حاضر تک'، 'حرف آگہی'، 'منزل تکمیل' اور 'علیم اللہ حالی: نقوش و افکار' وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ انھوں نے رپورتاژ اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ہندی میں بھی ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے چند افسانوں کے ہندی تراجم بھی ہوئے ہیں۔ افسوس کہ اسی سال 11/فروری 2025 کو ایک بج کر تیس منٹ پر حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اسی دن بعد نماز مغرب بھاگلپور میں بھیکن پور کے برہ پورہ قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

قمر جہاں سماجی، معاشرتی اور گھریلو سطح کے افسانے خصوصی طور پر لکھتی رہی ہیں۔ ان کے فن میں جہاں فکری آگہی ہے، وہیں معاشرے کا گہرا مشاہدہ نمایاں نظر آتا ہے۔ فطری طور پر ان کی افسانہ نگاری کا ایک بڑا حصہ عورتوں کے مسائل سے متعلق ہے۔ یہ عورتیں روایتی نہیں ہیں بلکہ بدلتے ہوئے سماجی تناظر میں جدید تعلیم یافتہ، برسر روزگار ہیں جو گھر اور باہر کی الجھنوں، ذہنی انتشار اور جذباتی ناآسودگی کا شکار ہیں۔ آج کی عورت صرف ایک ماں، ایک بیوی اور بہن ہی نہیں ہے بلکہ اس کی اور بھی جہتیں ہیں۔ آج عورت کسی دفتر یا ادارے کی کامیاب ملازمہ ہے، بچوں کی استانی اور ان جیسے کتنے ہی عہدوں پر فائز ہوکر اپنی کامیابی کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود عورت اپنے خاوند کی قابل رشک ہم سفر بھی ہے اور اس سفر میں بسا اوقات اپنی شخصیت کو ریزہ ریزہ بھی کرتی ہے۔ان تمام حالات اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ قمر جہاں کے افسانوں میں عورتیں موجود ہیں۔ عورتوں کی یہ ساری کیفیت صرف ان کے مشاہدات کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ ان کی زندگی کا حصہ بھی رہی ہیں۔قمر جہاں اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''......میں نے ان کا صرف مشاہدہ نہیں کیا ہے بلکہ انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، تب جا کر لکھا ہے۔''

قمر جہاں کے یہاں کردار نگاری کی جو دنیا عورتوں سے وابستہ ہے ان میں فنکاری اور حقیقت نگاری کے پہلو خاصے نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورتیں پڑھی لکھی، اعلی تعلیم یافتہ اور اکثر اوقات ملازمت یافتہ ہیں۔ گھریلو عورتیں بھی ان کی کہانیوں میں موجود ہیں۔ یہ عورتیں کہیں مشغولیت بھری زندگی سے پریشان ہیں تو کہیں اپنی ازدواجی اور ذاتی زندگی کی ناکامیوں اور

محرومیوں سے دوچار۔ ان کے افسانوں میں روایتی قسم کے عام نسوانی کردار بھی ملتے ہیں۔

افسانہ 'اجنبی چہرے' میں نئی شادی شدہ لڑکی اپنے سسرال میں آ کر اجنبیت کے احساس سے دوچار ہے، اسی طرح افسانہ 'خواب خواب زندگی' میں ایک لڑکی کا ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو اپنی شادی کی پہلی رات میں فطری طور پر شوہر کی دلجوئی کی منتظر ہے مگر اسی رات اس کا شوہر اس کے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیتا ہے اور اسے طرح طرح کی ذمہ داریوں سے متعارف کراتا ہے۔ افسانہ 'ایک معمہ' میں مسز شرما کا کردار شوہر کی بے توجہی اور بے رخی کا شکار ہے۔

قمر جہاں نے اپنے زمانے کی تیز رفتار زندگی اور اس کے منفی و مثبت اثرات کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ سماج کو گہری نظر سے دیکھتی ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں زندگی بالخصوص عورتوں کی زندگی کے مختلف جہات پر توجہ ملتی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ان کے افسانوں کا مرکز و محور عورت ہی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے اور طبقہ نسواں کی ذہنی کشمکش کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ جس میں تعلیم یافتہ عورتوں کو اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہ گھر اور آفس کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی وجہ سے ذہنی کشمکش کا شکار ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان عورتوں کی ذہنی کشمکش، تصادم اور حیات و کائنات کے کربناک ماحول کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ حقیقت پسندی کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ جہاں زوال آمادہ تہذیب کی عکاسی کی ہے وہیں اسلوب بیان میں دلکشی بھی بخشی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کی زندگی کی مختلف جہتیں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے دکھ سکھ، خوشیوں، محرومیوں، خواہشوں اور بنتے بگڑتے رشتوں کو اپنے مشاہدے و تخیل کے کینوس پر اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے افسانوں میں تہہ داری نہیں ہوتی بلکہ راست بیانیہ انداز میں بڑی معصومیت کے ساتھ وہ انسانی زندگی کے داخلی و خارجی مسائل کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں وہ عورتیں بھی ہیں جو مشرقی روایات کی پابند رہ کر گھر کی زینت ہیں اور وہ عورتیں بھی ہیں جو مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے والی ہیں، یعنی جو دنیا میں اپنی الگ شناخت بنانے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہیں۔

گھریلو زندگی کی وہ بڑی نقاش ہیں۔ انھوں نے شہروں، گاؤں اور ان کے آس پاس کے علاقوں میں رہنے والے غریب متوسط اور پسماندہ لوگوں کی الجھنوں اور مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے۔ جن میں عورت کا استحصال، سماج میں جہیز کی بڑھتی مانگ، نوجوان طبقے کا ذہنی انتشار، جدید عورت کی پریشانیاں اور محرومیاں خاص کر تعلیم یافتہ اور نوکری پیشہ عورتوں کے مسائل، مرد کی جذباتی ناآسودگی، رشوت خوری، رشتوں کی پامالی جیسے بے شمار موضوعات و مسائل ان کی کہانیوں میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ گویا ان کے بیشتر افسانے عورتوں کے مسائل پر ہی مرکوز ہیں مگر یہ وہ مسائل نہیں ہیں جو روایت کا حصہ ہیں بلکہ یہ گلوبلائزیشن کی دین ہیں جس نے عورتوں کی حالت کو تشویش ناک حد تک متاثر کیا ہے۔ 'انتظار'، 'کٹی ہوئی شاخ'، 'آندھی'، 'سفر اور ہم سفر'، 'محافظ'، 'چارہ گر'، 'بند کوٹھری'، 'آج کی عورت'، 'لمحوں کی صدا'، 'فریج کی عورت'، 'اجنبی چہرے' اور 'خواب خواب زندگی' ان کے بہترین افسانے ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت اور عورتوں سے جڑے مختلف پہلوؤں کو افسانے میں مرکزیت عطا کی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر منظر حسین لکھتے ہیں:

''یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ 1980 کے بعد بہار کی خواتین فنکاروں میں جن شخصیتوں نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی توانائی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنی شناخت بنائی ہے ان میں ڈاکٹر قمر جہاں کا نام نمایاں ہے۔''

قمر جہاں نے آج کی زندگی اور موجودہ عہد میں جدید تعلیم کے میدان میں عورتوں کی شمولیت اور سماج کی ترقی میں حصہ داری کی وجہ سے وہ جس ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں اس کو اپنے افسانوں میں نمایاں طور پر دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتی ہیں:

''......میری ایسی کہانیاں جن میں آپ کو صرف گھر آنگن کی تصویریں نظر آتی ہیں وہاں بھی میرا مطمح نظر محض گھر آنگن کی تصویر کشی کبھی نہیں رہا ہے اور نہ میں نے عورتوں کے عام مسائل سے دلچسپی دکھائی ہے بلکہ بدلتے ہوئے سماجی تناظر میں جدید تعلیم یافتہ، برسر روزگار عورت بکھری ہوئی حالت، گھر اور باہر کی الجھنیں، ان کا ذہنی انتشار اور جذباتی ناآسودگی وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔''

قمر جہاں کے افسانوں میں گھر کی تصویر کشی کے علاوہ آج کے سماج میں عورتوں کی بکھری ہوئی زندگی بالخصوص تعلیم یافتہ برسر روزگار عورتوں کے درمیان پائی جانے والی ذہنی کشمکش، الجھنوں، محرومیوں، ناامیدی اور جذباتی ناآسودگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں تک ان کی افسانہ نگاری میں تانیثی شعور کا تعلق ہے ان کے افسانے نہ صرف نسائی خیالات و جذبات پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ وہ سائنسی، صنعتی اور تکنیکی دور کی اس تیز رفتار زندگی میں عورت کے ٹوٹتے بکھرتے وجود کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ آج عورت زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذہانت اور لیاقت کے جوہر دکھا چکی ہے لیکن دوسری طرف سائنسی، صنعتی اور تکنیکی دور نے بہت حد تک اس کی خانگی زندگی کو درہم برہم بھی کر دیا ہے۔

قمر جہاں کا افسانہ 'آج کی عورت' ملازمت پیشہ عورت کی الجھنیں اور اس کی دوہری ذمے داری کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی خیال دور حاضر میں ملازمت پیشہ عورتوں کا گھریلو کاموں اور پھر دفتری کاموں میں الجھ کر ٹوٹنا بکھرنا اور ذہنی و جسمانی تھکان میں مبتلا ہونا ہے۔ افسانے کی پیش کش کے اعتبار سے وہ انتہائی مؤثر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بذات خود ایک عورت ہونے کے ساتھ تعلیم یافتہ ملازمت کرنے والی ایک ذمہ دار پروفیسر بھی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ملازمت پیشہ عورتوں کے مسائل اور ان کی پریشانیوں کو بہت ہی مؤثر طریقے سے اٹھایا ہے۔ انھوں نے مرد سماج کی سرد مہری کی طرف بھی کچھ گہرے اشارے کیے ہیں۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ جن گھروں کی عورتیں ملازمت کرتی ہیں انھیں کئی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ جب گھر سے اپنی ڈیوٹی پر نکلتی ہیں تو ان کے بچے ان کا دامن پکڑ لیتے ہیں، راستہ روکنے لگتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں اور ماں کی ممتا ڈھونڈھتے ہیں، جو ان کا پیدائشی حق ہے مگر ان سب سے پرے عورت کو وقت پر ڈیوٹی پر جانے کی مجبوری بھی شامل ہے۔ اسی کشمکش میں بچوں کی صحیح پرورش اور نگہداشت نہیں ہو پاتی ہے، جس کی وجہ سے خاندانی نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ قمر جہاں نے اس افسانے میں عصر حاضر کی عورت کی جو جدوجہد

دکھائی ہے وہ اس بات کی غماز ہے کہ مردانہ سماج کے وضع کردہ اصولوں اور روایات کے خلاف عورت نے بغاوت کا اعلان تو کر دیا ہے لیکن اس کے بدلے میں اسے بہت سی الجھنوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ آئے دن ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبتی چلی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کریں یہ اقتباس:

''اس کا قلم بے اختیاری میں رجسٹر پر چل رہا تھا اور ذہن گھر کی طرف ...... اتنے میں باس آکر کھڑی ہوگئیں اور رجسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے گرجیں۔ ''میں محسوس کر رہی ہوں کہ اب آپ کا دل کام کرنے میں بالکل نہیں لگتا ہے...... دیکھیے آپ نے کیا غلطی کی ہے۔'' وہ سر جھکا کر کھڑی ہوگئی اور ہمت کر کے بولی۔

''معاف کریں گی میڈم، آج میں بے حد پریشان ہوں۔ میرا بچہ بیمار ہے میں نے چاہا تھا کہ آج......''

افسانہ 'یادوں کی پروائیاں' میں ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو تعلیم یافتہ برسر روزگار اور بہترین مصور ہے۔ جس نے زندگی میں وہ سب کچھ کیا جو ایک کامیاب اور خوش آئند زندگی کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن کیا واقعی اس کی زندگی میں وہ خوشیاں ہیں جو برق رفتار دنیا کی ریس میں عورت خود کو دیکھنا پسند کرتی ہے اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئی ہے مگر دنیا سے کندھا ملانے کی اس ہوڑ میں اس کی نسوانیت کو کہیں نہ کہیں ٹھیس لگی ہے۔ اس لیے افسانے کے درج ذیل کردار میں عورت اپنی ماں کے ساتھ خود کی زندگی کا محاسبہ کرتی ہوئی سوچتی ہے:

''اماں کس قدر خدمت گزار عورت ہیں، راتوں میں اٹھ کر ابا حضور کی خدمت کرتے ہوئے ان کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں آتی۔ رمضان میں خود روزے سے ہوتیں مگر ابا حضور ذیابطیس کے سبب روزہ رکھنے سے معذور تھے۔ اماں دن کے کھانے بناتیں، ٹفن ساتھ دیتیں، حالانکہ وہ خود بیمار رہتیں مگر یہ کیسا رشتہ تھا جہاں اپنے سارے دکھ درد کو بھول کر کسی کی خاطر جینا ہی زندگی بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی اسے اماں پر افسوس بھی ہوتا واقعی ان کا وجود اس گھر کے لیے مشین کا ایک ضروری پرزہ بن کر رہ گیا تھا...... اگر یہ پرزہ دو دن کے لیے بھی کام کرنا چھوڑ دے تو سارا گھریلو نظام ہی درہم برہم ہونے لگتا تھا......

اکیسویں صدی میں داخلے کے بعد وہ اپنی موجودہ صورت حال میں خوش ہونے کے باوجود بہت مطمئن نہیں تھیں۔ کیا آج بھی ہم عورتوں کا وجود اپنے گھر کے لیے ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتا ہے؟ ایک نا قابل حل سوال اس کے دماغ پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا۔''

قمر جہاں نے سماج کی جڑوں میں پوشیدہ مختلف النوع مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ لڑکیوں کی شادی اور اس سے متعلق مسائل بھی ان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ افسانہ 'مہورت'، 'وہ لڑکی' اور 'اپنے ہوئے پرائے' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو موضوع اور مسائل کی نوعیت کے اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ افسانہ 'مہورت' لڑکی کی شادی پر ایک اچھا افسانہ ہے۔ لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ تو صدیوں سے ہمارے سماج میں چلا آیا اور آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ افسانے میں ایک باپ اپنی بیٹی کی تصویر لیے کئی دروازوں پر رشتے کے لیے جا چکا ہے لیکن بات طے نہیں ہو پاتی ہے۔ ایک مجبور باپ کے لیے خود سے لڑکی کی تصویر لے کر در در کی ٹھوکریں کھانا گویا کسی بے حیائی سے کم نہیں۔ لیکن ایک کے بعد ایک متواتر تین بیٹیوں کے بوڑھے باپ کے کاندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ خود سے لڑکی دکھائے جانے کے اس عمل سے وہ بے زار بھی ہوتا ہے، اس کا ضمیر اس کو کچوکے بھی لگاتا ہے:

''اکثر جگہوں پر تو بے حیا بن کر خود لڑکی کو ساتھ لے کر بھی اسے جانا پڑا تھا اور ایسے موقعوں پر سوال و جواب کی بوچھار سے اس کی گردن ایسی جھک جاتی کہ معلوم ہوتا اب وہ سیتا کی طرح زمین کے چاک ہونے کا انتظار کر رہا ہے......' زمین پھٹ کیوں نہیں جاتی......' ایک دن وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔''

افسانہ نگار نے کم و بیش اسی طرح کے ایک اور معاشرتی مسئلہ کو اپنے افسانہ 'اپنے ہوئے پرائے' میں پیش کیا ہے۔ لڑکی کے جذبات و احساسات کے اظہار کو وسیلہ بنا کر سماج کی کڑوی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک لڑکی جو عمر کے پینتس سال گزار چکی ہے اب تک جانے کتنی دفعہ وہ لوگوں کے سامنے سج دھج کر پیش کی جا چکی ہے، لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی نقص نکال دیا جاتا ہے۔ آخر میں وہ مزید تماشا بننے سے انکار کر دیتی ہے اور اسے اپنے لوگ بھی پرائے معلوم ہونے لگتے ہیں جو اسے شادی کے لیے بنا سنوار کر لڑکے والوں کے سامنے حاضر ہونے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیں کہ لڑکی لوگوں کے رد عمل کے باعث کس ذہنی کیفیت سے گزر رہی ہوگی:

''سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر لڑکی کا قد چھوٹا ہے۔''

کوئی کہتا:

''لڑکی کا نقشہ تو بہت اچھا ہے مگر چارم نہیں ہے، کہیں سے کوئی آواز ابھرتی''

''لڑکی دبلی بہت ہے۔''

اور بعد میں تو لوگ یہ کہنے لگے:

''لڑکی کی عمر بہت زیادہ ہے۔''

لڑکیوں کی شادی سے متعلق کئی ایسے مسائل ہیں جس نے ہمارے سماج کو کھوکھلا بنا کر رکھ دیا ہے۔ کبھی لڑکی کی صورت شکل آڑے آتی ہے تو کبھی جہیز کی بڑھتی مانگ جس نے نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو نذر آتش کر دیا یا لڑکیاں اپنے باپ کے گھر میں ہی بوڑھی ہوگئیں۔ جہیز جیسے ناسور مسئلے کو ظاہر کرتا ان کا افسانہ ''وہ لڑکی'' قابل ذکر ہے۔ یہ ایک شادی شدہ نو عمر لڑکی کی کہانی ہے، جسے بیانیہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس لڑکی کو گھر والے سسرال بھیجنے پر اصرار کرتے ہیں مگر یہ لڑکی جو اپنی شادی شدہ زندگی سے حد درجہ بیزاری کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ سسرال والوں کو وہ قطعی پسند نہیں ہوتی اور ان کے رویے کی وجہ سے لڑکی کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو افسانہ نگار نے بڑی چابک دستی سے اشارتاً اخبار کی ایک خبر کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک جلی ہوئی لڑکی کی تصویر کے ساتھ خبر شائع ہوئی تھی کہ یہ لڑکی کی سسرال میں ذہنی اور جسمانی طور پر استحصال کا شکار ہوئی ہے اور موت اب اس کا مقدر بن چکی ہے۔

عہد حاضر میں رشتوں کو بنیاد بنا کر لکھے گئے افسانوں میں ان کا افسانہ 'رشتے کی پہچان' بھی قابل ذکر ہے۔ اس افسانے میں کئی مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ غریب، بیوگی کا مسئلہ، سرکاری دفتروں میں بڑھتی بدعنوانیاں، رشتوں میں عدم اعتماد جیسے کئی اہم مسئلوں کو افسانہ نگار نے اٹھایا ہے۔ خاص طور سے بدلتے ہوئے سماجی تناظر میں تعلیم یافتہ عورتوں کے ذہنی انتشار اور جذباتی ناآسودگی کو بھی بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ نئی صدی میں عورت ایک طرف جہاں اپنے

وجود کے استحکام کے لیے آواز اٹھا رہی ہے اور احتجاجی رویہ رکھتے ہوئے مرد سماج کے مدمقابل ہر شعبے میں اپنے حقوق کو منوانے پر مصر ہے تو وہیں ایسی تصویریں بھی دیکھی جا رہی ہیں جہاں ایک عورت مرد کے ہوتے ہوئے بھی پریوار کی کفالت کی ذمہ داری کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے۔

افسانے کا مرکزی نسوانی کردار جس کا شوہر قتل کر دیا جاتا ہے بیوہ ہونے کے بعد اپنے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو لے کر میکے چلی جاتی ہے۔ جہاں اس کی بوڑھی ماں اور بھائی پہلے سے کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اب اپنے میکے کی کفالت کی ذمہ داری بھی اس پر آچکی تھی۔ روز وہ نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلتی اور ایک آفس سے دوسرے آفس کا چکر لگاتی، لیکن مایوسی کے ساتھ واپس لوٹ آتی۔ ماں، بچے، بھائی سب اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ جب عورت گھر سے باہر نکلتی ہے ایسی صورت میں سماج تو دور خود اس کے میکے والے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ افسانے میں عورت کا بھائی جو خود بے راہ روی کی ڈگر پر چل رہا ہے اور حد درجہ غیر ذمہ دار بھی ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں بھٹکتی اپنی بہن کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بازارو عورت کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

''سیر سپاٹے کا یہ اچھا بہانہ ہے آپی! گھومئے خوب گھومئے..... آج بھی آپ کو نوکری نہیں ملے گی.....کل پھر اسی طرح بن سنور کر......''

''ارے یہ تو کیا بول رہا ہے! تجھے ذرا بھی شرم نہیں کہ تو اپنی بڑی بہن سے جو تیری ماں برابر ہے.....''

''......مگر ماں تو نہیں نا......؟ اس نے برجستہ مسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی......دل چاہا کہ ایک زبردست طمانچہ اس کے منہ پر رسید کرے مگر وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کہ کہیں وہ گھر چھوڑ کر ہی بھاگ نہ جائے......وہ خاموش تلملاتی رہی......''

اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہد حاضر میں رشتوں پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ یہ نئے عہد کی تصویر ہے جہاں بھائی، بیٹا، شوہر، باپ سب رشتے اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں، خاص کر اس طبقے میں جہاں غربت اپنا منہ پھاڑے ان رشتوں کی گرماہٹ کو نگلنے پر آمادہ ہے۔

عورتوں کی محرومی کے سلسلے سے افسانہ 'ٹوٹتے رشتے' بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں قمر جہاں اس بات کو پیش کرتی ہیں کہ آج کی عورتیں اور لڑکیاں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی سسکیوں سے بھری زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ افسانے کا راوی جو اپنے والد کے کہنے کے مطابق زندگی کے ہر اس موڑ پر خود کو سچ ثابت کرنے میں کامیاب رہتا ہے، جہاں بیشتر افراد کو کامیابی نہیں ملتی ہے لیکن جب وہ ازدواجی زندگی میں بندھتی ہے تو شوہر کے مطابق وہ پورے طور سے کھری نہیں اترتی ہے۔ بالآخر طلاق کی نوبت آجاتی ہے اور وہ دوبارہ اپنے والد کے گھر چلی آتی ہے۔ طلاق کے بعد کی زندگی کتنی کڑوی ہوتی ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے قمر جہاں اس پہلو کو سامنے لاتی ہیں کہ اگر ایک لڑکی کی شادی کے بعد کی زندگی سلامتی بھری نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ہی ہائی فائی ذہنیت کی مالک کیوں نہ ہو۔ بالآخر اسے خون کے آنسو رونے پڑتے ہیں۔ اس پہلو کو قمر جہاں نے اس طرح بیان کیا ہے:

''انھیں یاد آیا کبھی ان کی بیٹی کتنی شاندار Debater تھی۔ کیسے کیسے International Seminars میں اول رہی تھی......مگر آج......اپنے جیون ساتھی کے ساتھ مختصر Debate میں وہ ہار گئی۔

آخر کیوں......؟ آخر کیوں؟''

افسانہ 'ممتا کی خوشبو' میں نوکری پیشہ عورتوں کے گھر اور بچوں کی بے سکونی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک بچہ اسکول سے آنے کے بعد اپنی ماں کو گھر میں نہیں پاتا ہے تو اس وقت بچے کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے اس کو اس افسانے میں دکھایا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''بے بی جو اسکول سے بے حد خوش گھر آئی تھی لیکن گھر میں ممی کو نہ پاکر اس کا منہ لٹک گیا۔ اس کی آئی ہوئی بھوک ختم ہوگئی اور سامنے کھانے کی پلیٹ دیکھ کر بھی اس کا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے خموشی سے پلیٹ اٹھائی اور دوبارہ نعمت خانہ میں رکھ دیا۔''

ایک جگہ اور افسانہ نگار لکھتی ہیں:

''آج اسکول میں وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے چھٹی ہو اور گھر جا کر وہ ماں سے لپٹ جائے اور اسے خوشخبری سنائے کہ وہ اپنے کلاس میں فرسٹ آئی ہے لیکن گھر پہنچ کر اس کی ساری مسرت ہوا ہوگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دوڑتے دوڑتے کہیں ٹھیس لگی اور وہ اچانک زمین پر گر پڑی ہو۔''

قمر جہاں نے ایک نوکری پیشہ عورت کی ذاتی الجھن اور اس کے گھر کے ماحول کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ آج گھر گھر کی کہانی ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کا منفی اثر سب سے زیادہ گھر کے بچوں پر پڑ رہا ہے۔

افسانہ نگار کی سماج پر گہری نگاہ ہے۔ عورتوں کی گھریلو پریشانیوں اور ازدواجی زندگی کی محرومیوں کا بیان بھی ان کے افسانوں میں بڑے دل آویز طریقے سے کیا گیا ہے۔ کہانی 'ایک معمہ' میں افسانہ نگار نے ایک عورت کی ازدواجی زندگی کی بیچارگی کو اپنا محور بنایا ہے۔ مسز شرما جو دیکھنے میں بے حد خوبصورت ہے، اپنے شوہر کی بے توجہی کا شکار ہوتی ہے۔ شوہر کے لیے سراپا انتظار رہتی ہے۔ اس کا شوہر برابر ہی دیر سے آتا اور اکثر تو آتا بھی نہیں ہے۔ افسانہ نگار نے ازدواجی زندگی کی دکھتی رگوں کو بڑے سیدھے سادے اور حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کی سچائی اور اس کے مسائل کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جائے کہ قمر جہاں نے سماج میں پھیلے ہوئے ہر طرح کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے عام طور پر گھروں میں پیدا ہونے والی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی تحریروں میں بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ بالخصوص سماج اور معاشرے پر گہری نگاہ و نظر ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں عورتوں کی گھریلو پریشانیوں اور ازدواجی زندگی کی محرومیوں کا بیان بڑے پراثر طریقے سے ملتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے کرداروں کو عورت و مرد کے نظریہ سے نہیں دیکھا ہے بلکہ ان کے مسائل کو ترجیح دی ہے، یہ خاصیت انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

■

Dr. Wasiqul Khair
Head of the Department
Department of Urdu
B N College, TMBU
Bhagalpur, Bihar, 812007
wasujnu@gmail.com

رام پور رضا لائبریری

صدیوں پر محیط علمی ورثہ

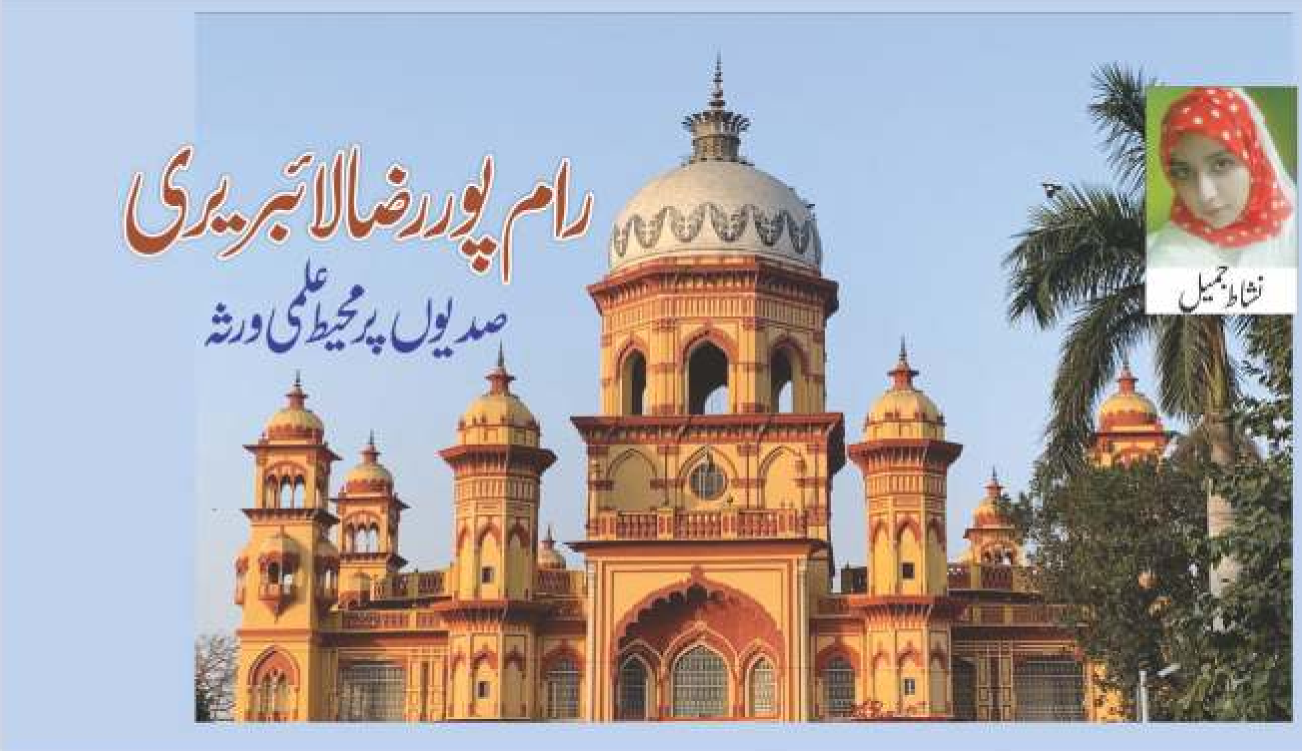

نشاط جمیل

رام پور شہر کو اپنے ثقافتی ورثے، علمی اداروں اور پرسکون طرزِ زندگی کے لیے جانا جاتا ہے لیکن اگر کوئی ایک چیز اس شہر کو عالمی سطح پر پہچان دیتی ہے تو وہ ہے رام پور رضا لائبریری جو اپنے نادر و نایاب علمی ذخیرے اور تاریخی اہمیت کی بنا پر ایشیا کی سب سے منفرد اور عظیم لائبریریوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ علمی ادارہ نہ صرف ریاستِ رام پور کے نوابین کی علم دوستی، دانشورانہ بصیرت اور علمی سرپرستی کی روشن مثال ہے بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ وہ علم وفن کے ذریعے اپنی ریاست کو ایک ثقافتی اور تعلیمی مرکز میں تبدیل کرنے کے خواہاں تھے۔ ریاستِ رام پور نے اپنی دانشمندانہ حکمرانی، علمی ترقی کے عزم اور فنونِ لطیفہ کے فروغ کی بدولت ایک ایسے علمی و ادبی ماحول کو پروان چڑھایا جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

رام پور رضا لائبریری نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے اسکالرز کے لیے تحقیق اور مطالعہ کا مرکز ہے۔ خاص طور پر یورپ، امریکہ، آسٹریلیا، اور عرب ممالک جیسے سعودی عرب، ایران، عراق اور مصر سے اسکالرز یہاں آ کر تحقیق کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، انگلینڈ، جرمنی، چین اور جاپان کے محققین بھی یہاں کے نادر علمی ذخیرے سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مختلف ممالک کے سفیر اور معزز مہمان بھی وقتاً فوقتاً اس لائبریری کا دورہ کرتے ہیں اور اس کے قیمتی ذخیرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ لائبریری ایک ایسا علمی مرکز ہے جو تحقیق وجستجو کے متوالوں کے لیے جنت کی حیثیت رکھتی ہے جہاں ہر کتاب اور ہر مخطوطہ اپنے اندر علم و دانش کے بے شمار خزانے سموئے ہوئے ہے۔

رام پور رضا لائبریری نہ صرف ایک وسیع کتابی ذخیرہ رکھتی ہے بلکہ اس عظیم الشان علمی مرکز کی سب سے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت خوب صورت اور تاریخی محل 'حامد منزل' میں واقع ہے۔ 'حامد منزل' نہ صرف ایک علمی مرکز ہے بلکہ فنِ تعمیر کا ایک ایسا نایاب شاہکار بھی ہے جو اپنی شاندار انڈو یورپی طرزِ تعمیر کی وجہ سے ایک الگ ہی کشش رکھتا ہے۔ اس کی دیواروں، چھتوں اور ستونوں پر انتہائی نفیس اور باریک بین کاری گری کی گئی ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ خاص طور پر اس کے بلند و بالا گنبد اور شاندار ستون جن پر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے، ایک بے نظیر فن پارہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ فنِ تعمیر کا ایسا عجوبہ ہے جو نہ صرف اپنی خوب صورتی کے لحاظ سے بے مثال ہے بلکہ ایک تاریخی ورثے کے طور پر بھی انتہائی قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

لائبریری میں تقریباً سترہ ہزار سے زائد نادر و نایاب مخطوطات موجود ہیں جو مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں۔ یہ مخطوطات علم و تحقیق کے شائقین اور ماہرین کے لیے بے حد قیمتی اثاثہ ہیں اس کے علاوہ لائبریری میں تقریباً ساٹھ ہزار نایاب اور نادر کتابیں بھی موجود ہیں جو مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں قدیم اور جدید دونوں ادوار کی علمی اور ادبی تخلیقات شامل ہیں جن کا مطالعہ تحقیق کے میدان میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوسکتا ہے۔

یہاں ایک لاکھ سے زیادہ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں جو مختلف زبانوں اور موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس لائبریری میں اردو، عربی، فارسی، ترکی، پشتو، سنسکرت اور ہندی زبانوں کے نایاب اور قیمتی مخطوطات کی بڑی تعداد محفوظ ہے جن میں سے بیشتر وہ قلمی نسخے ہیں جو مختلف دانشوروں، ادیبوں اور نامور مصنفین کے ہیں۔ ایسے نایاب ذخائر تحقیق کے میدان میں کسی بھی محقق کے لیے بے حد قیمتی اور گراں قدر وسائل فراہم کرتے ہیں۔ ان مخطوطات کے علاوہ لائبریری میں مختلف زبانوں میں مطبوعہ کتابوں، قدیم اخبارات و رسائل، اور دیگر علمی دستاویزات کا بھی ایک وسیع ذخیرہ محفوظ ہے جو تحقیق وجستجو کرنے والوں کے لیے علم و دانش کے ایک وسیع سمندر کی مانند ہے۔ یہاں سے غالبیات، اقبالیات اور تحریکِ آزادی سے متعلق اہم اشاریے مرتب کیے گئے ہیں جو ان موضوعات پر تحقیق کرنے والے اسکالرز کے لیے انتہائی کارآمد اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اس لائبریری کی ایک دلچسپ اور منفرد خصوصیت ہندی زبان میں موجود وہ مخطوطات ہیں جو فارسی رسم الخط میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ نہ صرف اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ ماضی میں علمی و ادبی ترقی کے لیے زبانوں اور رسم الخط میں کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ یہ ہندوستان میں رائج مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے امتزاج کی بھی ایک زندہ مثال ہیں۔

رام پور رضا لائبریری کا ایک اور منفرد پہلو اس میں موجود خطاطی کے نادر نمونے ہیں۔ یہاں ہزاروں

کے تعداد میں ایسے مخطوطات اور نسخے موجود ہیں جو خطاطی کی مختلف طرزوں اور اسالیب کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان میں اسلامی خطاطی کے کئی شاہکار اور قرآنِ مجید کے خوب صورت قلمی نسخے بھی جو فنِ خطاطی کے دل دادہ افراد کے لیے بے حد دلکش اور نایاب اثاثہ ہیں۔ اس لائبریری میں سونے اور چاندی کی روشنائی سے تحریر کردہ قرآنی نسخہ اسلامی خطاطی کے عروج کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہیں جس میں تمام آیات کو سونے اور چاندی کی روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا خط انتہائی نفیس ہے اور ہر صفحے پر بیل بوٹوں اور اسلامی طرزِ تزئین کی نہایت خوبصورت آرائش کی گئی ہے۔ یہ قرآنی نسخے ہمیں اسلام کی ابتدائی صدیوں کے علمی و دینی ورثے، قرآنی تحریر کی ابتدائی شکلوں اور اسلامی خطاطی کی خوبصورتی کا مشاہدہ کراتا ہے۔

اگر رضا لائبریری کے سب سے قیمتی اثاثے کی بات کی جائے تو بلا شبہ یہاں محفوظ وہ مقدس اور نادر ترین قرآنی نسخہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دستِ مبارک سے لکھا گیا تصور جاتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو اس نسخے کو نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ پوری دنیا کے علمی و تاریخی حلقوں میں ایک بے مثل اور بے نظیر دستاویز بناتا ہے۔ اس کے نایاب اور قدیم ہونے کی کئی اہم خصوصیات ہیں جو اسے قرآن مجید کے دیگر قدیم نسخوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ قرآنی نسخہ انتہائی نایاب اور تاریخی خطاطی کا ایک عظیم شاہکار ہے جو آج بھی اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ اس کی خطاطی، سائز اور تحریری انداز کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک بے حد محنت اور مہارت سے تحریر کردہ مخطوطہ ہے جو صدیوں سے علم و عرفان کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ یہ قرآنِ مجید 343 اوراق پر مشتمل ہیں جو انتہائی عمدہ اور معیاری انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ہر صفحے پر 15 یا کہیں 16 سطریں موجود ہیں جو اسے پڑھنے میں سہولت فراہم کرتی ہیں اور قدیم عربی خطاطی کی ایک بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔

یہ مقدس قرآنی نسخہ کوفی رسم الخط میں لکھا گیا ہے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں رائج تھا اور قرآنِ مجید کی اولین تحریری شکلوں میں شمار ہوتا ہے۔ کوفی خط کو اس کی سادگی، مضبوطی اور جاذبِ نظر اسٹائل کی وجہ سے جانا جاتا ہے اور اس نسخے میں یہ خوب صورتی اپنی انتہائی شاندار شکل میں موجود ہے۔ یہ قرآنِ پاک اونٹ کی کھال پر تحریر کیا گیا ہے جو کہ قدیم اسلامی دور میں تحریر کے لیے ایک نادر اور مضبوط ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں جب کاغذ کی صنعت ابھی ترقی پذیر نہیں ہوئی تھی تو مخطوطات عموماً چمڑے، یا ہڈیوں پر تحریر کیے جاتے تھے تاکہ وہ طویل عرصے تک محفوظ رہ سکیں۔ اس نایاب قرآنی نسخہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک انتہائی دلچسپ اور منفرد تکنیک اپنائی گئی ہے۔ اس نسخہ کی مزید حفاظت کے لیے ہر دو ورق کے درمیان ہرن کی کھال کی جھلی لگائی گئی ہے جس کا بنیادی مقصد روشنائی کو پھیلنے سے بچانا اور تحریر کو دیرپا اور ناقابلِ تلف بنانا تھا۔ یہ طریقہ قدیم اسلامی کتب و دستاویزات کی حفاظت کے لیے انتہائی نایاب اور منفرد تھا اور آج بھی اس نسخے کی بے مثال حالت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ انتہائی محنت اور مہارت سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ قرآنی نسخہ نہ صرف تحقیقی، تاریخی اور خطاطی کے اعتبار سے انتہائی قیمتی ہے بلکہ روحانی لحاظ سے بھی عظیم ترین اسلامی اثاثہ ہے۔ اگر واقعی یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دستِ مبارک سے تحریر کردہ ہے تو یہ اسلامی تاریخ کا ایک بے مثال اور غیر معمولی نسخہ ہے جو آج بھی اپنے قدامت، اصل خطاطی اور منفرد حفاظتی تکنیکوں کی بدولت علمی و دینی دنیا میں ایک عظیم اور ناقابلِ فراموش مقام رکھتا ہے۔ یہ نسخہ صرف رام پور رضا لائبریری کا ہی نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا کا ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس پر دنیا بھر کے اسکالرز، مورخین اور قرآنِ کریم کے محققین تحقیق کر رہے ہیں۔

> ابتدا میں رام پور رضا لائبریری محض ایک ذاتی علمی ذخیرہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسے وسعت دی گئی اور بعد میں یہ ایک سرکاری علمی ادارے کی شکل اختیار کر گئی۔

رام پور رضا لائبریری کا قیام تقریباً ڈھائی سو سال قبل ریاست رام پور کے بانی روہیلہ سردار نواب فیض اللہ خاں (1774 تا 1794) کے دورِ حکومت میں عمل میں آیا۔

ابتدا میں رام پور رضا لائبریری محض ایک ذاتی علمی ذخیرہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسے وسعت دی گئی اور بعد میں یہ ایک سرکاری علمی ادارے کی شکل اختیار کر گئی۔ نواب فیض اللہ خاں جو نہ صرف ایک زیرک حکمران تھے بلکہ علم و فن کے بے حد قدر دان بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں علم دوستی جو جذبہ تھا اسی نے اس کتب خانے کو جنم دیا۔ یہ صرف ایک عام لائبریری نہیں تھی بلکہ ایک ایسا علمی مرکز تھا جہاں نایاب اور قیمتی کتابوں کو جمع کرنے کا ایک جامع منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا۔ تاہم رضا لائبریری کی اصل ترقی اور وسعت کا دور نواب محمد سعید خاں بہادر (1840 تا 1855) کی تخت نشینی کے بعد شروع ہوا۔ نواب محمد سعید خاں نے جب ریاست کی باگ ڈور سنبھالی تو دیگر شعبوں کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ رضا لائبریری کو بھی اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا۔ ان کے دور میں نہ صرف قلمی نسخوں کے نایاب کلیکشن کو مزید وسعت دی گئی بلکہ نادر و نایاب کتابوں کی نقول تیار کرانے کا بھی انتظام کیا گیا تاکہ علمی سرمایہ محفوظ رہے اور آئندہ نسلیں بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ ان کی سرپرستی میں لائبریری ایک جدید علمی مرکز میں تبدیل ہو رہی تھی جہاں مختلف علوم و فنون پر مشتمل بیش قیمت ذخیرہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔

نواب محمد یوسف علی خاں ناظم (1855 تا 1865) کا نام تاریخی اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک مدبر اور دانشور حکمران تھے بلکہ شاعری میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدا میں 'یوسف' تخلص اختیار کیا اور مشہور شاعر 'مومن خاں مومن' کی شاگردی میں رہ کر اپنے شعری ذوق کو نکھارا۔ بعد میں جب وہ مرزا غالب کی شاگردی میں آئے تو غالب کی تجویز پر انھوں نے 'ناظم' تخلص اختیار کیا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم نے مومن کے اندازِ شاعری کو اپنانے کے ساتھ ساتھ غالب کے سخن کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی جس کی وجہ سے ان کا کلام دو عظیم شعری دبستانوں کی حسین آمیزش کا نتیجہ بن گیا۔ نواب یوسف علی خاں نے رام پور میں طرحی مشاعروں کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے ادبی ماحول میں ایک بڑی تبدیلی تھی۔ ان مشاعروں میں

برصغیر کے نامور شعرا کو مدعو کیا جاتا اور یہاں شعری و ادبی ذوق کو جلا بخشنے کے لیے علمی وفکری نشستوں کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد جب دہلی اور لکھنؤ کے دربار ختم ہو گئے تو وہاں کے بڑے بڑے شعرا اور ادبا سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ ایسے میں رام پور ایک محفوظ اور خوشحال پناہ گاہ کے طور پر ابھرا جہاں نواب محمد یوسف علی خاں بہادر نے ان علمی شخصیات کو مکمل سرپرستی فراہم کی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی اور لکھنؤ کے مشہور شعراء رام پور کی طرف ہجرت کر گئے اور یہاں کی ادبی فضا کو مزید جلا بخشی۔

نواب محمد یوسف علی خاں بہادر کے بعد ان کے فرزند نواب کلب علی خاں بہادر (1865 تا 1887) نے شعرا و ادبا کی جس طرح پذیرائی کی وہ تاریخ ادب میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نواب کلب علی خاں کا دَور رام پور کی علمی و ادبی تاریخ کا زریں دَور تھا۔ یہ دَور اس لحاظ سے منفرد ہے کہ نواب کلب علی خاں خود بھی ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے رام پور کی ادبی محفلیں مزید نکھر گئیں اور ہندوستان کے ہر گوشے سے علم و ادب سے جڑے افراد یہاں کا رخ کرنے لگے۔

نواب کلب علی خاں عالموں، شاعروں، موسیقی کے فنکاروں، ادیبوں، خطاطوں اور مختلف فنون کے ماہرین کے زبردست قدردان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر علاقے کے فنکار اور علمی شخصیات رام پور آ کر بسنے لگیں اور یہاں کے علمی ذخیرے میں بے حد اضافہ ہوا۔ رضا لائبریری کی ترقی میں سب سے نمایاں کردار نواب کلب علی خاں کا رہا جنھوں نے نہ صرف اسے مزید مستحکم کیا بلکہ اسے ایک بین الاقوامی علمی و تحقیقی مرکز کی حیثیت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ نواب کلب علی خاں خود بھی علم و ادب کے شوقین تھے اور علمی مجالس و مکالموں کو فروغ دینے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے دَور میں رضا لائبریری اور رام پور کی علمی و ادبی فضا اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ان کی سرپرستی میں رضا لائبریری کا علمی وقار مزید بلند ہوا اور کئی قیمتی مخطوطات اور قدیم کتابوں کا اضافہ کیا گیا جن کی بدولت یہ لائبریری ہندوستان کے علمی ورثے کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ بن گئی۔ رام پور کے دربار میں اس وقت کے ہر بڑے شاعر، ادیب، تاریخ نویس، خطاط اور داستان گو نے اپنی جگہ بنالی۔ اس دَور میں کئی عظیم علما، شعرا، اور مصور رضا لائبریری کے علمی اثاثے میں بے پناہ اضافے کا باعث بنے۔

رضا لائبریری کی تاریخ میں نواب سیّد حامد علی خاں بہادر (1889 تا 1930) کے دَور کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نواب سیّد حامد علی خاں جب تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اپنے عہد میں لائبریری کی ترقی کو ایک نئی سمت دی۔ انھوں نے اس علمی ورثے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو لائبریری کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا۔ حکیم اجمل خاں نے خاص طور پر عربی کتب کے ذخیرے کو وسعت دینے پر توجہ دی جس کے نتیجے میں لائبریری میں کئی ایسی عربی کتابیں شامل ہوئیں جو آج بھی تحقیق و جستجو کے متوالوں کے لیے نادر سرمایہ ہیں۔ ان کے اقدامات نے اس علمی ادارے کو عربی و اسلامی علوم کا ایک خزانہ بنا دیا۔ نواب حامد علی خاں خود بھی شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ ان کے ذوقِ شاعری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے 'رشک' تخلص کیا اور برصغیر کے معروف شاعر امیر مینائی کے فرزند محمد احمد صریر مینائی کی شاگردی اختیار کی۔ یہ شاگردی اس بات کی عکاس ہے کہ نواب حامد علی خاں صرف رسمی سرپرستی تک محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے ادب کو براہِ راست اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی شاعری میں نہ صرف روایت کی جھلک تھی بلکہ ایک مخصوص نفاست اور لطافت بھی موجود تھی جو انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی تھی۔ نواب حامد علی خاں کی علمی و ادبی سرپرستی میں مصطفیٰ علی خاں شرر کا بھی بڑا اہم کردار تھا جو ان کے پرائیویٹ سکریٹری کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ مصطفیٰ علی خاں شرر ایک نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والے شخصیت تھے اور ان کے مشورے اور انتظامات نے نواب حامد علی خاں کے دَور میں علمی و ادبی سرگرمیوں کو مزید تقویت دی۔

نواب حامد علی خاں کا ذوقِ تعمیر بھی بے مثال تھا۔ ان کے عہد میں رام پور کی کئی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر ہوئی جن میں رام پور قلعہ، خاص باغ پیلس، حامد منزل (موجودہ رضا لائبریری)، صدر کچہری، شاہ آباد محل، کیسل (Castle)، مچھلی بھون، جامع مسجد اہم ہیں جو آج بھی شہر رام پور کی پہچان ہیں۔ یہ عمارتیں نہ صرف معمارانہ حسن کا نمونہ ہیں بلکہ ان میں مغل اور نوابی طرزِ تعمیر کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ تمام تعمیرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ نواب حامد علی خاں محض ایک نواب نہیں بلکہ ایک دوراندیش معمار بھی تھے جو اپنی ریاست کو ایک جدید اور شاندار طرزِ تعمیر سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے شاندار ذوقِ تعمیر کو دیکھتے ہوئے انھیں 'شاہجہاں ثانی' کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح مغل بادشاہ شاہجہاں نے ہندوستان میں تاج محل، لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور دیگر شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں، اسی طرح نواب حامد علی خاں نے رام پور میں ایسی یادگار عمارتوں کی تعمیر کروائی جو آج بھی فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ نواب حامد علی خاں نہ صرف ادب اور تعمیرات کے سرپرست تھے بلکہ وہ فنِ موسیقی کے بھی بڑے قدردان تھے۔ ان کے دربار میں ہندوستان کے معروف موسیقار، گلوکار اور سازندے موجود تھے جن کی محافلِ موسیقی ریاست رام پور کی ایک پہچان بن چکی تھیں۔

نواب حامد علی خاں کے انتقال کے بعد نواب رضا علی خاں بہادر (1930 تا 1966) نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو ان کے دَور میں بھی رضا لائبریری کی ترقی کا سفر جاری رہا۔ نواب رضا علی خاں کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے رضا لائبریری کو عوام کے لیے کھول دیا۔ یہ وہ تاریخی فیصلہ تھا جس نے اس نایاب علمی ذخیرے کو عام لوگوں کے لیے قابلِ رسا بنا دیا۔ اس سے قبل رضا لائبریری صرف مخصوص طبقے کے لیے مخصوص تھی لیکن نواب رضا علی خاں نے اسے ہر خاص و عام کے لیے کھول کر علم کے فروغ میں ایک شاندار قدم اٹھایا۔ نواب رضا علی خاں نے تعلیم کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ رام پور میں تعلیمی ادارے نہ صرف قائم کیے جائیں بلکہ ان میں جدید اور معیاری تعلیم کا اہتمام بھی کیا جائے۔ انھوں نے طلبا اور طالبات کے لیے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے تاکہ تعلیم کا دائرہ وسیع ہو اور ہر طبقے کے لوگ تعلیمی روشنی سے مستفید ہو سکیں۔ یہ اقدام نہ صرف ریاست کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے میں مددگار ثابت ہوا بلکہ اس نے رام پور کو ایک علمی و تعلیمی مرکز میں بھی تبدیل کر دیا۔ نواب حامد علی خاں کے عہد کو اگرچہ نوابینِ رام پور کے شاندار ادوار کے تسلسل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس کا ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ ان کا عہد جدید دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی تغیرات کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب

> **رضا لائبریری میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو ہندوستان اور دیگر ممالک کے درمیان تاریخی تعلقات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ کتابیں عالمی تعلقات، سفارت کاری اور ثقافتی روابط کو مزید مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان میں قدیم سفرنامے، تاریخی معاہدے، خطوط اور دیگر ایسی دستاویزات شامل ہیں جو بین الاقوامی تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔**

پوری دنیا میں سیاسی اور اقتصادی حالات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ برصغیر میں بھی سماجی، تعلیمی، صنعتی اور ثقافتی سطح پر ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ نواب رضا علی خاں نے نہ صرف ان تغیرات کو محسوس کیا بلکہ اپنی ریاست کی ترقی و خوشحالی کے لیے ہر ممکن اقدام کیا تاکہ رام پور ایک جدید، خوشحال اور ترقی یافتہ ریاست کے طور پر ابھر سکے۔

1947 میں ہندوستان نے آزادی حاصل کی، اس کے بعد 1949 میں ریاست رام پور کو صوبہ اتر پردیش میں ضم کر دیا گیا۔ نواب رضا علی خاں جو علم و ادب کے سچے قدردان تھے انھوں نے اس نایاب کتب خانے کو قوم کے نام وقف کر دیا۔ اس وقت یہ کتب خانہ ''اسٹیٹ لائبریری'' کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن ریاستی انضمام کے بعد اس کا نام بدل کر ''رام پور رضا لائبریری'' رکھ دیا گیا تاکہ یہ صرف ایک مخصوص ریاستی اثاثہ نہ رہے بلکہ پورے ملک کے علمی و تحقیقی میدان میں روشنی بکھیر سکے۔ 1951 میں اس لائبریری کے مؤثر انتظام کے لیے ایک باقاعدہ ٹرسٹ قائم کیا گیا اور تمام مالی اخراجات اتر پردیش حکومت نے اپنے ذمے لے لیے۔ یہ اقدام رضا لائبریری کو مزید استحکام اور ترقی دینے کے لیے کیا گیا تھا تاکہ علمی سرمایہ کسی بھی معاشی رکاوٹ کی وجہ سے متاثر نہ ہو۔ 1957 میں رضا لائبریری کو ایک نئی وسیع اور شاندار عمارت میں منتقل کیا گیا جسے 'حامد منزل' کے نام سے جانا گیا۔ یہ خوبصورت محل نما عمارت نواب حامد علی خاں نے 1905 میں ایک شاندار رہائش گاہ کے طور پر تعمیر کرائی تھی۔

نواب رضا علی خاں بہادر کی حکومت میں مولانا محمد نجم الغنی خاں (مصنف اخبار الصنادید) کو لائبریری کا ناظم مقرر کیا گیا۔ نجم الغنی خاں کی انتظامی صلاحیتوں اور علمی دلچسپیوں کی بدولت رضا لائبریری کا ذخیرہ مزید نایاب کتب و مخطوطات سے مالا مال ہوا۔

1932 میں مولوی نجم الغنی خاں کے انتقال کے بعد مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو لائبریری کا ناظم مقرر کیا گیا جو رضا لائبریری کی تاریخ میں سب سے مشہور اور قابلِ ذکر ناظم کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ عرشی صاحب نہ صرف ایک عظیم محقق، ادیب اور عالم تھے بلکہ ان کی علمی و ادبی خدمات نے رضا لائبریری کی عظمت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے نادر مخطوطات کی ترتیب و تدوین، فہرست سازی، اور تحقیق کے اصولوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے علمی کارنامے صرف رضا لائبریری تک محدود نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ 1975 میں سابق وزیر تعلیم پروفیسر نور الحسن کی کوششوں سے رضا لائبریری کو ہندوستان کے قومی ادارے کی حیثیت دے دی گئی۔ اس مقصد کے لیے حکومتِ ہند نے پارلیمنٹ میں ایک باقاعدہ قانون (ایکٹ) پاس کیا جس کے تحت یہ لائبریری مرکزی حکومت کے زیر انتظام آ گئی۔ یہ ایک اہم تاریخی پیش رفت تھی کیونکہ اس کے نتیجے میں رضا لائبریری کو قومی سطح پر تسلیم شدہ علمی ادارے کا درجہ حاصل ہو گیا اور اس کے انتظامات کو مزید مستحکم کرنے کے لیے حکومت نے خصوصی اقدامات کیے۔

رضا لائبریری میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو ہندوستان اور دیگر ممالک کے درمیان تاریخی تعلقات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ کتابیں عالمی تعلقات، سفارت کاری اور ثقافتی روابط کو مزید مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان میں قدیم سفرنامے، تاریخی معاہدے، خطوط اور دیگر ایسی دستاویزات شامل ہیں جو بین الاقوامی تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ آج کے جدید دور میں جہاں علم کی ترسیل تیزی سے ڈیجیٹل دنیا میں منتقل ہو رہی ہے، رضا لائبریری کو بھی ڈیجیٹلائزیشن کے ذریعے مزید وسعت دی جا رہی ہے تاکہ اس علمی ورثے کو زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچایا جا سکے۔ حکومت اور دیگر علمی ادارے اس لائبریری کی ڈیجیٹل آرکائیو بنانے پر کام کر رہے ہیں تاکہ نادر کتابیں اور مخطوطات ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ سکیں۔

رضا لائبریری کا اپنا ایک گیسٹ ہاؤس بھی ہے جہاں آنے والے محققین، اسکالرز اور دیگر علمی و تحقیقی شخصیات کو قیام و طعام کی بہترین سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ اقدام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ ادارہ محققین اور دانشوروں کے لیے ایک ایسا مرکز بن چکا ہے جہاں وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے علمی و تحقیقی کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ رضا لائبریری ایک ایسا علمی و ثقافتی ادارہ ہے جو نہ صرف کتابوں اور مخطوطات کے تحفظ اور اشاعت میں سرگرم عمل ہے بلکہ علم و تحقیق کے فروغ کے لیے قومی و بین الاقوامی سیمینارز بھی منعقد کرتا ہے۔ یہ سیمینار دنیا بھر کے نامور محققین، ادیبوں، مؤرخین اور دانشوروں کو ایک پلیٹ فارم فراہم کرتے ہیں جہاں وہ علمی مباحثے اور تحقیقی تبادلہ خیال کر سکیں۔

رضا لائبریری جدید دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتب خانوں، تحقیق، لائبریری سائنس اور آرکائیو مینجمنٹ کے حوالے سے وقتاً فوقتاً ورکشاپس کا بھی انعقاد کرتی ہے۔ ان ورکشاپس میں محققین، لائبریرینز، اساتذہ اور طلبا شرکت کرتے ہیں اور کتب خانوں کے جدید نظام، ڈیجیٹائزیشن اور تحقیقی وسائل تک رسائی کے جدید طریقوں پر تبادلہ خیال کیا جاتا ہے۔ رضا لائبریری نہ صرف ایک علمی مرکز ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی و تاریخی ورثے کا بھی امین ہے۔ اسی لیے یہاں مختلف نوعیت کی نمائشوں کا انعقاد کیا جاتا ہے تاکہ نایاب تاریخی اور ثقافتی اشیاء کو عوام کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

ماخذ و مصادر

1 کتابوں کا تاج محل رام پور رضا لائبریری: مولانا امتیاز علی عرشی، رضا لائبریری کی علمی وراثت، 1996،

2 رضا لائبریری کے 250 سال: معصوم مرادآبادی، قندیل، 9 دسمبر 2023۔

3 شبیر علی خاں شکیب، رام پور کا دبستانِ شاعری، 1999

4 ''کتابوں کا تاج محل رام پور رضا لائبریری'': مولانا امتیاز علی عرشی، رضا لائبریری کی علمی وراثت، 1996،

5 رضا لائبریری رام پور: عابد رضا بیدار، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رام پور، 1996

■

Nishat Jameel
D/O Late Jameel Ahmad Moh.
Bandukchiyan,
Ahmad Ali Road, Dhampur,
Bijnor - 246761
Mob. +91 9105986129
e-mail : nishatjameel3322@gmail.com

اڈیشا میں
اردو کا ماضی، حال اور مستقبل

شاداب عالم

اڑیسہ (اب اڈیشا) ہندوستان کا ایک ایسا صوبہ ہے جو اپنے رقبے کے اعتبار سے آٹھویں اور آبادی کے لحاظ سے گیارہویں مقام پر ہے، یہ تنوع کے اس گلستان کی مانند ہے جس میں مختلف زبان و ثقافت کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں اڑیا کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، لیکن اس زرخیز زمین پر اڑیا کے علاوہ اردو، ہندی، تیلگو، بنگالی اور قبائلی زبانوں کے بولنے والوں کی بھی نمایاں تعداد موجود ہے جو اس کے تہذیبی کینوس کو اپنی لسانی رنگا رنگی سے مزید دلکش اور خوش نما بناتے ہیں۔ اگر تاریخ کے جھروکوں میں جھانکیں تو اڈیشا کی سرزمین کو مدتوں تک سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر پس ماندہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ البتہ یہاں مغلوں کے دور حکومت سے اردو کا وجود ہے۔ جب مغلوں نے اڈیشا کو زیرنگیں کر لیا تو ہزاروں کی تعداد میں فوجی یہیں آباد ہو گئے جس میں اکثریت بہار اور بنگال کے مسلمانوں کی تھی جن کی مادری زبان اردو تھی اور یوں یہاں یہ زبان پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ مقامی زبانوں اور تہذیبوں کے اختلاط کے نتیجے میں اڈیشا کی اردو نے ایک منفرد رنگ و آہنگ اختیار کیا، جو آج بھی اپنی جداگانہ دلکشی کے ساتھ قائم ہے۔

اڈیشا کی اردو میں اگرچہ دہلی اور لکھنؤ کی نفاست اور شائستگی تو نہیں پائی جاتی ہے لیکن اس میں مقامی تہذیب کی خوشبو اور روایات کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ زبان یہاں کے مسلمانوں کے لیے نہ صرف اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ ان کی تہذیبی پہچان، روایتی اقدار اور ثقافتی ورثے کی امین بھی ہے۔ اردو، اڈیشا کی دھرتی پر ایک زندہ روایت کے طور پر صدیوں سے پنپ رہی ہے اور آج بھی یہاں کے باشندوں کی تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ یہاں اردو کی روایت مستحکم ہوئی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اڈیشا میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار الفاظ تیزی کے ساتھ اڑیا زبان میں شامل ہونے لگے۔ حفیظ اللہ نیولپوری لکھتے ہیں:

”اردو اور فارسی کی اڑیسہ میں مقبولیت کی نشاندہی فقیر موہن سیناپتی اور رادھا ناتھ رائے کی اڑیا تخلیقات سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے ان کے ہمعصر شعرا و ادبا نے بھی اڑیا زبان میں بے تکلفی کے ساتھ بے شمار اردو، فارسی اور ترکی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بعد میں تو اردو فارسی الفاظ اڑیا زبان کا حصہ بن گئے اور آج اڑیا لغات میں دو ہزار سے زیادہ اردو، فارسی اور عربی الفاظ ملتے ہیں جنھوں نے اڑیا زبان میں اپنا مستقل مقام بنا لیا ہے۔ اڑیسہ کی عدالتوں اور کچہریوں میں جو محرر، استغاثے اور قبالے وغیرہ اڑیا زبان میں لکھتے ہیں ان پر بھی اردو فارسی کے اثرات واضح ہیں۔“ (اڑیسہ میں اردو، ص 33)

2011 کی مردم شماری کے مطابق اڈیشا میں 2.17 فیصد باشندوں کی مادری زبان اردو ہے۔ 1902 سے اردو اور فارسی زبانیں یہاں کے تعلیمی نظام کا باقاعدہ حصہ ہیں جبکہ صوبہ اڈیشا 1936 میں اڑیا زبان کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ اگرچہ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کم ہے، لیکن تعلیمی میدان میں ان کی کارکردگی قدرے تشفی بخش ہے۔ آبادی کے تناسب میں اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد آج بھی متوازن اور حوصلہ افزا ہے۔ حالانکہ ماضی میں تو اڈیشا کی ادبی فضا کبھی بہت شاندار نہیں رہی ہے لیکن کچھ عاشقانِ اردو نے ادب کی شمع ضرور جلائے رکھی۔ ہردے رام جودت کو اڈیشا کا اولین اردو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ مولوی محمد سلطان راجی ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کی کاوشیں منثور اور منظوم دونوں اصناف میں پائی جاتی ہیں۔ شیخ امین اللہ چرخی متوفی (1879) اڈیشا کے اوّلین صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں جبکہ عبدالمجید بھوئیاں حیا نے 1871 میں 'دیوان مجید' ردیف وار مرتب کیا۔ اڈیشا کی پہلی شاعرہ فیض النسا تسخیر (ولادت 1866) ہیں۔ ان کے علاوہ امجد نجمی بیسویں صدی کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ان کا ضخیم کلیات 'کلیات نجمی' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

گزشتہ پانچ سالوں میں یہاں کے دو بڑے ادیب محمود بالیسری (ف، 31 اپریل 2020) اور پروفیسر کرامت علی کرامت (ف، 5 اگست 2023) اس دنیا سے رخصت ہو گئے جو کہ اڈیشا کا بہت بڑا خسارہ ہے۔ ان دونوں کی زندگیاں اڈیشا کی علمی و ادبی ضرورتوں کی ضامن تھیں۔ لیکن موت کے بادِ صرصر کا ہاتھ ان چراغوں کو گل کر چکا ہے تو اڈیشا کے مستقبل کا منظر کس قدر اندھیرا اور بھیانک نظر آتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ کرامت علی کرامت نے تو ادب کی مختلف جہتوں کو روشن کیا۔ شاعری، افسانے، تنقید، اضافی

تنقید، مضامین، ترجمے، اداریے اور رسائل وغیرہ ان کے ادبی حوالے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد کے معتبر ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کرامت علی کرامت کی کاوشوں کی بارہا پذیرائی کی ہے۔ فاروقی ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’جناب کرامت علی کرامت اپنی بلند پایہ تنقیدوں کی وجہ سے آسمان ادب پر ایک بادل بن کر چھا گئے ہیں۔ ان کے خیالات سے اختلاف ممکن ہے لیکن انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تنقید کی دنیا میں ان کی شہرت کے پیش نظر ان کے مجموعہ کلام ’شعاعوں کی صلیب‘ کا اہل ذوق کو انتظار تھا۔‘‘ (شاخ صنوبر، ص243)

کرامت علی کرامت فن کی تقدیس کے ساتھ علم و عمل کی سربلندی سے اردو، اردو کے رسالوں اور اداروں کو سرخرو کرتے رہے جبکہ وہ علم ریاضی (Mathematics) کے پروفیسر تھے۔ ان کی زیر نگرانی کئی اسکالروں کو اردو میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں بھی تفویض ہوئیں۔ اس اعتبار سے بھی وہ لائق احترام ہیں کہ اڈیشا جیسے غیر اردو علاقے میں اردو کی شمع جلائے رکھی۔ نہ تو پاؤں کو لغزش ہوئی اور نہ احساس و خیال میں وسوسوں نے راہ پائی۔ فکر وفن کی قندیل کو تا بہ مقدور سنبھال کے رکھا اور اردو کے مرکز سے دور افتادہ علاقے کو شاداب و آباد کرتے رہے۔

اردو اخبارات و رسائل: اڈیشا میں اردو کی نشو نما میں اردو اخبارات و رسائل کا اہم کردار رہا ہے۔ کٹک سے نکلنے والا ماہنامہ المنصور چند شماروں تک ہی جاری رہ سکا اور آج اس کی کاپیاں بھی ناپید ہوگئیں، 3 جون 1937 کو ہفتہ وار گزٹ نکلنا شروع ہوا، یہ اڈیشا کے اردو داں طبقے میں خاصا مقبول بھی ہوا لیکن مالی تنگی کی وجہ سے زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا، اسی طرح ہفتہ وار ’جدید‘ اور ہفتہ وار ’بیداری‘ بھی اشاعت پذیر ہو کر دم توڑ چکے ہیں لیکن جب شاخسار جون، 1965 میں نکلنا شروع ہوا تو تمام نامساعد حالات کے باوجود یہ رسالہ ہندو پاک کے تمام بڑے ادیبوں کا مرکز توجہ ثابت ہوا۔ آخر کار یہ بھی مئی 1973 میں مالی بحران کی وجہ سے شائع ہونا بند ہوگیا۔ فی الحال ماہنامہ ’صدائے اڑیسہ‘، سہ ماہی رسالہ ’ادبی محاذ‘، سہ ماہی رسالہ ’فروغ ادب‘ اور یک روزہ اخبار ’اخبار نامہ‘ اشاعت کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔

ادبی و ثقافتی تنظیمیں اور ادارے: اڈیشا میں اردو کے ارتقا میں یہاں کے ادبی و ثقافتی اداروں نے بھی اہم

اردو زبان کے فروغ میں اڈیشا کے تعلیمی اداروں نے اہم خدمات انجام دی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک اسکولوں میں اردو کی تدریس نہیں ہوگی تو اردو کا احیا ممکن نہیں ہے۔ اڈیشا میں پہلے کئی اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم اردو ہوا کرتا تھا۔

کارنامے انجام دیے ہیں جن میں بزم ادب کٹک (1921)، بزم سخن اڈیشا، کٹک (1954)، بزم ظرافت کٹک، انجمن اکیڈمی کٹک، گلشن ادب سونگڑہ، سنگم لٹریری سوسائٹی بھدرک، بزم اخلاق بالیسری، بھدرک غالب اکیڈمی، بزم اردو راورکیلا وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن ان میں سے اکثر تنظیمیں اپنی خدمات انجام دے کر ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ فی الحال فیضان ادب، پرواز سخن، بزم اردو راورکیلا، یہ تینوں تنظیمیں کافی فعال ہیں اس کے علاوہ اڈیشا اردو اکادمی بھی کافی متحرک ہے جو ادبی و تہذیبی مذاکرے اور مشاعرے گاہے گاہے منعقد کرتی رہتی ہے۔

اردو تعلیم و تدریس: اردو زبان کے فروغ میں اڈیشا کے تعلیمی اداروں نے اہم خدمات انجام دی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک اسکولوں میں اردو کی تدریس نہیں ہوگی تو اردو کا احیا ممکن نہیں ہے۔ اڈیشا میں پہلے کئی اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم اردو ہوا کرتا تھا۔ فی الحال صرف جھارکھنڈ سے متصل قصبہ راورکیلا، ضلع سندرگڑھ میں یہ سلسلہ باقی ہے۔ خوش آئند بات ہے کہ یہاں پرائمری سے ہشتم تک کل آٹھ اردو میڈیم اسکول اور تین دسویں جماعت تک اردو میڈیم اسکول چلتے ہیں۔ ویسے تو پورے اڈیشا میں تقریباً 803 ایسے پرائمری اسکولوں میں اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ تقریباً سولہ سو (1600) اردو اساتذہ ان اسکولوں سے وابستہ رہتے ہیں۔ اسی طرح Mass Educaton (ME) کے تحت 75 اسکولوں میں اردو کے اساتذہ مقرر ہیں۔ صوبہ اڈیشا کے کل تیس اضلاع میں سے گیارہ ضلعوں میں 180 ہائی اسکول میں 196 اردو اور فارسی کے اساتذہ تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں فی الحال ہائی اسکول میں 25 سے زیادہ اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔

سرکاری مدارس: آزادیٔ وطن سے قبل اڈیشا کا اردو تعلیمی نظام بہار کے مدرسہ شمس الہدیٰ بورڈ، پٹنہ سے ملحق تھا۔ یہاں تک کہ امتحانات کے سوالات بھی پٹنہ سے بن کر آیا کرتے تھے حالانکہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اسٹیٹ بورڈ آف مدرسہ ایجوکیشن، بھونیشور کے تحت کل 167 سرکاری مدارس وابستہ ہیں، جن میں دینی تعلیم کے ساتھ کچھ عصری مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ ان مدارس میں کل تقریباً 775 اساتذہ تدریسی و تعلیمی فرائض انجام دیتے ہیں۔ فی الحال اڈیشا کے مختلف مدارس میں تقریباً سو سے زائد جگہیں خالی پڑی ہیں۔

کالج اور یونیورسٹی: اڈیشا کے پانچ سرکاری اور سات نیم سرکاری (Non-Government-Added) ڈگری کالجوں اور دو یونیورسٹیوں میں کل پچیس اردو کی منظور شدہ پوسٹ ہیں، وہ کئی برسوں سے خالی پڑی ہیں۔

گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تعلیم: پورے اڈیشا میں صرف سات کالجوں میں بی۔ اے آنرز کے کورسیز میں اردو پڑھانے کا بندوبست ہے بقیہ کالجوں میں لسانی فارمولے یعنی Modern Indian (MIL) Languages (جدید ہندوستانی زبانوں) کے تحت اردو ایک اختیاری یا لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے جبکہ صرف دو اداروں میں ایم۔ اے اردو کی تعلیم و تدریس کا نظم ہے۔ ایک بھدرک کی پی۔ جی آٹونمس کالج جو کہ بھدرک شہر میں واقع ہے۔ اڈیشا کے تیس اضلاع میں اردو تعلیم و تدریس کے لیے پہلے نمبر پر ضلع بھدرک کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرا شعبۂ زبان و ادب، فقیر موہن یونیورسٹی، بالاسور میں قائم ہے۔ یہاں ایم۔ اے کے ساتھ ساتھ پی ایچ۔ ڈی میں بھی داخلے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایم۔ اے کے درجات میں طالب علموں کی تعداد اطمینان بخش نہیں ہوتی ہے۔ لسانی سطح پر تقریباً پورے اڈیشا میں اردو کا معیار

تشفی بخش نہیں ہے لب ولہجے کی بات تو دور رہی، تلفظ کا معاملہ بھی خاصا کمزور ہے۔ یہ حال صرف طلبہ کا نہیں ہے بلکہ بیشتر اساتذہ بھی اس سے مبرّا نہیں ہیں۔ ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر طالب علموں کا تلفظ، املا، جملہ اور منجملہ سب درست کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ فقیر موہن یونیورسٹی کا شعبۂ زبان وادب تین زبانوں - اڑیا، انگریزی اور اردو پر مشتمل ہے۔ سابق شیخ الجامعہ، پروفیسر سیبا پرساد ادھیکاری کے بصیرت افروز اقدامات کے نتیجے میں شعبے میں ایک جامع نصاب متعارف کیا گیا، جس میں ایک مشترکہ مضمون شامل ہے جو تینوں زبانوں کے طلبہ کو پہلے سمسٹر میں پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔ یہ نصاب بلاشبہ بین المضامین مطالعے (Interdisciplinary Studies) کو فروغ دیتا ہے اور طلبہ کو تینوں زبانوں کی مبادیات سے روشناس ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ یہ اقدام نہ صرف زبانوں کے فروغ میں معاون ہے بلکہ مختلف ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی اور روابط کو مضبوط کرنے میں بھی اہم ہے۔ یہ شعبہ غیر اردو علاقے میں قابل ستائش خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس طرح ہر سال تقریباً 140 اڑیا اور 24 انگریزی میں ایم۔اے کرنے والے طلبہ وطالبات اردو زبان کی مبادیات یعنی حروف تہجی، اردو کی مختصر تاریخ، میر، غالب اور جوش کے چند کلام اور پریم چند کے چند افسانوں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح فقیر موہن یونیورسٹی کا شعبۂ زبان وادب نہ صرف اڈیشا بلکہ ہندوستان کے پورے تعلیمی منظرنامے میں ایک مثالی مرکز کے طور پر اپنی منفرد شناخت قائم کر چکا ہے۔ اس کی واحد وجہ ہے کہ فقیر موہن یونیورسٹی کے انتظامیہ کا اردو کے تئیں دوستانہ رویہ ہے، جبکہ اس کے برعکس راونشا یونیورسٹی، کٹک انتظامیہ کا رویہ غیر مناسب ہے، حالانکہ حکومت اڈیشا کی ایما پر نومبر 2021 میں اردو کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر کا تقرر ہو چکا ہے۔ گریجویشن اور پی ایچ۔ڈی کے نصابات بھی تقریباً ڈھائی سال قبل تیار ہو چکے ہیں، مگر تاحال راونشا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو فعال (Functional) نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار سال کے عرصے میں ایک بار بھی گریجویشن میں داخلے کے لیے یونیورسٹی نے اشتہار شائع نہیں کیا ہے البتہ ایک سال قبل صرف پی ایچ۔ڈی میں داخلے کے لیے اشتہار شائع کیا گیا۔ تحریری امتحانات منعقد ہوئے اور دس طلبہ نے اس میں شرکت کی، لیکن اسکریننگ کے بعد زبانی امتحان ابھی تک زیر التوا ہے۔

اڈیشا اردو اکادمی: اڈیشا اردو اکادمی کا قیام 7 رفروری 1987 کو عمل میں آیا۔ اس کے حالیہ سابق سیکرٹری، ڈاکٹر سید مشیر عالم اپنی سربراہی میں محدود وسائل کے باوجود کچھ تعمیری اور قابل ستائش خدمات انجام دے رہے ہیں، جو محبان اردو کے لیے باعث فخر اور لائق تحسین ہیں۔ ان کے دور میں اکادمی نے قدیم مخطوطات

> سہ لسانی پالیسی کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ مادری زبانوں کی تدریس کے لیے باقاعدہ اساتذہ کا تقرر کیا جائے تاکہ آئینی تقاضے پورے ہوں، لسانی وثقافتی تنوع کو قومی سرمایے کا درجہ ملے، وفاقی یکجہتی کو تقویت حاصل ہو اور احساسِ محرومی کے تدارک کو یقینی بنایا جا سکے۔

سمیت 23 کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکولوں اور مدارس میں تدریسی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے وقتاً فوقتاً اساتذہ کے لیے تربیتی پروگراموں کا انعقاد کیا۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اکادمی ہر سال مضمون نویسی کے مقابلے منعقد کرتی ہے جن میں اڈیشا کے مختلف کالجوں اور جامعات کے طلبہ وطالبات کثیر تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ مضمون نویسی کے مقابلے میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامی رقوم اور اسناد سے نوازا جاتا ہے، جبکہ انعام یافتگان کی مزید حوصلہ افزائی کے لیے اکادمی اپنا رسالہ 'فروغ ادب' ایک سال کے لیے مفت جاری کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اکادمی بارہویں جماعت، گریجویشن اور ایم۔اے اردو کے طلبہ وطالبات کو تعلیمی وظائف بھی فراہم کرتی ہے تاکہ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیاں بہتر انداز میں جاری رکھ سکیں۔ اڈیشا اردو اکادمی غیر اردو علاقے میں وقتاً فوقتاً سیمینار، ادبی اور ثقافتی پروگرام جیسے مشاعرے، شام غزل اور قوالی کے انعقاد کا اہتمام کرتی ہے جو اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے قابل تحسین اقدامات ہیں۔

جس طرح اردو زبان کو پورے ہندوستان میں مسائل کا سامنا ہے، اسی طرح اڈیشا میں بھی یہی مشکلات درپیش ہیں۔

سرکاری سطح پر عملی اقدامات کی ضرورت:

1. بی۔ایڈ میں داخلے کے لیے غیر منصفانہ شرط کا خاتمہ: بی۔ایڈ کورس میں داخلے کے لیے میٹرک میں اڑیا پاس ہونے کی شرط اردو طلبہ کے لیے غیر ضروری رکاوٹ ہے۔ حالانکہ وہ نان لینگویج سبجیکٹ کے طور پر اڑیا کا امتحان پاس کر چکے ہوتے ہیں۔ اس شرط کی تنسیخ کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔

2. اردو اساتذہ کی تقرری میں ترمیم: محکمۂ تعلیم نے اسکول میں اساتذہ کی بحالی کا جو ضابطہ تیار کیا ہے اس میں ترمیم کی اشد ضرورت ہے۔ OSSTET کے ضابطے کے مطابق کلاسیکل اردو ٹیچر کی تقرری کے لیے صرف عالم کے ساتھ بی۔ایڈ یا بی۔اے فارسی کے ساتھ بی۔ایڈ کو اہل قرار دیا گیا ہے، جب کہ بی۔اے اردو کے ساتھ بی۔ایڈ کی شرائط کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس پالیسی میں فوری ترمیم کر کے بی اے اردو مع بی ایڈ کو بھی شامل کیا جائے تاکہ اہل امیدواروں کو مساوی مواقع مل سکیں۔

3. اردو خواں اضلاع میں اردو افسران کا تقرر: جہاں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد قابل ذکر ہے وہاں اردو افسران کی تعیناتی ناگزیر ہے تاکہ اردو کے فروغ اور انتظامی امور میں زبان کو اس کا جائز مقام دیا جا سکے۔

4. سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو اساتذہ کی تقرری: سہ لسانی پالیسی کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ مادری زبانوں کی تدریس کے لیے باقاعدہ اساتذہ کا تقرر کیا جائے تاکہ آئینی تقاضے پورے ہوں، لسانی وثقافتی تنوع کو قومی سرمایے کا درجہ ملے، وفاقی یکجہتی کو تقویت حاصل

ہواور احساسِ محرومی کے تدارک کو یقینی بنایا جاسکے۔

5. اردو نصابی کتابوں کی بروقت دستیابی: ابتدائی درجات سے لے کر بارہویں جماعت تک اردو نصاب کی کتابیں بروقت فراہم کی جائیں تاکہ تعلیمی تسلسل برقرار رہے۔

6. سبکدوش اساتذہ کی جگہ نئی تقرریاں: جو اردو اساتذہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں ان کی جگہ فوری تقرریاں یقینی بنائی جائے تاکہ تدریسی خلا پیدا نہ ہو۔

7. کئی اہم کالجوں میں طلبہ کی معقول تعداد کے باوجود اردو اساتذہ میسر نہیں جس کے نتیجے میں طلبہ بغیر استاد کے Modern Indian Languages(MIL) (جدید ہندوستانی زبانوں) کے تحت ایک اختیاری یا لازمی مضمون کے طور پر اردو پڑھنے پر مجبور ہیں۔ ایسے میں تدریس کا معیار متاثر ہوتا ہے اور طلبہ کی تعلیمی ترقی بھی رک جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اداروں میں اردو اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنایا جائے۔ خاص طور پر کے۔ ایس کالج (بالاسور)، سورو کالج (بالاسور)، بلانگی کالج (بالاسور)، ریموند کالج (ریموند، بالاسور) اور سندرگڑھ کالج (سندرگڑھ) جیسے تعلیمی اداروں میں فوری تقرریاں کی جائیں تاکہ اردو کے فروغ کی راہ ہموار ہو اور طلبہ ایک مستحکم تعلیمی ماحول میں اپنی تعلیم مکمل کرسکیں۔

8. بھدرک آٹونمس کالج میں پی۔ جی سطح پر اردو کی کوئی منظور شدہ اسامی موجود نہیں حالانکہ یو۔ جی اور پی۔ جی کے لیے مجموعی طور پر کم از کم سات اسامیوں پر تقرر ہونا چاہیے۔ فی الوقت یو۔ جی سطح پر صرف تین اسامیاں منظور شدہ ہیں مگر افسوس کہ ان پر بھی پچیس سالوں سے کوئی مستقل تقرر نہیں ہوا ہے۔ یہ صورت حال اردو تعلیم کے مستقبل کے لیے ایک سنگین مسئلہ ہے، جسے فوری پر کرنے کے لیے مثبت اقدام کیے جائیں۔

مقامی سطح پر اردو کے مسائل کا اجتماعی حل:

1. تعلیمی اداروں میں تقریری، تحریری، غزل خوانی، خطاطی اور بیت بازی کے مقابلے منعقد کیے جائیں۔ ساتھ ہی میر، غالب، اقبال، فیض، فراق، پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی جیسے نامور شعرا و ادبا کی یوم پیدائش پر خصوصی تقاریب ہوں، جن میں غیر اردو داں طلبہ کی شرکت کو بھی یقینی بنایا جائے۔

2. اردو رضاکاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی معقول تعداد ہے وہاں اردو اساتذہ کی نئی اسامیاں منظور کرانے کے لیے سرگرم ہوں، اس مقصد کے لیے متعلقہ کالجوں کے پرنسپل صاحبان کے توسط سے متعلقہ حکومت اور افسران سے تحریری مطالبات کیے جائیں تاکہ اردو بطور اختیاری اور لازمی مضمون پڑھانے کے

> **یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ جو زبان زمانے کے چیلنجز کا سامنا نہیں کرتی وہ مردہ ہو جاتی ہے اور جو تہذیب اس زبان سے وابستہ ہوتی ہے وہ بھی زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ لہذا اڈیشا ہی نہیں بلکہ پورے بر صغیر میں اُردو صرف ہمارے ماضی کی میراث نہیں بلکہ حال کی آئینہ دار اور مستقبل کی شناخت ہے۔ اس لیے ہر اہل اردو اور صاحب ذوق پر اس کی بقا اور حفاظت لازم ہے۔**

لیے اساتذہ کی تقرری ممکن ہو سکے۔ خاص طور پر سہ لسانی فارمولے کے تحت جہاں جہاں طلبہ خود سے اُردو پڑھنے پر مجبور ہیں ان کے لیے تعلیمی و تدریسی مواقع کو ہموار کیا جائے۔

3. اردو مسائل کے حل کے لیے کمیٹی کی تشکیل: اڈیشا اردو اکادمی کے ممبران اور دیگر محبانِ اردو پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اردو تدریس کے مسائل، اساتذہ کی کمی اور طلبہ کی مشکلات کے حل کے لیے متعلقہ حکام سے مسلسل رابطہ قائم رکھے۔

4. اڈیشا اردو اکادمی اور اردو رضاکاروں کو چاہیے کہ وہ ریاستی سطح پر اردو اساتذہ کی فہرست مرتب کریں تاکہ اعلیٰ تعلیمی درجات کے لیے رجسٹر تیار کیا جائے۔ اس اقدام سے نہ صرف اردو اساتذہ کی قلت یا عدم دستیابی کا صحیح اندازہ ہوگا بلکہ اردو تدریس کے فروغ کے لیے درست حکمتِ عملی طے کی جاسکے گی اور اس زبان کو موثر انداز میں فروغ دیا جاسکے گا۔

5. حکومتی سطح پر کہا جاتا ہے کہ اڈیشا میں اردو پڑھنے والے طلبہ ہی نہیں ہیں حالانکہ زمینی حقیقت اس کے برعکس ہے لہٰذا انتظامیہ اور پالیسی سازوں کو اس پر توجہ دلانے کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو کی زبوں حالی کا ایک بڑا سبب خود اہلِ اردو ہیں۔ ان کی بے حسی، بے اعتنائی اور غفلت نے بھی اس زبان کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں کا کام کیا ہے۔ ہم خود کو اردو کا وارث سمجھتے ہیں مگر اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دینے سے گریز کرتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اپنے مکانوں، دکانوں اور دفتروں پر بھی اردو تختیاں آویزاں کرنے سے کتراتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری شادیوں اور دیگر تقریبات کے دعوت نامے بھی انگریزی، ہندی یا کسی علاقائی زبان میں چھپتے ہیں۔ دیگر زبانوں میں دعوت نامے چھپنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر افسوسناک امر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ہم اردو رسم الخط کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اُردو پہلے ہی ایک حریف زبان کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔ کم از کم اہل اردو تو اسے حریف و بیگانہ نہ سمجھیں، ورنہ یہ زبان اپنے ہی وطن میں غریب الوطن اور مظلوم ہو کر رہ جائے گی۔ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ جو زبان زمانے کے چیلنجز کا سامنا نہیں کرتی وہ مردہ ہو جاتی ہے اور جو تہذیب اس زبان سے وابستہ ہوتی ہے وہ بھی زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اڈیشا ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں اُردو صرف ہمارے ماضی کی میراث نہیں بلکہ حال کی آئینہ دار اور مستقبل کی شناخت ہے۔ اس لیے ہر اہل اردو اور صاحب ذوق پر اس کی بقا اور حفاظت لازم ہے۔

ماخذ:

1. اڑیسہ میں اردو، حفیظ اللہ نیولپوری
2. فروغ ادب، بھونیشور، اڈیشا اردو اکادمی (اپریل تا جون، 2016)
3. اڈیشا میں اردو شاعری (تذکرہ)، سعید رحمانی
4. شاخ صنوبر۔ کرامت علی کرامت

■

Dr. Shadab Alam
Asst. Professor (Urdu)
P.G. Dept. of Language & Literature,
Fakir Mohan University
Balasore -756089 (Odisha)
Mob: 9968340405
shadabalamjnu@gmail.com

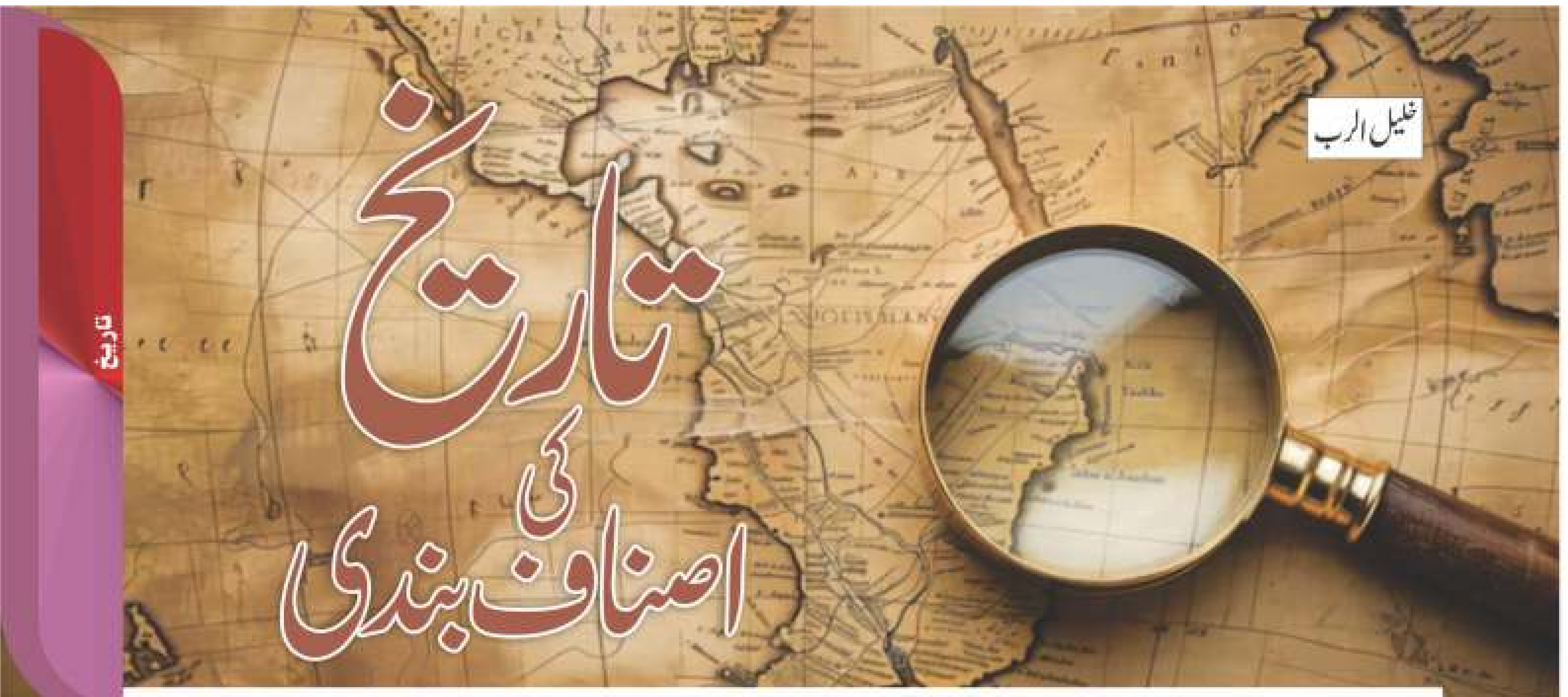

تاریخ کی اصناف بندی

خلیل الرب

پچھلے ابواب میں یہ بات بہ صراحت واضح کی جاچکی ہے کہ تاریخ سے ہماری کیا مراد ہے، اس کے مطالعہ و تدریس کے کیا حدود ہیں اور تشکیل تاریخ میں ماخذ کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں، ان ابواب کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ تاریخ ایک لامحدود مضمون ہے۔ اس کے مطالعہ کا دائرہ نہ تو ارتقائے انسانی کے مختلف مراحل یا قرون تک محدود ہے اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی مخصوص گوشے تک۔ تاریخ ایک نامیاتی وحدت رکھتی ہے جس کی تقسیم معنوی اعتبار سے نہیں کی جاسکتی چونکہ اس ہمہ گیر حیثیت سے تاریخ کا مطالعہ اسکولی مدت کے دوران ممکن نہیں ہے اس لیے تدریس میں سہولت کی خاطر اس کی نمایاں نوعیت اور خصوصیت کی بنا پر اصناف بندی کی جاسکتی ہے۔ موٹے طور پر یہ اصناف بندی تین طریقے سے کی جاسکتی ہے۔:

(الف) باعتبار نوعیت: اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مقامی تاریخ، صوبائی یا علاقائی تاریخ، ملکی تاریخ، طبقاتی تاریخ اور عالمی تاریخ۔

(ب) باعتبار موضوع: سیاسی تاریخ، تمدنی اور ثقافتی تاریخ، موضوعاتی تاریخ، اقتصادی تاریخ اور اجتماعی تاریخ۔

(ج) باعتبار ہیئت: مختصر تاریخ، جامع تاریخ، عمودی تاریخ، افقی تاریخ۔

اس اصناف بندی پر اب ہم ذرا تفصیل سے نظر ڈالیں گے۔

(الف) باعتبار نوعیت

مقامی تاریخ: اگر ہم انسانی تاریخ کا تصور ایک عظیم پریمڈ کی شکل میں کریں اور اس میں سے ایک حقیر ذرہ الگ کرلیں تو اسے مقامی تاریخ کہا جاسکتا ہے۔ مقامی تاریخ لازمی طور پر صرف اس مقام تک محدود نہیں ہے جہاں بچہ کی پیدائش ہوتی ہے یا اس کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اس میں گرد و نواح کی تاریخ بھی شامل ہوتی ہے۔ وہ تمام چیزیں جن سے کچھ پرانی روایات یا قصے کہانیاں منسوب ہیں مقامی تواریخ کا مواد فراہم کرتی ہیں۔ مثلاً مقامی تیوہار میلے ٹھیلے، بازار، رسم و رواج، تفریحی مشاغل وغیرہ۔ اس مواد میں دل کشی اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ قدیم نشانات اور آثار بھی جگہ بہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گاؤں یا قریہ کا پرانا پوکھرا، پختہ تالاب، پختہ کنواں، پل، پڑاؤ، دھرم شالہ، کھنڈرات، عبادت گاہیں، مقبرے، زیارت گاہیں، سرائیں یہ سب چیزیں اپنی تاریخ رکھتی ہیں کبھی بھی کوئی خاص نام یا کہانی بھی ان سے منسوب ہو جاتی ہے۔ تاریخی اہمیت کی یہ سب چیزیں کہیں زیادہ اور کہیں کم ملتی ہیں۔ جو گاؤں، قریہ یا قصبہ جتنا پرانا ہوگا اسی قدر وہاں تاریخی آثار یا نشانات ملنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ کچھ چیزوں کی تاریخ مشہور ہوتی ہے۔ کچھ چیزوں کی تاریخ کے بارے میں معلم تاریخ بڑے بوڑھوں سے رابطہ قائم کر کے معلومات فراہم کرسکتا ہے۔

ہر چند کہ مقامی طور پر دست یاب سارے تاریخی مواد کی صراحت درسی کتب میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ مواد طلبہ کو تاریخ کے مضمون بالخصوص سماجی مطالعہ سے آشنا کرنے کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ معلم تاریخ کو ان کا استعمال غیر رسمی طور پر کرنا چاہیے۔ چونکہ یہ ساری چیزیں طلبہ کے ذاتی مشاہدہ و تجربہ سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے سماجی مطالعہ کا شوق پیدا کرنے اور باضابطہ تاریخی مطالعہ کے لیے یہ مضبوط بنیاد فراہم کرسکتی ہیں۔ طلبہ کو یہ محسوس کرایا جاسکتا ہے کہ ان کے عقائد، رسوم رواج زبان، طرز معاشرت وغیرہ جوان کے اسلاف کی دین ہے کس طرح قدرتی حالات اور تاریخی عوامل سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ پرانا پوکھرا، تالاب، کنواں، دھرم شالا عبادت گاہ، پرانا مدرسہ، ان کا سماجی سرمایہ ہیں جو ان کے بزرگوں نے ان کے لیے چھوڑا ہے۔ اس سماجی سرمایہ کی کچھ اہم چیزیں چنیں قومی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ان چیزوں کی کہانی طلبہ کے لیے دل چسپ ہوسکتی ہے۔ یہ چیزیں کتنی پرانی ہیں خود ان کا گاؤں یا قصبہ کتنا پرانا ہے کیا اس کے آباد ہونے کی کہانی انھیں معلوم ہے؟ نئی آبادیاں کیسے بستی ہیں ان کے سماجی سرمایہ کی جو چیزیں ہیں کیا ان کے بنانے والوں کے نام انھیں معلوم ہیں، یہ کون لوگ تھے، ان چیزوں کی تعمیر انھوں نے کس مقصد سے کی تھی؟ اس قسم کے سوالات پر غور کرنے سے طلبہ میں تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس تسلسل میں طلبہ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت ترقیاتی منصوبوں کے تحت سڑک، پل، باندھ، نہر، ٹیوب ویل، فیکٹری، اسکول، اسپتال، پاور ہاؤس وغیرہ کی شکل میں جو چیزیں ان کے قصبہ یا ان کے آس پاس بن رہی ہیں وہ کس طرح ان کی زندگی پر اثر ڈال رہی ہیں اور آئندہ نسلیں کس طرح ان سے فیض یاب ہوں گی اور یہ تاریخی سرمایہ کا حصہ بن جائیں گی۔

مقامی تاریخ کے مطالعہ میں ایسے سماجی مسائل اور

حالات پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جو طلبہ کے ذاتی مشاہدہ اور تجربے کے دائرے میں ہوں جیسے ذات پات اور چھوا چھوت کا مسئلہ، توہم پرستی، مضرت رساں رسم و رواج کمزور طبقات میں نسبتاً زیادہ غریبی اور پچھڑا پن وغیرہ۔ طلبہ ان مسائل کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ زیادہ ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ قصبات سے اپنے قصبہ کا مقابلہ وموازنہ کر کے چند مثبت نتائج اخذ کریں۔ مثلاً تعلیم وتجارت وروزگار کے بہتر مواقع ،نقل وحمل کے ذرائع اور سامان راحت جیسے پینے کا پانی، روشنی، علاج وغیرہ کی فراہمی کس طرح سماجی زندگی کے معیار کو بہتر بناتی ہے۔ اگر یہ مطالعہ تاریخی عوامل کی روشنی میں طلبہ کے ذہنی استعداد اور درجہ کے عام معیار کو سامنے رکھ کر کرایا جائے تو مقامی تاریخ زیادہ بامقصد بن جاتی ہے۔

مقامی تاریخ کا مطالعہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ طلبہ میں تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور ان میں تاریخی تسلسل اور نشوونما کا شعور پیدا ہوتا ہے جو تدریس تاریخ کا ایک اہم مقصد ہے۔ طلبہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کا چھوٹا سماج ایک بڑے سماج اور عالمی برادری کا حصہ ہے ان کی حیثیت کل کے ایک جزو کی ہے۔

صوبائی یا علاقائی تاریخ: علاقائی تاریخ ایک طریقہ سے مقامی تاریخ کی توسیع ہے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو دوسرے مقامات پر جانے اور وہاں کی قابل دید چیزوں کو دیکھنے کے مواقع زیادہ ملنے لگتے ہیں۔ اس طرح ان کے مشاہدات اور تجربات میں زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ طلبہ سمجھنے لگتے ہیں کہ تحصیل، ضلع، اور صوبہ انتظامیہ کی مختلف اکائیاں ہیں اگر ان میں لسانی وحدت اور بودوباش کے طریقوں اور رسم و رواج میں یگانگت ملتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ اکائیاں علاقہ یا خطہ سے مطابقت رکھتی ہوں، کیونکہ جغرافیائی علاقہ یا خطہ کی بنیاد زمین کی ساخت آب و ہوا اور قدرتی وسائل پر ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بعض خطے یا علاقے کسی دور میں خاص شہرت اور تاریخی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً قدیم زمانہ میں اجودھیا کا علاقہ کروکشیتر کا علاقہ، سلاطین شرقیہ کے زمانہ میں جونپور کا علاقہ، نوابین اودھ کے زمانے میں بہ شمولیت فیض آباد اودھ کا علاقہ، روہیلہ سرداروں کے تعلق سے روہیل کھنڈ کا علاقہ، بندیل راجاؤں اور پھر مرہٹوں کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بندھیل کھنڈ کا علاقہ، بعض خطوں اور علاقوں میں اہم تاریخی نشانات و آثار ملتے ہیں۔ مختلف مقامات پر پائے جانے والے تاریخی آثار و باقیات کی کوئی حتمی اور مکمل فہرست مرتب نہیں کی جاسکتی۔ ان میں جو بہت اہم ہیں اور تاریخ میں خاص مقام رکھتے ہیں ان کا تذکرہ عام تاریخوں میں کہیں مجملاً اور کہیں مفصل مل جاتا ہے اس لیے ان کی صراحت کی اس جگہ چنداں ضرورت نہیں ہے۔

مقامی تاریخ کا مطالعہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ طلبہ میں تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور ان میں تاریخی تسلسل اور نشوونما کا شعور پیدا ہوتا ہے جو تدریس تاریخ کا ایک اہم مقصد ہے۔ طلبہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کا چھوٹا سماج ایک بڑے سماج اور عالمی برادری کا حصہ ہے ان کی حیثیت کل کے ایک جزو کی ہے۔

تاریخی نقطہ نظر سے جو خطے یا علاقے یا صوبے خاص اہمیت کے حامل رہے ہیں ان سے متعلق بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ تاریخیں مواد کی نوعیت اور معیار کے لحاظ سے مختلف درجے کی ہیں۔ چونکہ علاقائی تاریخ کا دائرہ زماں ومکاں دونوں اعتبار سے عام تاریخ کے مقابلے میں مختصر ومحدود ہوتا ہے اس لیے اس کے مطالعہ اور تدریس میں اس کے تذکرہ کا مقصد بھی محدود ہے۔ ملکی تاریخ کے تناظر میں وہ جس مقام کی مستحق ہے اسی لحاظ سے اس پر توجہ دینی چاہیے۔ طلبہ یہ محسوس کریں کہ مقامی تاریخ کی طرح علاقائی یا صوبائی تاریخ ملکی اور قومی تاریخ سے علاحدہ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ بھی تاریخی پریمڈ کا ایک جزو ہے۔ اس طرح طلبہ میں وسیع النظری، باہمی اشتراک تعاون اور قومی یک جہتی کے جذبات کو فروغ ملے گا۔

قومی تاریخ: لفظ قوم کا استعمال سیاق وسباق کے اعتبار سے مختلف معنی رکھتا ہے۔ ایک ملک کے باشندے رنگ، نسل، مذہب، زبان اور تہذیب وتمدن کے امتیازات اور اختلاف کے باوجود اپنی قومیت اپنے وطن کی نسبت سے ظاہر کرتے ہیں کبھی نسل، مذہب، زبان وادب، عقائد وخیالات اور کلچر کی یکسانیت رکھنے والے افراد کی جماعت بلا تخصیص ملک و وطن چند مقاصد کے لیے اپنے کو ایک علاحدہ قوم تصور کرتی ہے اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر جدوجہد کرتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر اپنے ملک کی اقلیتیں مسلمان، عیسائی، پارسی، سکھ اپنے کو اکثر علاحدہ قوم بھی کہتی ہیں۔ نسل، زبان اور کلچر کی یگانگت کی بنا پر قومیت کی مثالیں ہیں، افغان قوم، مرہٹہ قوم راجپوت وغیرہ وغیرہ۔

جب ہم کوئی تاریخ کی بات کرتے ہیں تو لفظ قوم سے ہمارا مطلب موخر الذکر معنی میں ہوتا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب کسی قوم میں سیاسی بیداری پیدا ہوجاتی ہے یا اسے سیاسی اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو اس قوم کے دانشور قومی تاریخ کی تشکیل کر کے دنیا کی نظروں میں اپنی قوم کو سربلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قوم کی تاریخوں میں قومی مشاہیر کے کارنامے بالعموم بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس قوم کی کوشش کا ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ آئندہ نسلوں کے استفادہ کے لیے قومی تاریخ محفوظ کردی جائے۔ جن اقوام نے عالمی سیاست اور تہذیب وتمدن کو متاثر کیا ہے ان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں کچھ مستند اور اعلیٰ پائے کی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تاریخی عوامل کس طرح انسان کی سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی قوم کے ہم مسلک اور ہم خیال افراد پر مشتمل جماعت اپنے کو ایک ملت مت یا پنتھ تصور کرتی ہے۔ جیسے ملت اسلامیہ، ملت بیضا، ملت اثنا عشری،

بودھ مت، جین مت، کبیر پنتھی وغیرہ۔ ان کی بھی تاریخیں لکھی جاتی ہیں ایسی تاریخوں کو قومی تاریخ کا مختصر نمونہ سمجھنا چاہیے۔ اسکولی سطح پر تاریخ کے نصاب میں کسی مخصوص قوم یا ملت کی تاریخ کو علاحدہ سے جگہ نہیں دی جاسکتی۔ ویسے ایک لحاظ سے قومی تاریخ کو ملکی تاریخ کا ہی ایک حصہ کہہ سکتے ہیں۔ قومی تاریخ کے اہم نقوش ملکی تاریخ کے تناظر میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ملکی تاریخ: ملک ایک سیاسی وحدت ہے اس کے باشندے ایک ہی نسل وقوم کے بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف نسل وقوم کے بھی۔ جس ملک میں مختلف نسل وقوم کے لوگ قابل لحاظ تعداد میں آباد ہیں وہاں کی تاریخ کافی پیچیدہ ہوتی ہے۔ ملک کی قدامت اور وسعت بھی ملکی تاریخ کی پیچیدگی میں اضافہ کرتی ہے۔ ملکی تاریخ مرتب کرنے میں قومی، معاشرتی اور علاقائی عصبیت اور جانب داری کی جھلکیاں اکثر نظر آتی ہیں۔ ایسے سنجیدہ ثقہ اور صاف ذہن رکھنے والے اہل قلم اور مورخ کم ہوتے ہیں، جو ذاتی تعصبات اور پسند یا ناپسند سے بلند ہو کر تاریخی واقعات وحالات کو پیش کرنے میں دیانت دارانہ اور متوازن رویہ اپنا کر حقیقت نگاری کا حق ادا کرسکیں۔

طبع زاد تاریخ لکھنے کے مقابلہ میں تاریخ کی درسی کتب مرتب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ درسی کتب کی تیاری میں مجوزہ نصاب سے بڑی مدد ملتی ہے۔ نصاب جتنی توجہ، محنت قابلیت اور دیانت داری سے مرتب کیا جائے گا۔ تاریخ اتنی ہی جامع اور متوازن ہوگی۔ اسکولی سطح پر ملکی تاریخ ہی عام تاریخ یعنی جنرل ہسٹری کی شکل میں نصاب میں جگہ پاتی ہے۔ انگریزی دور حکومت میں برطانیہ کی سیاسی تاریخ بھی عرصہ تک داخل نصاب رہی۔

طبقاتی تاریخ: طبقاتی تاریخ کو ایک طرح سے علاقائی تاریخ کی توسیع سمجھنا چاہیے۔ جب روئے زمین کا کوئی بڑا جغرافیائی خطہ یا طبقہ کچھ خاص وجوہ سے عالمی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے تو مبصرین سیاست وہاں کے حالات کا تاریخی پس منظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ ایسے مطالعہ کا غالب پہلو اقتصادی، سیاسی یا معاشرتی ہوتا ہے اسے طبقاتی تاریخ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تاریخ عصری مسائل کو سمجھنے اور اس خطہ سے متعلق کسی موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لیے کارآمد ہوتی ہے۔

عالمی تاریخ: عالمی تاریخ صحیح معنوں میں اصل

عالمی تاریخ دراصل سیل وقت کی تاریخ ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا، نہ سمت ہے نہ منازل ہیں۔ اس سیل میں انسان کے ارادی افعال واعمال کے تعامل سے واقعات وحادثات کی شکل میں نقوش وآثار ابھرتے رہتے ہیں۔ ماضی میں ابھرے ہوئے انھیں نقوش وآثار کا مطالعہ عالمی تاریخ کا موضوع ہے۔

تاریخ ہے، اگر ہم اس کا تصور ایک عظیم انسانی پریڈ کی شکل میں کریں تو روئے زمین پر انسانی وجود اس کا نقطہ عروج قرار پائے گا۔ یہ وجود کب اور کیسے رونما ہوا اس کے بارے میں مختلف نظریات اور قیاس آرائیاں ہیں مگر یقین کے ساتھ کچھ کہنا محال ہے۔ ہاں یہ ضرور نظر آتا ہے کہ اس وجود کے ارتقا اور نشوونما کا سلسلہ برابر جاری وساری ہے۔ معلوم نہیں کتنی صدیاں بیت چکیں، کتنے دن گزر چکے، کتنا زمانہ ہوگیا جب انسان نشوونما کے مختلف مراحل ومنازل طے کرتا ہوا اس شکل میں اور اس مقام پر آج پہنچا ہے جس کے مختلف قسم کے مظاہرے ہمارے سامنے ہیں۔ نشوونما کے اس تسلسل میں قدرتی عوامل سے زیادہ انسان کی مسلسل جدوجہد کو بڑا دخل ہے۔ وہ نامساعد قدرتی حالات سے ستیزہ کار رہا ہے۔ مخالف قوتوں سے نبرد آزمائی کرکے ان کی تسخیر کی ہے اور انھیں اپنے مصرف میں لا رہا ہے وہ سمندر کی پنہائیوں میں پہنچا ہے۔ پہاڑ کی سر بفلک چوٹیوں پر اس نے اپنی کامرانی کا پرچم لہرایا ہے۔ وہ ثوابت اور سیاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ تسخیر کائنات کا جذبہ اسے فطرت کے راز ہائے سربستہ کے انکشاف میں سرگرم عمل بنائے ہوئے ہے۔ اس ساری جدوجہد کے پیچھے اقبال کے الفاظ میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ کارفرما ہے۔

عالمی تاریخ دراصل سیل وقت کی تاریخ ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا، نہ سمت ہے نہ منازل ہیں۔ اس سیل میں انسان کے ارادی افعال واعمال کے تعامل سے واقعات وحادثات کی شکل میں نقوش و آثار ابھرتے رہتے ہیں۔ ماضی میں ابھرے ہوئے انھیں نقوش وآثار کا مطالعہ عالمی تاریخ کا موضوع ہے۔

عالمی تاریخ کا کینوس اتنا بسیط وعریض ہے کہ اس کا مکمل احاطہ بڑے سے بڑے مورخ کے لیے بھی دشوار ہے۔ اس کینوس پر موزیک Mosaac کے صرف انھی رنگوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن میں امتیاز ممکن ہے، جیسے وسیع پیمانے پر قبائل اور اقوام کا ایک خطہ ارض سے دوسرے خطہ ارض کی طرف نقل وحمل، معاش کی خاطر قدرتی وسائل اور ذخائر کی تلاش کی سرگرمیاں، ان پر قبضہ کرنے کی جدوجہد، نئے بحری اور بری راستوں کی تلاش دریافت، سیاسی اقتدار کے لیے باہمی جنگ و جدال، ملک گیری اور نام آوری کی ہوس، اس کے ہلاکت آفریں نتائج، طوائف الملوکی کے ادوار، بڑی بڑی مملکتوں کی تشکیل وتخریب، اقوام عالم کا عروج و زوال شہنشاہیت اور ملوکیت کے پیدا کردہ مسائل، قدیم تہذیبوں کا غیر فانی ورثہ، مشاہیر کے کارنامے، سیاسی واقتصادی انقلابات سامان راحت فراہم کرنے اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کی تحریکات، اہم اکتشافات اور ایجادات وغیرہ۔

عالمی تاریخ کا یہ مواد ہمیشہ سے علمائے تاریخ، ماہرین تہذیب وتمدن اور محققین کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس لیے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ تاریخ کے تدریسی نصاب میں ابتدا ہی سے عالمی تاریخ کے اہم اجزا کو جگہ دی گئی ہے اور آج بھی ہر ملک اور ہر سطح کے نصابات میں مختلف انداز سے عالمی تاریخ کے اہم اور عہد ساز اجزا شامل ہیں۔ عالمی تاریخ کے نمایاں اور اہم خدوخال کو صحیح تناظر میں پیش کرنے سے طلبہ میں وسیع النظری شائستگی اور انسان دوستی کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔

■

ماخذ: تدریس تاریخ، مصنف: خلیل الرب، **تیسری طباعت:** 2016، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

حکیم اجمل خان

نگینہ ہند

ابوطالب انصاری

علاج معالجہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔ اس فن کو عروج یونانیوں نے بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ علاج آج تک رائج ہے اور اسی اصول پر قائم ہے جو انھوں نے مرتب کیے۔ آج دنیا کے نقشہ پر یونان کی کوئی اہمیت نہیں ہے مگر کبھی یہاں علم وفضل کی برسات ہوتی تھی۔ یونان کا ہر شہر علم و فن کا گہوارہ تھا۔ اسی سرزمین سے علم وہنر کے وہ مایہ ناز سپوت اٹھے جن کی خدمات کا زمانہ معترف ہے اور انھی کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل کر کامیابی کی بلندیوں پر پہنچے۔ سقراط، بقراط، افلاطون، ارسطو، جالینوس، اسقلیپوس اور اسکراتمیں اسی زمین سے اٹھے اور علم وفن کے آسمان پر ستاروں کی مانند چمکے۔ بقراط، جالینوس اور اسقلیپوس وغیرہ فن طب میں مہارت رکھتے تھے۔ افلاطون اور ارسطو فلسفہ کے ماہر تھے۔ بقراط نے تشریح الاعضا اور منافع الاعضا کو ترتیب دے کر علم طب کو مستقل فن کا درجہ عطا کیا۔ اسی نے انسانی مزاج، اخلاط اور ارکان اربعہ پر مکمل بحث کی اور یہ ثابت کیا کہ یہی ارکان اربعہ ہیں جن سے اخلاط کا وجود ہے۔ اخلاط میں بگاڑ مرض کا سبب بنتا ہے۔ جالینوس نے نسخہ نویسی کو بہتر طور پر مرتب کیا۔ اسی نے دل پر بھی محنت کر کے یہ کہا تھا کہ دل کے دائیں اور بائیں حصوں کے درمیان میں غیر مرئی سوراخ ہوتے ہیں جن سے خون دائیں جانب سے بائیں جانب جاتا ہے۔

یونانیوں کے زوال کے بعد ان کے جانشین رومی ہوئے۔ ان کے مطابق طاقت ہی تمام چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کا جب عروج ہوا (عربوں کا) تو عباسی خلیفہ 'مامون الرشید' کی سرپرستی میں عجمی زبانوں کے تراجم عربی زبان میں کیے گئے۔ مسلمان کے ہاتھوں میں جب بقراط اور جالینوس کی میراث آئی تو وہ اس کے پوری طرح سے امین بنے۔ انھوں نے نہ صرف اس کی حفاظت کی بلکہ اسے پہلے سے زیادہ ترقی دی۔ اور اس میں مزید تحقیقات اور تجربات سے نکھار پیدا کر کے مفروضات سے پاک کر دیا۔

علم طب کا احیائے ثانی 'شیخ الرئیس ابن سینا' سے ہوا۔ ابن سینا نے نئے نئے وسائل ایجاد کیے اور جو نقائص نظر آئے انھیں دور کر کے اس فن کو نئی زندگی بخشی۔ گویا علم طب میں انھیں مجتہد کا درجہ حاصل ہے۔ ابن سینا نے ہی قاطیر، علم بتر پر تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے آنکھوں کے ناسور کا آپریشن کیا، اندام نہانی میں ادویات کی ترسیل کا طریقہ بتایا، دماغی رسولی اور سرطان کا شافی علاج کیا۔ ان کی کتابیں کتاب الشفا، القانون فی الطب اور رسالہ فی الفصد آج بھی مفید ہیں۔ ابن سینا کی مثال نیر اعظم کی سی ہے۔ اس کی روشنی سے آج تک دنیائے طب میں اجالا باقی ہے۔ اسی کی کرنوں سے ہزار ہا لوگوں نے استفادہ کیا۔ زکریا رازی نے وبائی پر امراض تحقیق کر کے 'جدری والحصبہ' نامی کتاب لکھی جو وبائی امراض پر پہلی کتاب تھی۔ ابن نفیس نے جالینوس کے اس مفروضہ کو توڑا کہ دل کے داہنے اور بائیں حصوں کے درمیان غیر مرئی سوراخ ہوتا ہے جس سے خون دائیں حصے سے بائیں حصے میں جاتا ہے۔ ابن نفیس نے بتایا کہ دونوں حصوں کے درمیان مرئی دیوار ہوتی ہے۔ اور خون دائیں سے بائیں حصے میں کھلبند کے ذریعے داخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ابن نفیس ہی نے 'ریوی دوران خون' پر جامع بحث کر کے اسے ثابت کیا تھا۔ ابن بیطار پہلا جانوروں کا ڈاکٹر تھا۔ اسی نے جڑی بوٹیوں اور غذا کے تعلق سے مکمل معلومات فراہم کی تھیں۔ غذا اور دوا پر اس کی کتابیں بالترتیب 'الادویہ المفردہ اور جامع الادویہ والاغذیہ' ہیں۔ ابوالقاسم زہراوی فن جراحت کا موجد ہے۔ اسی نے سرجری کے آلات، سرجری کے نظریات، بے ہوشی بتر اور پچی (پلاسٹر) کے طریقے پر مفصل روشنی ڈالی تھی۔ ابن زہر نے حلقوم اور حقنہ کے ذریعے غذا جسم میں پہنچانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا جبکہ غریب فن دایہ گری اور امراض نسواں میں مہارت رکھتا تھا۔ زین الدین جرجانی ایک فارسی حکیم تھا جس نے پہلی بار بتایا کہ گھینگا کا خفقان سے تعلق ہے۔ امراض جلد میں سمرقندی اور علاؤالدین قرشی جبکہ امراض چشم میں ابن ہیثم، علی بن عیسیٰ، عمار اور حنین اسحٰق ماہر تھے۔ ابن ہیثم نے بصری نظریات پیش کیے اور علی بن عیسیٰ نے اس میں مزید پیش رفت کی۔ اس زمانے میں موتیابین کے آپریشن کو 'کوچ طریقہ' کا نام دیا گیا۔ ابوالقاسم زہراوی کی کتاب التصریف، ابن ہیثم کی کتاب المناظر اور علی بن عیسیٰ کی تذکرۃ الکحالین امراض چشم پر آج بھی مفید ہیں۔ صدیوں تک یونانی طریق علاج اس وقت کے سبھی معلوم ممالک میں رائج تھا۔

ہندوستان میں طب یونانی کے ساتھ آیورویدک طریق علاج رائج تھا۔ ایشیا کے اکثر ممالک میں یہی طریق علاج رائج تھا، خاص طور پر برصغیر میں۔ اس دور

میں جب حکومت برطانیہ کے تسلط میں دنیا کے اکثر ممالک تھے اور اس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔انھوں نے ایلوپیتھی طریق علاج کو رواج دیا۔ہندوستان میں طب یونانی کے فروغ میں خاندان شریفی نے اہم کردار رہا ہے۔یہ خاندان دلی کے چاندنی چوک کی گلی قاسم جان میں رہائش پذیر تھی۔ چاندنی چوک کی گلی قاسم جان کی تنگ گلیوں میں زندگی رواں دواں ہے۔انسانوں کی بھیڑ یہاں سے گزرتے ہوئے ایک اچٹتی ہوئی نظر شریف منزل پر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔عام آدمی کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہیں مگر تاریخ کے طلبا اور اسکالر (محققین) کے لیے یہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

حکیم محمد شریف خان (1722-1807)، حکیم اجمل خان کے دادا اور دبستان طب یونانی دلی کے اہم رکن تھے۔ انھوں نے دلی کے مدرسہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ان کا تعلق نقشبندیہ سلسلہ سے تھا۔ان کے خاندان میں سبھی حکیم تھے مگر زیادہ شہرت انھیں کی حصہ میں آئی۔انھی کی وجہ سے ان کا خاندان 'خاندان شریفی' کہلایا'۔ انھوں نے میڈیسن پر 17 کتابیں لکھی ہیں جس میں 'علاج الامراض' بہت مشہور ہے۔انھوں نے ایلوپیتھی کی خوبیوں کو یونانی میں استعمال کرنے کیلئے زور دیا۔انھوں نے دواؤں کی ڈکشنری عربی اور فارسی میں مرتب کی تھی۔ انھوں نے اردو زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا تھا جو اس زبان میں پہلا ترجمہ کہا جاتا ہے۔ خاندان شریفی کے لوگ (حکیم) دہلی میں لوگوں کی خدمت کرتے تھے اسی لیے انھیں 'دلی کے رئیس' کہا جاتا تھا۔ان کے آباواجداد مغلیہ سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر کے دور حکومت میں ازبکستان سے ہندوستان آئے اور آگرہ میں آباد ہوئے۔شاہجہاں آباد بننے کے بعد یہ خاندان اورنگ زیب کے زمانے میں دلی چلا آیا اور بلی ماران میں آباد ہوگیا۔حکیم اکمل خان شاہ عالم ثانی کے شاہی حکیم تھے جنھوں نے انھیں 'اشراف الحکما' کا خطاب دیا تھا۔ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے حکیم شریف خان نے یہ جگہ لے لی۔وہ سیکولر نظریہ کے حامل اور ماہر حکیم تھے۔ یہ خاندان اپنے وطن مالوف میں بھی عوامی خدمت انجام دے رہا تھا مگر قدرت ان سے اور بھی خدمات لینا چاہتی تھی۔اسی لیے اس خاندان کو ہجرت کرا کے ہندوستان میں بھیجا۔اس خاندان نے ہندوستان میں آکر نہ صرف عوام کی بے لوث خدمت کی بلکہ طب یونانی کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

حکیم شریف خان نے 1719 میں دلی کے چاندنی چوک کی گلی قاسم جان میں شریف منزل تعمیر کرائی تھی۔شریف منزل ایشیائی اور لاطینی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔خستہ حالت کے باوجود آج بھی اس کا حسن قائم ہے۔گردش دوراں ان کی فنی خدمات کو مٹا نہ سکی۔ اس کی ایک ایک اینٹ خاندان شریفی کی عظمت رفتہ کی داستان سنا رہی ہے۔ یہ ایک تہذیبی اور سیاسی آماجگاہ تھی۔پنڈت جواہر لعل نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، ولبھ بھائی پٹیل اور لارڈ ہاسٹنگ کے علاوہ راجپوت اور امرا کا یہاں آنا جانا تھا۔شریف منزل نے کئی رول ادا کیے ہیں۔آزادی کی تحریک یہاں سے بھی شروع ہوئی۔یہیں ارباب علم وفن اور ارباب اقتدار کی محفلیں سجتی تھیں۔غدر کے وقت یہ رفیوجی پناہ گاہ بھی رہی تھی۔شریف منزل، اسپتال (ہندوستانی دواخانہ) اور کالج کا درجہ رکھتی تھی جہاں مریضوں کے علاج کے علاوہ تشنگان علم طب کو یہ فن سکھایا جاتا تھا۔ملک اور بیرون ملک سے آنے والے روزانہ پانچ سو مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔یہاں غریب مریضوں کا علاج مفت کیا جاتا تھا اور تعلیمی اخراجات بھی دیے جاتے تھے۔ یہیں 84 نایاب فارمولے پیٹینٹ کیے گئے تھے جیسے مصفی خون، شربت صدر، حب کبد اور اکسیر نساء وغیرہ۔ ملک کے اکثر شاہی حکیموں (پٹیالہ، نابھا، گوالیار جند اور رامپور) کا تعلق بھی شریف منزل سے تھا۔

حکیم شریف خان کے بیٹے حکیم صادق علی خان نے اس کے قریب ایک مسجد بنوا کر اپنے والد کے نام سے موسوم کی تھی۔ یہ مسجد 'مسجد شریف خانی' کے نام سے مشہور ہے۔ان کے بعد غلام محمود حکیم خان اس کے انچارج ہوئے، ان کے بعد حکیم عبدالمجید خان، حکیم واصل خان، حکیم اجمل خان، حکیم محمد احمد خان، حکیم ظفر خان، جمیل خان، محمود احمد خان، مسرور احمد خان باری باری اس کے انچارج مقرر ہوئے۔

اسی خاندان میں حکیم شریف خان کے بیٹے حکیم محمود کے ہاں 11 فروری 1864 کو ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔چہرے پر نور اور پیشانی سے اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے۔اس کا نام 'اجمل' رکھا گیا جو اسم بامسمی تھا۔ اس کی معصوم ادائیں اور سعادت مندی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ اہم مقصد اور خاص مشن کے لیے قدرت نے خاندان شریفی کی آغوش میں پرورش پانے کے لیے بھیجا ہے جہاں پہلے ہی سے اس مشن کی تکمیل کے سارے اسباب موجود ہیں۔روایتی تعلیم کے ساتھ (عربی، فارسی) قرآن کریم حفظ کیا۔عربی اور فارسی کے علاوہ انھوں نے بیس سال کی عمر میں فلسفہ، طبعیات، حدیث، تفسیر قرآن مجید اور طب یونانی کا گہرا مطالعہ کرکے ان میں مہارت حاصل کرلی۔طب یونانی اور حکمت حکیم عبدالجمیل (صدیقی دواخانہ، دلی) سے سیکھی۔

حکیم اجمل خان نے تکمیل تعلیم کے بعد جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو ابھی جوانی پر فصل بہار کی آمد تھی۔ وطن کی محبت سے سرشار اور خدمت خلق کے جذبے سے لبریز سینے میں گداز دل تھا اور وہ سچے محب تھے وطن، قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کے لیے مسلسل محنت کی۔ان کا ان پر میدان میں بہترین حصہ رہا مگر سب سے اہم کام طب یونانی کا فروغ تھا۔انھوں نے طبابت کے ذریعے عوام الناس کو فیض پہنچانا شروع کیا۔ اس میں مسلسل تجربات اور تحقیقات کو توسیع دی۔ یہاں تک کہ ان کی مہارت کی شہرت کا ڈنکا ساری دنیا میں بجنے لگا اور لوگ ان کو حکیم اجمل خان کے نام سے جاننے لگی۔ان کی شہرت نہ صرف حکیم بلکہ طبی محقق، مجاہد آزادی، اور شاعر سے ہونے لگی۔نواب رامپور کے طبیب خاص مقرر ہوئے جہاں انھیں 'مسیح الہند' کا خطاب دیا گیا۔وہ طب یونانی کے بے تاج بادشاہ تھے۔خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا اور اس فن پر ایسی پکڑ دی تھی کہ بعض اوقات صرف مشاہدے اور نبض دیکھ کر ہی مرض کی تشخیص کر لیتے تھے۔

حکومت برطانیہ اپنے ساتھ نیا طریق علاج 'ایلوپیتھی' ساتھ لائی تھی بلکہ جہاں جہاں ان کی حکومت تھی سبھی جگہ انھوں نے یہ طریق علاج رائج کیا۔حکومت برطانیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ حکیم و وید نہ تو کسی جامعہ سے فارغ ہیں اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ڈگری ہے۔اس نے ایک سرکولر جاری کیا کہ یونانی، آیورویدک اور ایلوپیتھی پریکٹس وہی کر سکتے ہیں جن کے پاس ڈگری ہوگی۔ حکیم اور وید ڈگری کہاں سے لاتے؟ کیونکہ اب تک باقاعدہ کالج کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔حکیم اجمل خان حکومت کی اس چال کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔اس کے لیے انھوں نے لوگوں میں بیداری پیدا

کی اور سبھی پیتھی والوں کو ملا کر ملک گیر تحریک چلائی اور حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ ابھی جو جیسے پریکٹس کرتے ہیں کرتے رہیں مگر آئندہ کے لیے ڈگری ضروری ہے۔ یونانی اور آیورویدک میں تحقیق کا ذوق، اس کی باقاعدہ اور باضابطہ تعلیم کا نہ ہونا بھی اس خدشے کی تقویت کا سبب بنا۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے دہلی میں ایک آیورویدک اور یونانی کالج کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ اگر بقراط، ابن سینا اور جالینوس کا ذکر خیر ہوتا ہے تو سشرت اور چرک کی بھی جے جے کار ہو۔ امداد کے لیے اپنا دواخانہ جو 'ہندوستانی دواخانہ' کے نام سے مشہور تھا، غریبوں کے لیے وقف کر دیا۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے یونانی ادویات پر ریسرچ کر کے اسے نئی جہت عطا کی۔ آیورویدک اور یونانی دواؤں پر تحقیقات کے لیے ایک ادارہ بنام 'مجلس تحقیقات علمی' کی داغ بیل ڈالی۔ اسرول سے کیمیائی اجزا تحقیق کر کے نکالے گئے جو انہی کے نام اجملین، اجملنین اور اجملنیسن سے موسوم کر دیے گئے۔ یہ دوائیں ہائی بلڈ پریشر میں استعمال کی جاتی تھیں (ایلوپیتھی میں بھی اسی مرض کے لیے استعمال کی جاتی تھیں)۔ ان کے تجربات کا مجموعہ مع طبی ادویات 'حاذق' کے نام سے کتابی شکل میں موجود ہے۔

انیسویں صدی کا آخری دور تھا اس وقت امت مسلمہ کے ہی نہیں، ملک کے سیاسی حالات بھی دگرگوں تھے۔ ہندوستانیوں پر انگریز ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ حکومت برطانیہ کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ انھوں نے طب کے ساتھ سماجی اور سیاسی خدمات کا بھی بیڑہ اٹھایا اور اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا بھرپور استعمال کر کے قوم و ملک کو مستفید کیا۔ ملک میں راجہ رام موہن رائے، ساوتری بائی پھلے، فاطمہ شیخ، سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، حسرت موہانی، علامہ اقبال، گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری شخصیات ہندوستانیوں کی مختلف طریقہ سے خدمات میں لگی ہوئی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے، ساوتری بائی پھلے، فاطمہ شیخ نے عورتوں میں مساوات اور ان کی تعلیم کے لیے کوشاں تھیں اور ستی کی رسم کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، مہاتما گاندھی اور ابوالکلام آزاد ملک کے سیاسی حالات کو ٹھیک کرنے اور انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھے۔ سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، حسرت موہانی نے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے، اپنے حالات درست کرنے اور خاص طور پر انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔ علامہ اقبال نے آفاقی نظریہ پیش کیا اور نوجوانوں کو مخاطب کر کے انھیں ستاروں پر کمند ڈالنے کی ترغیب دی، سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑا اور تعلیم پر زور ملک کو آزاد کرانے کی ترغیب اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کو درست کرنے کی بھی تحریک و ترغیب دی۔

حکیم اجمل خان سچے محب وطن تھے۔ حکومت برطانیہ ہندوستانیوں کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ سارے ہندوستانی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ایک ہو کر ملک کو آزاد کرانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ انگریزی تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی ضرور لائے تھے۔ نئی ایجادات سے ملک کو ترقی دے کر بین الاقوامی معیار پر ضرور لا رہے تھے مگر آزادی بہر حال آزادی تھی۔

حکیم صاحب کی زندگی میں بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب انھوں نے سیاسی زندگی میں قدم رکھا اور اردو ہفتہ واری 'اکمل الاخبار' کے لیے لکھنا شروع کیا جسے ان کے خاندان والوں نے جاری کیا تھا۔ وہ اس وفد کا بھی حصہ تھے جس نے شملہ میں وائسرائے آف انڈیا سے 1906 ملاقات کر کے میمورنڈم پیش کیا تھا۔ انھوں نے ڈھاکہ کے اس فنکشن میں بھی حصہ لیا تھا جہاں 30 دسمبر 1906 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں جب مسلم لیڈروں کی اکثریت قید میں تھی حکیم صاحب نے مدد کے لیے گاندھی جی سے ملاقات کی۔ اس کے بعد مولانا آزاد، محمد علی جوہر کے ساتھ مل کر مولانا شوکت علی کے ساتھ تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ وہ Quit india تحریک کا بھی حصہ تھے۔

وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیان میں سے تھے۔ اس دوران یونیورسٹی علی گڑھ سے دہلی منتقل کی گئی۔ یونیورسٹی کے مختلف مسائل کو حل کیا (اپنا پیسہ خود لگایا) انھوں نے سینٹرل کالج (دہلی)، ہندوستانی دواخانہ، آیورویدک اور یونانی طبیہ کالج (دہلی) قائم کیا۔

حکیم اجمل خان کو اردو ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ برسوں 'اکمل الاخبار' سے وابستہ رہے۔ انھوں نے شاعری شروع کی اور 'شیدا' تخلص اختیار کیا۔ ادب کی مختلف اصناف (غزل، نظم وغیرہ) میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے۔ شاعری میں تغزل کا رنگ تھا۔ ان کی شاعری میں گل و بلبل کی داستان، لب و رخسار کے فسانے کے علاوہ حقائق حیات اور فلسفہ زندگی بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اشعار میں رند و میکدہ، حسن و عشق کے ساتھ غم دوراں اور غم جاناں کا بھی ذکر کیا ہے۔

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

درد کو رہنے دے دل میں دوا ہو جائے گی
موت آئے گی تو اے ہمدم شفا ہو جائے گی

چرچہ ہمارا عشق نے کیوں جابجا کیا
دل اس کو دے دیا تو بھلا کیا برا کیا

رخسار پر ہے رنگ حنا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

وہ سر ہی کیا جس میں تمھارا نہ ہو خیال
وہ دل ہی کیا کہ جس میں تمھارا نہ ہو گزر

ان کا انتقال 29 دسمبر 1927 کو امراض قلب سے ہوا۔ انھیں طبیہ کالج قرول باغ کے قریب دلی میں دفن کر دیا گیا جہاں ان کے خاندان کے دیگر افراد دفن تھے (موجودہ جگہ Near RK Ashram Metro Station ہے)۔

انعامات واعزازات

- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے چانسلر منتخب ہوئے (1920) جس پر وہ تا حیات برقرار رہے۔
- انھیں مسیح الملک، حاذق الملک کا خطاب دیا گیا۔
- وہ واحد شخص تھے جنھیں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کا صدر چنا گیا تھا۔
- وہ پہلے اور واحد مسلم تھے جنھوں نے ہندو مہا سبھا کے سیشن کی صدارت کی تھی۔
- حکومت نے ان کے نام کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔
- طبیہ کالج (دلی) سے متصل اجمل خان پارک بنایا گیا ہے۔

■

Dr. Abu Talib Ansari
187, Ghori Para,
Bhiwandi (Thana) -421308
drabutalibansari@gmail.com

محمد اسد اللہ

ایک نوائے حرفِ خموش
ظفر کلیم

جب بھی ہم کسی ایسے شہر کا نام لیتے ہیں جو علم و ادب کی روایات کا امین رہا ہو تو چند نام ضرور یاد آتے ہیں۔ وسط ہند (مہاراشٹر) کے شہر ناگپور کے اہم شعرا میں ایسا ہی ایک نام ظفر کلیم بھی ہے۔ ظفر کلیم کا کئی دنوں کی علالت کے بعد 13 دسمبر 2024 کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

نرم لہجہ، مہذب طرزِ گفتگو اور وضع داری، غرض متاثر کرنے والے کئی عناصر ظفر کلیم کی شخصیت میں موجود تھے۔ ہر ملنے والے کو ان کا مخصوص انداز یہ باور کروانے کے لیے کافی تھا کہ یہ شخص عام لوگوں سے مختلف ہے۔ ہر ملاقات پر خلوص، شفقت و محبت کا اظہار ان کی شخصیت کو دل و دماغ میں بسا دیتا تھا۔ مشرقی تمدن کی پہچان مخصوص تہذیب، شرافت رکھ رکھاؤ اور حسن اخلاق جیسی خوبیاں ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں رچی بسی ہوئی تھیں۔

ظفر کلیم کا اصل نام شمشیر خاں تھا، وہ 5 دسمبر 1938 کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ایچ ایس سی ڈی ایڈ کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ انھوں نے لائف انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا اور زمینوں کی خرید و فروخت کے میدان میں اتر کر بلڈر بن گئے۔ ناگپور کے علاقہ 'چھاؤنی' میں واقع ظفر کلیم کا تعمیر کردہ 'غزل اپارٹمنٹ' ان کے ادبی ذوق کا ضامن ہے۔ ظفر کلیم کی ابتدائی زندگی ایک آسودہ حال گھرانے میں بسر ہوئی لیکن ان کے والد کے انتقال کے بعد انھیں مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں ظفر کلیم کی اہلیہ اور جوان بیٹے کی رحلت بھی شامل ہے۔ انھوں نے ان مصائب کا صبر و تحمل کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ان کی شاعری میں ان سانحات اور زندگی کی جدوجہد کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ظفر کلیم اپنی زندگی کے آخری دور میں سماجی طور پر مشہور شخصیات کے رابطے میں رہے۔ ان کا کلام مختلف ذرائع سے اور مشاعروں کے توسط سے مقبولیت حاصل کرتا گیا۔

ظفر کلیم نے 1953 سے شاعری شروع کی جب ان کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ ان کی پہلی غزل ادبی رسالے 'پیامِ نو' میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'طلسمِ غزل' 1981 میں اور دوسرا شعری مجموعہ 'نوائے حرفِ خموش' 2007 میں منظرِ عام پر آیا۔ 'نوائے حرفِ خموش' 472 صفحات پر مشتمل ہے جس میں گیارہ پابند، معریٰ اور آزاد نظمیں اور غزلوں کے علاوہ قطعات بھی شامل ہیں۔ ظفر کلیم کے دوسرے مجموعہ کلام 'نوائے حرفِ خموش' کی اشاعت سے پہلے اس کے دو بار گم ہونے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں ظفر کلیم نے اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے اپنے مضمون 'سرنامۂ ماضی و حال' میں اس کی تفصیلات پیش کی ہیں:

''تبدیلی مکان کے درمیان کچھ ذہنی الجھنوں اور کچھ لاپرواہی کے سبب نوائے حرفِ خموش' کا مسودہ کہیں چھوٹ گیا۔ مگر مسودہ کی زیراکس کاپی کے سبب حوصلہ نہیں ٹوٹا لہٰذا از سرِ نو مسودہ تیار کرنا شروع کیا۔''

دوسری مرتبہ ممبئی سے ناگپور ٹرین میں سفر کرتے ہوئے جو حادثہ پیش آیا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

بس ایک ہی بات ذہن میں تھی کہ ناگپور پہنچتے ہی مسودہ پریس کے سپرد کر کے فوراً اشاعت کا کام شروع کروادوں گا کہ آنکھ لگ گئی اور صبح 6 بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا کہ سوٹ کیس اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ زنجیر کھینچی، گاڑی رکی، تلاش کیا لیکن سوٹ کیس نہیں ملا۔

اس سانحے نے انھیں ذہنی طور پر بری طرح متاثر کیا، یہ ان کے لیے کسی عزیز کی موت سے کم نہیں تھا۔ چند دنوں بعد پھر ان کے دوسرے شعری مجموعے کی تیاری کی سبیل نکل آئی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

سوچ لیا تھا کہ اب مکمل طور پر شاعری ہی ترک کر دوں گا کہ ایک دن اچانک ایک گٹھے میں بندھے ہوئے ردی پیپرس الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ 'نوائے حرفِ خموش' میں شامل غزلیات کے مصرعوں کی فہرست ملی تو جیسے یوں لگا کہ میرے بے جان حوصلوں میں جان پڑ گئی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور ایک بار پھر بسم اللہ کہہ کر تیسری بار اپنے دوسرے شعری مجموعے 'نوائے حرفِ خموش' کی تیاری میں جی جان سے جٹ گیا۔ جتنے اشعار یاد آتے لکھتا اور باقی نئے اشعار کہہ کر غزل پوری کرتا۔ غرض کہ سیکڑوں اشعار نئے کہے طبع موزوں نے بھی خوب ساتھ دیا اور اللہ کی جانب سے اس طرح غیبی مدد ہوئی کہ محض تقریباً ڈھائی سال کے مختصر سے عرصے میں نوائے حرفِ خموش کا نیا ضخیم مسودہ گم شدہ دونوں ہی مسودوں سے میرے تئیں بہتر ثابت ہوا۔[1]

ظفر کلیم کی شاعری میں غزل کے روایتی موضوعات کے علاوہ زندگی کے نئے مسائل اور عہد حاضر کے وہ موضوعات بھی شعری اظہار کا مرکز بنے ہیں جنھیں جدید شاعری نے متعارف کروایا۔ ان کے متعلق ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن لکھتے ہیں:

''ظفر کلیم اپنے ہم عصروں میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان کا شعری

اسلوب سب سے جداگانہ اور منفرد ہے۔ انھوں نے شاعری میں نئی نئی راہیں اور جہتیں نکالیں ہیں۔ نئی علامتوں اور استعاروں سے اپنے اشعار میں زور اور نیا پن پیدا کیا ہے۔ انھوں نے تمام اصناف میں شعر کہے ہیں۔ لیکن غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔''2

ظفر کلیم کا کلام روایتی شاعری سے جدیدیت کی طرف سفر کا ایک سلسلہ ہے۔ جس زمانے میں انھوں نے طبع آزمائی شروع کی ناگپور میں پیرِ مغان خمخانۂ سخن مولانا ابوالحسن ناطق اور ضمیر الشعرا امین الفن حضرت طرفہ قریشی اپنے اپنے تلامذہ کے ساتھ پر ورشِ لوح و قلم کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ظفر کلیم نے صوفی شاعر ڈاکٹر عبدالحمید خاں آذر سے شاعری کی تربیت حاصل کی اور علم و ادب کے رموز سیکھے۔ مشاعروں میں ہونے والی ہوٹنگ، نوک جھونک اور روایتی شاعری کے عروج کے اس زمانے میں منظور حسین شور جیسے شاعر بھی یہاں موجود تھے جو ترقی پسند تحریک کے ہمنوا تھے۔ اسی کے ساتھ جدیدیت کی ہوائیں بھی ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں تخلیقی شگوفے کھلا رہی تھیں۔ ناگپور اور اس سے دس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع شہر کامٹی جسے ناگپور کے ادبی منظرنامے کی توسیع کہا جا سکتا ہے، ان دونوں مقامات کے فنکار جدیدیت کے ان رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس وقت یہاں شاہد کبیر، مدحت الاختر، عبدالرحیم نشتر، ش۔ یونس، غیور جعفری، ضیا انصاری، شریف احمد شریف، اقبال اشہر، ڈاکٹر بدر جمیل وغیرہ موجود تھے۔ ان فنکاروں کا کلام ماہنامہ شب خون، کتاب، جواز، شاعر وغیرہ میں شائع ہونے لگا۔ اسی ادبی فضا میں ظفر کلیم نے اپنے مشاہدات، احساسات اور تجربات کو شعری پیکر عطا کیا۔ ظفر کلیم کی شاعری جدید رجحانات کے ساتھ اخلاقی قدروں کو بھی بحسن و خوبی پیش کرتی ہے۔ اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ملک زادہ منظور لکھتے ہیں:

> **ظفر کلیم کی شاعری میں غزل کے روایتی موضوعات کے علاوہ زندگی کے نئے مسائل اور عہدِ حاضر کے وہ موضوعات بھی شعری اظہار کا مرکز بنے ہیں جنھیں جدید شاعری نے متعارف کروایا۔**

''تہذیب، شرافت، اخلاقیات جو ہمارے مشرقی معاشرے کا ایک اہم حصہ بن چکے ہیں ان کی ترجمانی بھی بہت خوبصورت انداز میں ان کے کلام میں ملتی ہے۔ فنی سطح پر معتبر اور فکری سطح پر 'روحِ عصر' سے باخبر ظفر کلیم ہمارے ان شعرا میں ہیں جو ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔''3

اس خیال کی تصدیق ظفر کلیم کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔

ضمیر بیچ کر جینے سے فائدہ کیا ہے　　　بچا سکو تو بچا لو وجود کو اپنے
بھڑکے تو بجھ نہ پائے گی پھر انتقام تک　　　نادان یاد رکھ کہ عداوت وہ آگ ہے
اس عہد میں بدن کی نفاست کے باوجود　　　اجسامِ بے ضمیر میں روحیں علیل ہیں
جو پستیوں سے مرا سلسلہ ختم کر دے　　　نہ دے مجھے وہ بلندی خدائے ارض و سما

ظفر کلیم کے ہاں ندرتِ خیال ہے، وہ برتے ہوئے موضوعات کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول حسن کمال ظفر کلیم کئی خرمنوں کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا خیال ڈھونڈ لائیں جو بالکل اچھوتا ہو۔ پامال موضوعات کو بھی اپنا لہجہ دے دینا ایک قابلِ قدر فن ہے اور ظفر کلیم کے یہاں یہ نیا پن مجھے کئی جگہ نظر آتا ہے۔

بے سبب رہا دل میں دشمنوں کا ڈر برسوں　　　جب ملے رفیقوں سے زخم ہی ملے ہم کو
جواب یہ ہے سوالات کر کے دیکھتے ہیں　　　سوال یہ ہے کہ خاموش کیوں ہیں لوگ اتنے
دام بتا گوہرِ نایاب کے　　　پیرہنِ تن پہ نہ جا جوہری

ظفر کلیم کی نظموں میں عصری زندگی کے مسائل کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں ناانصافیوں اور بے اعتدالیوں پر احتجاج میں دردمند دل کی پکار موجود ہے۔ ان کی نظم 'فساد اور یکجہتی' میں فسادات کی تباہ کاریوں کی منظر کشی پوری شدت کے ساتھ ابھر آئی ہے۔ شاعر ان فسادات کے پیچھے کارفرما سیاست دانوں کی سازشوں کو گہرے دکھ کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

شہر در شہر ہے اس آگ کی سازش کا اثر　　　اس کے پیچھے ہے تعصب کی نوازش کا اثر
یہ دہکتی ہے پراگندہ سروں سے پہلے　　　یہ سلگتی ہے رئیسوں کے گھروں سے پہلے
گھات میں اپنی سیاہ کار لگے ہوتے ہیں　　　ہر طرف لوٹ کے بازار سجے ہوتے ہیں
ان کو مریم کے تقدس کا بھی احساس نہیں　　　ان لعینوں سے بھلائی کی کوئی آس نہیں

نظم 'اردو' میں اس ملک میں قومی اردو کو قومی یکجہتی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ظفر کلیم کی نظم 'پیاس' شدتِ پیاس اور کربِ ذات کی ترجمانی کرتی ہے۔ نظم 'بوڑھا برگد' میں بزرگوں کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

ظفر کلیم کی شاعری میں زندگی کی بے ثباتی، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اور اخلاقی قدروں کے زوال کے مناظر اور ان پر افسوس کا اظہار بھی ملتا ہے۔

اچانک حادثہ ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے　　　ہنسے کوئی مگر رونے میں کتنی دیر لگتی ہے
صحرا میں جیسے کھوج کسی سائبان کی　　　یوں دوستوں میں ڈھونڈ رہے ہیں خلوص ہم
کتنے سوئے ہوئے طوفان جگا کر آیا　　　کون جانے تیری آنکھوں سے چھلکتا آنسو

ظفر کلیم نے حمد و نعت میں اپنے احساسات اور وجذبات کو بحسن و خوبی بیان کیا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی شخصیت کے مذہبی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔

زباں گونگوں نے پائی ہے جس اعجازِ تکلم سے　　　اسی کے نام سے اپنا سخن منسوب کرتا ہوں
یاد آیا کہ ہے خدا سب کچھ　　　چھین لیں جب بلندیاں اس نے
مجھے عروج دے ایسا جسے زوال نہ ہو　　　ہر اک عروج کے پیچھے زوال ہے لیکن

ظفر کلیم کی رحلت سے نہ صرف شہر ناگپور کے ادبی حلقے نے ایک معتبر اور پر اثر آواز کو کھو دیا بلکہ جدید شاعری کی دنیا بھی ایک اہم شاعر سے محروم ہو گئی ہے۔

حواشی

1 سرنامۂ ماضی و حال، ظفر کلیم، نوائے حرفِ خموش، ناگپور 2007، ص 26
2 ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن، شخصیاتِ ودربھ، ناگپور 2015، ص 150
3 نوائے حرفِ خموش، ناگپور 2007، فلیپ پر تحریر

■

Mohd Asadullah
30, Gulistan Colony
Near Pandy Lawn
Nagpur- 440013 (Maharashtra)
Mob.:9579591149
zarnigar2006@gmail.com

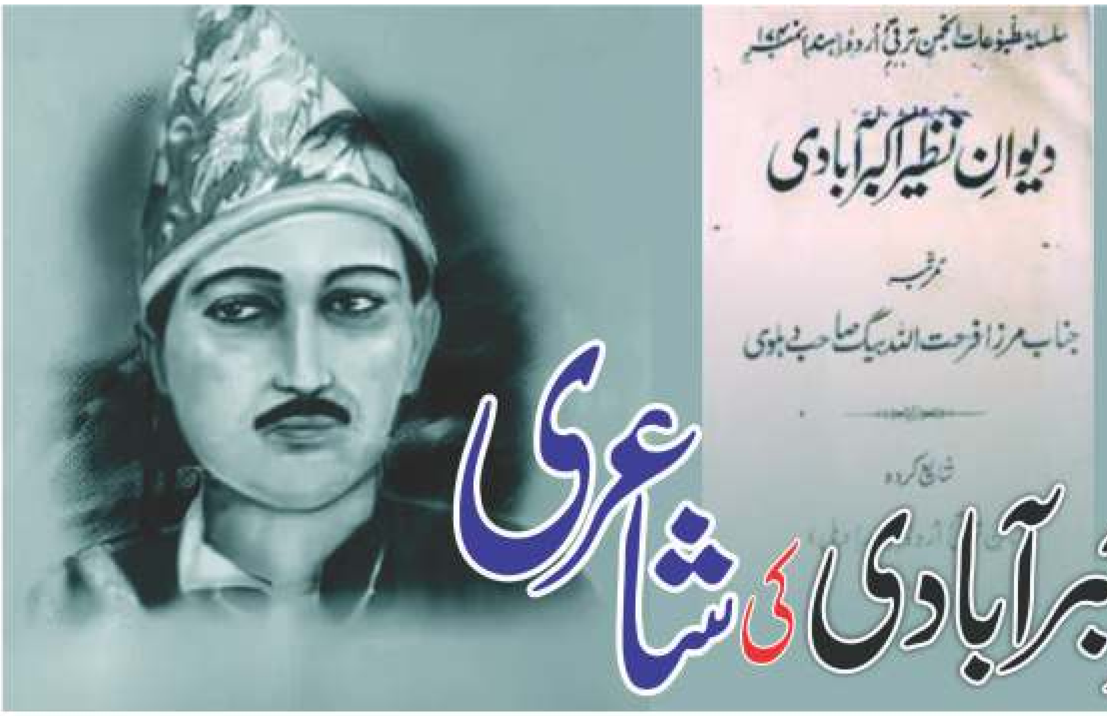

مجیب احمد خان

نظیر اکبر آبادی کی شاعری

اردو زبان وادب کے فروغ میں اردو شاعری نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔اس میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ میر ومرزا کا دور اردو شاعری کا سنہری دور ہے اور اس کی ادبی افادیت و اہمیت مسلم ہے۔ اگر اردو شاعری کی روایت ہمہ جہتی تنقیدی نظر سے دیکھی جائے تو ایک جانب وہ شعرا دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے ذات، جذبۂ عشق اور تصوف کو شعری اظہار کا وسیلہ بنایا اور دوسری طرف ایک ایسا گروہ بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے جو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں، اجتماعی شعور، عوامی تجربات اور تہذیبی بصیرتوں کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس گروہ کی سب سے توانا اور منفرد آواز نظیر اکبر آبادی کی ہے، جنھوں نے اردو شاعری کو محلاتی جمالیات اور درباری نزاکتوں سے نکال کر گلیوں، بازاروں، میلوں ٹھیلوں اور زندگی کی عام مگر معنی خیز سطحوں سے منسلک کیا۔ ان کی شاعری اردو ادب میں ایک تہذیبی اور فکری انقلابی نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے، جو اپنے دور کے غالب ادبی رجحانات سے انحراف کرتے ہوئے ایک نیا اسلوب، نیا زاویہ اور نئی معنویت لے کر سامنے آتی ہے۔

ادب کو اگر معاشرتی وتہذیبی شعور کا آئینہ تصور کیا جائے تو لازم ہے کہ وہ صرف اشرافیہ کے جذبات و خیالات اور تجربات تک محدود نہ رہے، بلکہ عوام الناس کی زندگی، ان کی زبان، ان کی ثقافت، ان کے دکھ سکھ اور ان کی اجتماعی جد وجہد کو بھی ادبی اظہار کا حصہ بنایا جائے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری اسی عمومی زندگی کی شاعری ہے، جس میں زندگی کی وہ پرتیں نمایاں ہوتی ہیں جو عمومی طور پر ادب عالیہ کے دائرے سے خارج سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی شاعری میں روایتی موضوعات کی بجائے آدمی، پکوڑا، روٹی، بنجارہ، میلوں کے مناظر، عورتوں کے گیت، تہواروں کے رنگ، اور عوامی کہاوتوں کی چھاپ دکھائی دیتی ہے، جو نہ صرف ان کی جمالیاتی بصیرت کو اجاگر کرتی ہے بلکہ ان کے گہرے تہذیبی شعور کی بھی غماز ہے۔

نظیر کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت اس کی وہ طبقاتی وابستگی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر محنت کش طبقے، دیہی فضا اور عوامی تجربے سے منسلک ہے۔ اگر چہ ان کا سماجی مقام انھیں متوسط طبقے میں شمار کرتا ہے لیکن ان کا شعری رجحان، مشاہدہ، اور اظہار بیان مکمل طور پر ادب العامہ کی سطح سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری، مروجہ اشرافیانہ شعری روایات کے مقابل ایک فکری مزاحمت کا کردار ادا کرتی ہے۔ میر، سودا، سوز اور درد کے عہد میں، جب اردو شاعری یا تو عشق وتصوف کی باریکیوں میں گم تھی یا سیاسی وتہذیبی انحطاط پر نوحہ کناں، نظیر کی شاعری زندگی کی حرارت، امید، طنز، بصیرت اور معنویت سے بھرپور ایک نیا افق پیش کرتی ہے۔ مخمور اکبر آبادی رقمطراز ہیں:

”نظیر اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے ورڈس ورتھ کی طرح عامۃ الورد موضوعات پر عام زبان میں شعر کہا اور اس کا فائدہ یا لذت عوام تک پہنچایا۔ دقیق خیالات اور مشکل الفاظ کے جو تودے اساتذہ نے فہم کی راہوں میں جمع کر دیے تھے وہ نظیر نے ہٹائے اور خیال کی آمد وشد کے لیے راستہ صاف کیا۔ کیا یہ طریقہ کار انسانیت پر احسان نہیں کہ نظیر نے شعر کی دولت سوسائٹی کے اس طبقے تک پہنچا دی جو اب تک ہر اعتبار سے نا اہل سمجھا جاتا تھا اور اس میں سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ فیض سخن ایک بڑی مشہور بات ہے لیکن جس سخن سے صحیح معنی میں فیض پہنچا وہ نظیر ہی کا سخن ہے۔“[1]

یہ مضمون نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے ان ہی تہذیبی، فکری اور لسانی پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے، جن کی بنیاد پر انھیں اردو نظم نگاری کا پہلا مکمل شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا مکمل فہم ان کے عہد کے تاریخی، سیاسی اور سماجی تناظر کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ ایک ایسے دور کے نمائندہ شاعر ہیں جب مغلیہ سلطنت زوال کی آخری منازل طے کر رہی تھی۔ محمد شاہ کے دور میں سیاسی انتشار، معاشی انحطاط اور دیہی بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ حکمران طبقہ اپنی شاہانہ عیش پسندی میں مست تھا، جب کہ کسان اور محنت کش غربت اور ظلم کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے جس معاشی ابتری اور جاگیردارانہ استحصال کی نشان دہی کی تھی، وہ نظیر کے عہد میں عملی صورت اختیار کر چکی تھی۔ دیہی بغاوتیں، جاٹوں اور مرہٹوں کی تحریکیں، اور مقامی طاقتوں کا ابھار اسی بحران کا نتیجہ تھے، جس کا عکس نظیر کی شاعری میں شدت سے جھلکتا ہے۔

نظیر نے اپنے کلام میں درباری زندگی کے تصنع اور اشرافیہ کی مصنوعی عظمت سے منہ موڑ کر عوام کی حقیقی زندگی کو موضوع بنایا۔ فارسی کی بالادستی کے زوال اور مقامی زبانوں کی آمیزش سے وجود میں آنے والی اردو، ان کے اظہار کا ذریعہ بنی۔ نظیر کی زبان سادہ، رواں

اورعوامی تھی، جو ریختہ کی ارتقا پذیر شکل کی علامت بن گئی۔ یہ محض لسانی تبدیلی نہ تھی بلکہ تہذیبی بیداری کا آغاز بھی تھا، جس میں فارسی، ہندی اور مقامی اثرات ایک نئے سماجی شعور کی تشکیل کر رہے تھے۔

نظیر کے ہم عصر شعرا میر، سودا، اور درد نے یا تو تصوف میں پناہ لی یا طنز ورثا کے راستے اختیار کیے، مگر نظیر نے زندگی کی دھڑکن اور عوام کی امنگوں کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ ان کی تخلیقات میں میلوں، بازاروں، تہواروں، غم وخوشی، محنت ومشقت کی جھلک ملتی ہے۔ وہ روایتی مذہبی یا صوفیانہ جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر خالص انسانی رشتوں، جذبات اور تجربات کو بیان کرتے ہیں۔ محمد حسن رقمطراز ہیں:

''نظیر نے اپنے وقت کی پکار کا جواب اپنے عظیم معاصرین کے برعکس دیا۔ مثال کے طور پر میر، سودا اور درد نے خود کو ذہنی طور پر افسردہ، طنز نگار اور صوفی بنا کر دیوالیہ سماج کے اثرات کا مقابلہ کیا۔ نظیر نے خود کو اعلی سماج سے علیحدہ کر کے امید کے نئے دیپ جلائے تھے۔ عوام کی روزانہ زندگی میں نیا ولولہ اور جوش پیدا کیا۔ اس ولولہ نے ان کو بحیثیت فنکار کے سہارا دیا۔ خونی رشتہ، ذات اور پیشے کے لحاظ سے ظالمانہ تقسیم کا نظام قائم تھا، استحصال کرنے والا طبقہ اپنی قوت کا اہرام اس نظام پر بنا رکھا تھا لیکن ہنرمندوں کو اپنی دستکاریوں میں فنکاری دکھانے کا موقعہ فراہم تھا۔ فنکارانہ اشیا کی قدر کی جاتی اور فنکاروں کی عزت افزائی کی جاتی تھی.... اس انحطاطی سماج کے پاس کوئی نئی چیز نہیں تھی نظیر بغیر کسی عزم کے قناعت کے سہارے کھڑے ہوئے تھے اور زندگی میں ولولوں سے بھرپور شاعری پیش کر رہے تھے۔''[2]

نظیر کی شاعری ایک ایسے سماج کی بازگشت ہے جہاں قدیم اشرافی اقدار شکست کھا رہی تھیں اور ایک نئی دیسی اور عوامی تہذیب ابھر رہی تھی۔ ان کا کلام ہمیں بتاتا ہے کہ حقیقی ادبی روایت محلوں یا درباروں میں نہیں، بلکہ عام انسانوں کی زندگی اور بولی میں پروان چڑھتی ہے۔ نظیر اس تہذیبی تبدیلی کے نہ صرف گواہ تھے بلکہ اس کے خالقوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔

نظیر اکبرآبادی کی شاعرانہ عظمت کا احاطہ کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے ان کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیں، کیونکہ ان کی ادبی شخصیت کی ایک اہم جہت غزلوں میں بھی نمایاں ہوئی ہے۔ اگرچہ نظموں نے انھیں غیر معمولی شہرت عطا کی لیکن ان کی غزلوں میں بھی تخلیقی جدت، فکری تسلسل اور فنی بصیرت کی جھلک ملتی ہے۔ لہٰذا نظموں پر تفصیلی گفتگو سے پہلے، ان کی غزلیہ شاعری پر روشنی ڈالنا موزوں ہوگا، جو ان کے فن کا ایک اہم مگر طویل عرصے تک کم پہنچانا گیا پہلو ہے۔ نظیر کی شہرت ان کی عوامی نظموں کے باعث اس قدر مستحکم ہوگئی تھی کہ ان کی غزلوں کی طرف دیر تک سنجیدہ توجہ نہ دی گئی۔ کلیات نظیر کے ابتدائی ایڈیشنوں میں غزلوں کی محدود تعداد، اور مکمل دیوانوں کی عدم دستیابی نے اس نظر اندازی کو مزید تقویت دی۔ تاہم جب آغا حیدر حسن دہلوی کے کتب خانے سے ان کے مکمل غزلیہ دیوان برآمد ہوئے اور 1943ء میں ترقی اردو بورڈ کے تحت شائع کیے گئے، تب جا کر نظیر کی غزل گوئی کی مکمل قد و قامت سامنے آئی۔ ان میں شامل چار سو انسٹھ مکمل غزلیں اس بات کی دلیل ہیں کہ نظیر نے غزل کے میدان میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔

نظیر کی شاعری ایک ایسے سماج کی بازگشت ہے جہاں قدیم اشرافی اقدار شکست کھا رہی تھیں اور ایک نئی دیسی اور عوامی تہذیب ابھر رہی تھی۔ ان کا کلام ہمیں بتاتا ہے کہ حقیقی ادبی روایت محلوں یا درباروں میں نہیں، بلکہ عام انسانوں کی زندگی اور بولی میں پروان چڑھتی ہے۔

نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں ربط وتسلسل کی وہ خصوصیت داخل کی، جو عام طور پر غزل کے روایتی ڈھانچے کا حصہ نہ تھی۔ کلاسیکی اردو غزل میں اشعار کی باہمی بے نیازی کو حسن تصور کیا جاتا تھا اور ہر شعر ایک خودمختار تجربہ ہوتا تھا۔ لیکن نظیر نے مسلسل غزلوں کا تجربہ کیا، جہاں خیالات ایک مرکزی مضمون کے گرد مربوط ہو کر ارتقا پاتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیں تو اس قدر مربوط ہیں کہ ہر شعر اگلے خیال کا فطری تسلسل محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی مشہور غزل 'یہ جواہر خانہ دنیا جو ہے با آب وتاب' میں دنیا کی بے ثباتی کا مضمون مسلسل ڈرامائی شان کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ یہاں ہر شعر دوسرے شعر سے جڑا ہوا ہے اور مجموعی طور پر ایک مربوط بیانیہ تشکیل پاتا ہے۔ غزل میں نظیر کے اس تجربے کے متعلق کلیم الدین احمد رقمطراز ہیں:

''نظیر کا خاص کارنامہ ہے، اگر نظیر نظمیں نہ لکھتے تو بھی ان کی یہ (نظمی) غزلیں ان کے اجتہاد اور شاعرانہ عظمت کی زندہ یادگار ہوتیں۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانہ میں جب بنے بنائے رستہ پر چلنا عام شیوہ تھا، جب نئی راہ نکالنے کا خیال بھی کسی کو نہ تھا، جب غزل کے فرسودہ اصول قوانین عالم کی طرح اٹل سمجھے جاتے تھے، ایسے زمانے میں اور ایسے ماحول میں نظیر نے آزادی خیال کے بے نظیر ثبوت دیا۔ نئے نئے تجربے کیے، نئے نئے سانچے بنائے اور غزل کی تکنیک بالکل بدل دی۔ افسوس ہے تو اس پر کہ کسی نے نظیر کی اہمیت کو نہ سمجھا اور ان کے بنائے ہوئے رستے پر چلنے کا خیال بھی نہ کیا۔''[3]

نظیر کی غزلوں میں ہمیں بار بار یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعے، جذبے یا تجربے کو جزوی یا ٹکڑوں میں بیان کرنے کے بجائے مکمل اور مربوط نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کی غزلیں حقیقی یا خیالی واقعات کو مرکز بنا کر پوری فضا میں بکھیرتی ہیں۔ یہ طرز عمل اردو غزل میں اس وقت ایک نیا تجربہ تھا، جب روایتی شاعری میں انتشار اور پراگندگی کو فطری آزادی کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔

نظیر نے غزل میں نہ صرف مضامین کی جدت پیدا کی بلکہ زبان اور انداز میں بھی تخلیقی وسعت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی ایک غزل میں اردو، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی خوبصورت آمیزش ہے جو اظہار کی تازگی اور ہم آہنگی کو بڑھا دیتی ہے۔ ان کا طرز عمل محض روایت کی اندھی تقلید نہیں بلکہ نئی راہوں کی تلاش اور نئے سانچوں کی تخلیق تھا۔ اگرچہ ہر تجربہ مکمل کامیاب نہ تھا لیکن ان کی کاوشیں اس دور کی ادبی فضا میں تازگی اور اجتہاد کی روشن مثال تھیں۔

اب ہم نظیر اکبرآبادی کی نظمیہ شاعری کا جائزہ لیتے

ہیں، جس نے ان کی شاعرانہ عظمت کو ایک الگ ہی بلندی عطا کی۔ نظم نگاری کے میدان میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے، وہ اردو شاعری کے ایک اہم مگر کم قدردان پہلو کو روشن کرتے ہیں۔

نظیر کی وہ نظمیں جن میں ہولی، دیوالی، راکھی، درگا پوجا، جنم اشٹمی اور عید و شب برات جیسے تہواروں کا بیان ملتا ہے، ہندوستانی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے ان تہواروں کی رنگینی، جوش و خروش، عوامی رقص و سرود کو جس جذبے اور حقیقت پسندی سے بیان کیا ہے، وہ اس دور کی شاعری میں نایاب تھا۔ ان کی نظموں میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی مخصوص طبقے یا عقیدے کی نمائندگی کر رہے ہیں؛ بلکہ ان کی ہر نظم خالص انسانی جذبے اور مقامی فضا کی عکاسی کرتی ہے۔ نظیر نے سنسکرت الفاظ کا محض برائے نام استعمال نہیں کیا، بلکہ اپنے تجربے اور جذبے سے انھیں نظموں میں یوں سمویا کہ قاری کو ایک مکمل ثقافتی فضا میں لے جاتے ہیں۔ نظم 'بلدیو جی کا میلا' ملاحظہ فرمائیے۔

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے　　ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے چنبیلی بیلا ہے　　بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہری قصباتی اور گنویلا ہے　　زر اشرفی ہے پیسا دھیلا ہے
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے　　زور بلدیو جی کا میلا ہے

نظیر اکبر آبادی کی کلیات میں ایسی نظموں کی بھر مار ہے جسے دیسی کہا جا سکتا ہے اور یہ مقامی جزئیات کو شامل کرنے کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔ ایک عرصے سے یہ بحث جاری ہے کہ مقامی رنگ کو اپنی تخلیقات میں شامل کرنا بڑی شاعری میں مانع ہے یا نہیں۔ الگ الگ نقادوں کی الگ الگ رائے ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر آج بھی اردو دنیا نظیر کے صحیح مقام کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ابواللیث صدیقی اسی بحث کے حوالے سے نظیر کے متعلق رقمطراز ہیں:

"اس پس منظر کو پیش نظر رکھیں تو نظیر اس وادی میں تنہا خود ہی اپنے رہبر اور خود ہی رہرو ہیں۔ ان کی یہ کوشش نہ مصنوعی ہے نہ پر تکلف۔ اس میں وہی زور ہے جو آمد میں ہوتا ہے، اسے کسی قسم کی منفی لسانی تحریک بھی نہیں کہہ سکتے۔ نظیر کا یہ کلام اس اعتبار سے خالص ہندوستانی کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے اور اگر اس کا رسم الخط فارسی کی جگہ دیوناگری کر دیا جائے تو اس کے ہندی ماننے میں بھی کسی کو تامل نہ ہوگا۔"[4]

مقامی رنگ کے علاوہ نظیر کی نظموں کا ایک اور قابل ذکر پہلو ان کا اخلاقی اور انقلابی رجحان ہے۔ ایسے زمانے میں جب اردو شاعری زیادہ تر عشق و تصوف کے روایتی مضامین میں محدود تھی، نظیر نے انسان دوستی اور سماجی مساوات کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ ان کی شہرہ آفاق نظم 'آدمی نامہ' ایک انقلابی تصور پیش کرتی ہے جس میں انسان کو حسب نسب یا مال و دولت کے بجائے صرف انسانیت کے معیار پر پرکھا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں واضح طور پر طبقاتی تقسیم، سماجی نابرابری، درباری تصنع اور مصنوعی اقدار کی مخالفت نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں وہی سادگی اور بے ساختگی ہے جو لوک گیتوں اور عوامی شاعری کا خاصہ ہوتی ہے۔ نظم 'آدمی نامہ' کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

دنیا میں بادشاہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے، شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں، اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی [5]

نظیر اکبر آبادی کی نظمیں محض مصنوعی ادبی تجربات نہیں، بلکہ ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی دنیا کی عکاس ہیں۔ وہ شاعری کو عوام کی روزمرہ زندگی سے قریب لاتے ہیں، اور ان کے کلام میں جو سچائی، خلوص اور بے ساختہ جوش ہے، وہ اردو نظم کو محض درباری یا نقالی کے دائرے سے نکال کر ایک حقیقی انسانی تجربے کا حصہ بنا دیتا ہے۔ نظیر کے بعد اردو شاعری میں مقامی رنگوں کی جو نئی تحریک اٹھی، اس کی ابتدائی اور پائیدار بنیادیں دراصل نظیر ہی نے رکھی تھیں۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر مجموعی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب میں ایک غیر معمولی تخلیقی قوت کے حامل شاعر ہیں، جنھوں نے روایتی شعری روایتوں سے الگ ہٹ کر ایک بالکل نئی راہ نکالی۔ نظم اور غزل دونوں اصناف میں ان کی کوشش یہی رہی کہ شاعری کو زندگی کے حقیقی تجربات سے جوڑا جائے اور انسانی جذبات کی ترجمانی رواں، بے ساختہ اور فطری انداز میں کی جائے۔ نظیر نے زبان کو مقصد نہیں، ذریعہ بنایا؛ انھوں نے زبان کے مروجہ معیارات کی اندھی تقلید کے بجائے اسے اپنے تجربات کے سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کے یہاں الفاظ صرف خوشنما صوتیات کا مجموعہ نہیں بلکہ احساسات، مشاہدات اور معاشرتی حقیقتوں کے جیتے جاگتے پیکر ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی زبان کی فطری روانی اور عوامی رنگ ہے۔ انھوں نے عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو اس مہارت سے اپنی شاعری میں جذب کیا کہ ایک قدرتی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ ان کے کلام میں مقامی لہجے کی خوشبو، عوامی محاورے کی تازگی اور زندگی کی حرارت صاف جھلکتی ہے۔ یہ وسعت نہ صرف زبان کے دائرے میں ہے بلکہ مضامین کی سطح پر بھی نظیر نے اردو شاعری کو نئی موضوعاتی جہات عطا کیں۔ ان کی نظمیں محض رسمیات کی عکاس نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن، مقامی معاشرت، اور عام انسان کی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا آئینہ ہیں۔

حواشی

1. نظیر پر ایک نظر: مخمور اکبر آبادی، ماہنامہ نگار، جنوری 1940، جلد 37، شمارہ 1، ص، 53
2. ہندوستانی ادب کے معمار نظیر اکبر آبادی: محمد حسن، ساہتیہ اکادمی، 1986، ص، 36
3. اردو شاعری پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ، 1985، ص، 452
4. نظیر کی نظم نگاری: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، نظیر شناسی (مرتبین) ڈاکٹر مرزا اکبر بیگ، ڈاکٹر محمد علی اثر، ادارۂ شعر و حکمت حیدر آباد، 1987، ص، 136-137
5. کلیات نظیر: نظیر اکبر آبادی، تیج کمار وارث نول کشور پریس لکھنؤ، 1951، ص، 683-685

■

Dr. Mujeeb Ahmad Khan
Associate Professor, Dept of Urdu
Kirori Mal College
University Of Delhi
Delhi - 110007
Mob.: 9313790130
khan.mujeeb.ahmad@gmail.com

نوید احمد خاں

سنبھل کے اردو اخبارات اور اردو ادب

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت مانی جانے والی 'اردو زبان' اخبارات کے سلسلے میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ ہندوستان کے مشرق میں واقع صوبہ بنگال کے اخبارات کو اردو پریس کا پیش رو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ملک ہند میں اردو زبان کو فارسی زبان کے بعد عروج حاصل ہوا۔ 27 مارچ بروز بدھ، 1822 کو بنگال سے ہری ہردت نے 'جام جہاں نما' نامی اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اردو زبان میں شائع ہونے والا ہندوستان کا پہلا اخبار ہے۔ 27 مارچ 1822 تک ہندوستان میں زیادہ تر اخبار صرف دو ہی زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ 'جام جہاں نما' ہندوستان کی تاریخ میں انگریزی اور بنگالی زبان کے علاوہ کسی تیسری زبان میں شائع ہونے والا پہلا عوامی اخبار تھا۔ یہ اخبار اپنے آٹھویں شمارہ سے اردو کے ساتھ ہی فارسی زبان میں بھی شائع ہونے لگا تھا۔

1837 میں مولوی محمد باقر نے دہلی سے 'دہلی اردو اخبار' جاری کیا جو اردو زبان میں دہلی سے شائع ہونے والا پہلا اخبار تھا۔ دہلی سے ہی 23 مارچ 1845 کو ماسٹر رام چندر نے 'فوائد الناظرین' نامی اخبار جاری کیا۔ پہلی جنگ آزادی یعنی 1857 کا واقعہ ہندوستان میں ایک سانحہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ہندوستان میں صحافت بالخصوص اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اور ہندوستان کے متعدد شہروں سے مختلف النوع اخبارات شائع ہونے لگتے ہیں۔ لکھنؤ سے اودھ اخبار اور اودھ پنچ علی گڑھ سے سائنٹفک گزٹ اور تہذیب الاخلاق، دہلی سے اکمل الاخبار، لاہور سے پنجاب اخبار، مدراس سے شمس الاخبار، ممبئی سے کاشف الاخبار، قاسم الاخبار بنگلور کے علاوہ دیگر کئی شہروں میرٹھ، الہ آباد، حیدرآباد، عظیم آباد، بنارس، رام پور مراد آباد اور سنبھل وغیرہ سے بھی کئی اہم اور معیاری اخبار شائع ہوئے۔

مؤخر الذکر شہر سنبھل دارالحکومت دہلی سے تقریباً 190 کلومیٹر فاصلے پر جنوب مشرقی یوپی میں واقع ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس شہر کے سر دارالحکومت اور صوبائیت کا سہرا سج چکا ہے۔ اس شہر کو سلاطین اسلام اور راجاؤں کے مسکن کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ اس شہر کو بقائے دوام کی سند مغلیہ سلطنت میں اس وقت حاصل ہوئی جب مغلیہ حکمرانوں نے اس شہر کا نام سرکار سنبھل رکھا۔ اس وقت کے دستاویزات میں اس مقام کا نام سرکار سنبھل ہی ملتا ہے۔ پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع میں سنبھل سلطان سکندر لودھی کی صوبائی دارالحکومت بھی رہ چکا ہے۔ اسی شہر میں آج بھی تومر حاکم پرتھوی راج کے نانا راجہ ہجات کے قلعہ کے دیرینہ آثار محلہ کوٹ میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سنبھل کی قدیم تاریخ متعدد مذہبی کتب سے معلوم ہوتی ہے۔ ہندو مذہب کی روایت کے مطابق پرانوں میں سنبھل کا ذکر 'سنبھلا گرام' کے نام سے موسوم ہے۔ 'اسکند مہاپران' کے باب سوم، اشلوک 89 کے ذیل میں 'ست یگ' میں سنبھل کا نام 'ستیہ برت'، 'تریتا یگ' میں 'مہدوگری'، 'دواپر' میں 'پنگل' اور 'کل یگ' میں 'سنبھل' نام کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں 68 تیرتھ اور 19 کنویں ہیں۔ ٹالمی کے 'سنبکل' کو 'سنبھل' ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک ایسا پورانک عقیدہ ہے کہ کل یگ میں وشنو کے دس ویں اوتار کا ظہور 'کلکی بھگوان' کی شکل میں شنبل نامی گاؤں میں ہوگا اور اس شنبل گاؤں سے مراد سنبھل ہی ہے۔ اس کا ذکر بھگوت گیتا کے بارہویں اسکند میں بھی ملتا ہے۔ اسی کے چلتے 19 فروری 2024 کو وزیراعظم نریندر مودی نے سنبھل ضلع کے اینچ واڈا گاؤں میں بھگوان کلکی مندر کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

شہر سنبھل کی تاریخی حیثیت تو اپنی جگہ مسلم ہے ہی اس کی علمی حیثیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تقریباً ہر دور میں ہی یہاں بڑے بڑے علما و فضلا،

دانشور اور صحافی و ادیب گزرے ہیں۔ جنھوں نے مختلف النوع کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد یہاں سے بھی یکے بعد دیگرے کئی اخبارات شائع ہونے شروع ہوئے۔ سنبھل سے شائع ہونے والے پہلے اخبار کو لے کر محققین یک رائے نہیں ہیں۔ کچھ حضرات 'جامع جمشید' تو کچھ 'اسٹریچی گزٹ' کو سنبھل کا پہلا اردو اخبار تسلیم کرتے ہیں۔ حقائق کی روشنی میں احقر کی رائے کے مطابق جامع جمشید سنبھل سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار ہے۔ ذیل کے سطور میں سنبھل سے شائع ہونے والے اخبارات پر روشنی ڈالتے ہیں:

جامع جمشید: اس اخبار کو سنبھل کا پہلا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اختر الدولہ کے مطابق جامع جمشید کا رسم اجرا 5 ستمبر 1870 کو محلہ سنبھلی دروازہ سے سید جمشید علی نے کیا۔ حالانکہ یہ مئی 1870 کو جاری ہوا تھا۔ یہ اخبار اپنے مذہبی مضامین کے لئے مشہور تھا۔ یہ اخبار ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ 1

اسٹریچی گزٹ: اس اخبار کی رسم اجرا 1872 کو عمل میں آئی۔ جس کے بانی سید زین العابدین تھے۔ یہ بھی ایک ہفتہ واری اخبار تھا۔ 2

نیر اعظم: یہ سنبھل سے شائع ہونے والا تیسرا ہفتہ واری اخبار ہے جس کی اشاعت 1876 میں ہوئی۔ جس کے بانی مدیر قاسم علی ذکاء تھے۔ 3

نجم الہند: اس اخبار کی اشاعت 1881 کو عمل میں آئی۔ اس ہفتہ واری اخبار کے مدیر اول پنڈت پرتاپ کشن تھے۔ 4

اخبار نیر اعظم

شہر سنبھل کی تاریخی حیثیت تو اپنی جگہ مسلم ہے، ہی اس کی علمی حیثیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تقریباً ہر دور میں ہی یہاں بڑے بڑے علما و فضلا، دانشور اور صحافی و ادیب گزرے ہیں۔ جنھوں نے مختلف النوع کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

عین الاخبار: اس ہفتہ واری اخبار کو 1881 میں مولوی دلاور علی نے جاری کیا تھا۔ 5

نور الاخبار: یہ اخبار 1882 کو عزیز اللہ اور نور اللہ نے شائع کیا تھا۔ یہ اخبار ہفتہ میں دو مرتبہ شنبہ اور چہار شنبہ کو 6 ورق اوسط پر طبع ہو کر شائع ہوتا تھا۔ 6

نظام الاخبار: یہ اخبار 1884 کو شائع ہوا جس کے بانی قاضی فہیم الدین اور احتشام الدین تھے۔ یہ بھی ایک ہفتہ واری اخبار تھا۔ 7

نسیم سنبھل: سنبھل سے شائع ہونے والا یہ بھی ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ جس کو 1888 میں سید احمد حسن نے جاری کیا تھا۔ 8

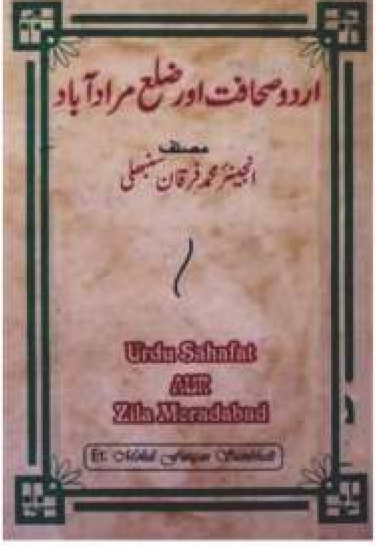

تجارت: سنبھل سے شائع ہونے والے اخبارات میں اس کا اہم مقام تھا۔ اس اخبار کی رسم اجرا 1924 کو ہوئی۔ یہ ہفت روزہ اخبار ہر ماہ کی 2، 11، 18 اور 26 تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کو مقبول بنانے میں اس کے مدیر آر جی مشرا کا اہم کردار تھا۔ یہ اخبار اپنے نام کی مناسبت سے اشتہارات کے لیے وقف تھا۔ اس میں شائع ہونے والے زیادہ تر مضامین بھی تجارتی ہوتے تھے۔ اس کا سالانہ چندہ چار سو روپے تھا۔ اس اخبار کے سرورق پر بڑے بڑے حروف میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا یہ شعر چھپا ہوتا تھا۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو ہے خوف وذلت کے حلوہ سے بہتر

آفتاب: اس اخبار کا شمار سنبھل ہی نہیں بلکہ روہیل کھنڈ کے اہم اور معیاری اخباروں میں ہوتا تھا۔ یہ اخبار 1926 کو جاری ہوا تھا۔ جس کے چیف ایڈیٹر اعجاز احمد تھے۔ یہ اخبار ہندوستان کا ایک ایسا ہمہ گیر اخبار تھا جو اپنے دلچسپ اور عمدہ مضامین کے باعث نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں بھی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ اخبار ہر ماہ کی 2,9,16 اور 23 تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے بارے میں شمارہ نمبر 45 اور 46 نومبر 1943 جلد نمبر 18 کے صفحہ اول پر کندہ ہے:

''روہیل کھنڈ کا مشہور اخبار' آفتاب'

المہدی: اس اخبار کا شمار سنبھل سے شائع ہونے والے اہم اخبارات میں ہوتا ہے۔ اس اخبار کی اہمیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سابق صدر شعبۂ اردو ایم جی ایم پی جی کالج سنبھل محترم جناب سعادت علی صدیقی صاحب رقمطراز ہیں:

''المہدی کے چند بوسیدہ اوراق راقم کو دستیاب ہوئے ہیں جن پر 15 فروری 1942 درج ہے یہ اوراق جلد نمبر 15 شمارہ نمبر ایک کے ہیں جو مہدی حسین زیدی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں شائع ہوا تھا۔ سید مہدی حسین کی پوتی بیگم خورشیدہ جہاں زیدی کی تحریر کے مطابق المہدی 1927 کو شائع ہوا تھا اور 1941 میں بند ہو گیا تھا۔ 9

اس اخبار کے بانی و مدیر سید مہدی حسین وارثی المعروف جادو رقم سنبھلی تھے۔ صحیفۂ وارث میں ایک جگہ یہ عبارت نقل ہے کہ:

’’المہدی جو سنبھل مرادآباد سے ہفتہ وار سولہ صفحات پر نہایت آب وتاب سے زیر ایڈیٹر منشی سید مہدی حسین وارثی المعروف جادو رقم سنبھلی جو اخباری دنیا میں مشہور اور تجربہ کار ہیں، شائع ہوتا ہے۔ سنبھل کے اخباروں میں یہ ایک ہی پرچہ ہے جو اخبار کے نام کا مستحق ہے۔ جو مسلمانوں کی اخباری ضرورت کو حتی المقدور واحسن طریقے سے پورا کرتا ہے۔

کسی کی دل آزاری اور بیجا حمایت نہیں کرتا جس کے مضامین دلچسپ اور مفید، جس کی خبریں معتبر اور تنقیدات بے لاگ اور منصفانہ ہوتی ہیں بایں ہمہ چندہ سالانہ صرف تین روپیہ چار آنہ ہے اگر اس پر بھی ملک وقوم قدر نہ کرے تو بے حد افسوس ہے۔‘‘10

شہاب: اس اخبار کا شمار بھی سنبھل کے اہم اخباروں میں ہوتا تھا۔ یہ اخبار 1939 سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ جس کے بانی حبیب احمد اسرائیلی تھے۔

الحامد: یہ سنبھل سے شائع ہونے والا ماہنامہ اخبار ہے جس کی اشاعت 1970 کو عمل میں آئی۔ یہ اخبار جلد ہی بند ہوگیا تھا۔ اس کے بانی حبیب اشرفی تھے۔

پیغام شہادت: یہ اخبار 1985 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے بانی ومدیر جناب عبدالمجیب صدیقی تھے۔ عوام کی کم دلچسپی اور نااہل مدیروں کے چلتے یہ اخبار زیادہ عرصہ تک شائع نہ ہوسکا۔

عکس سنبھل: دور جدید میں سنبھل سے شائع ہونے والا یہ ایک اہم اخبار ہے۔ جس کی اشاعت پندرہ فروری 1986 کو عمل میں آئی۔ اس کے بانی نظام سنبھلی تھے۔ شروع میں یہ اخبار ملک وقوم کی خدمت پوری آب وتاب کے ساتھ کرتا رہا۔ اس میں شامل مضامین اور خبریں حقیقت کی عکاس ہوتی تھیں۔

سنگم: یہ ایم جی ایم پی جی کالج سنبھل سے نکلنے والی ششماہی میگزین ہے۔ اس امیگزین میں اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ سال 2015 سے 2024 کے درمیان اس میگزین کا صرف ایک ہی شمارہ منظر عام پر آسکا ہے۔

سنبھل سے شائع ہونے والے دوسرے اہم اخباروں میں آج کی کاشت، مرقع، نیچ بہادر، مسلم گزٹ، اہل سنت، الاشرف، نقوش اور ماہنامہ قلم قبیلہ کا نام قابل ذکر ہے۔

> ”
> اردو زبان وادب کو معیاری بنانے، اسے سنوارنے اور عوام میں مقبول بنانے میں اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اخبارات کے ذریعے اردو کے نثر کے خزانے میں نہ صرف بے شمار اضافہ ہوا ہے بلکہ کئی نئی اصناف وجود میں آئی ہیں۔
> “

دور حاضر میں سنبھل سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی تعداد نہ کے برابر ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ قوم کی اردو زبان سے دلچسپی کم ہونا ہے۔ سنبھل ایک ایسا شہر ہے جہاں مسلم قوم کی تعداد تقریباً 90 فیصد سے زائد ہے اس کے باوجود اردو اخبارات سے دوری اردو زبان وادب سے کم دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔ باہر سے شائع ہوکر سنبھل آنے والے اردو اخبارات کی تعداد دیگر زبانوں کے مقابلے قدرے کم ہے۔ انقلاب، ہمارا سماج، راشٹریہ سہارا نامی اخبارات کی چند کاپیاں ہی روزانہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔

سنبھل میں مسلم اکثریت کے چلتے دینی مدارس کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ یہاں کئی ایسے مدرسے ہیں جو مستقل طور پر اپنے مجلّہ شائع کرتے ہیں۔ ان میں شائع ہونے والے مضامین اکثر مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ مضامین تنقیدی وتحقیقی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں جو دور حاضر میں اردو زبان وادب کے خزانہ میں اضافہ کرتے ہیں اور قوم میں خصوصاً نوجوان نسل میں اردو زبان کو مقبول کررہے ہیں۔ اسی کے چلتے گذشتہ کچھ برسوں سے کالج سطح پر اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ دیکھا جارہا ہے۔

اردو زبان و ادب کو معیاری بنانے، اسے سنوارنے اور عوام میں مقبول بنانے میں اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اخبارات کے ذریعے اردو کے نثر کے خزانے میں نہ صرف بے شمار اضافہ ہوا ہے بلکہ کئی نئی اصناف وجود میں آئی ہیں۔ اگر ہم اردو کے فکاہیہ وطنزیہ ادب کا جائزہ لیں تو اس میں نوے فیصد حصہ صحافت کا شامل ہوگا۔ اگر اردو اخبارات ورسائل نہ ہوتے تو کالم نویسی، مضمون نگاری، انٹرویو نگاری اور افسانہ نگاری کا فروغ مشکل ہوتا کیونکہ ان کی اشاعت کا پہلا ذریعہ عموماً اخبارات و جرائد ہی ہوتے ہیں، مذکورہ مواد کتابی شکل میں بہت بعد میں منظر عام پر آتے ہیں۔ اردو صحافت نے ادب کے میدان میں یہ بھی کارنامہ انجام دیا ہے کہ حکایات، سفرنامے، موضوعاتی نظمیں، قصے، کہانیوں، سیاسی مضامین، قانونی اور پارلیمانی مباحث اور طبی اور سائنسی موضوعات کو اخبارات کے صفحات پر جگہ دی ہے۔

کتابیات

1. بحوالہ نادر علی خاں، ہندوستانی پریس، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1990 ص 360
2. ایضاً
3. ایضاً
4. بحوالہ نادر علی خاں، ہندوستانی پریس، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1990، ص 361
5. ایضاً
6. ایضاً
7. ایضاً
8. بحوالہ نادر علی خاں، ہندوستانی پریس، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1990، ص 362
9. بحوالہ مولانا عبدالمعید سنبھلی قاسمی، تاریخ سنبھل، مکتبہ طیبہ، سنبھل، 2002، ص 217
10. ایضاً۔

■

Dr. Naved Ahmad Khan
Asst. Professor, Dept of Urdu
M G M College
Sambhal- 244302 (UP)
Mob.:9568855136
navedahmed1234@gmail.com

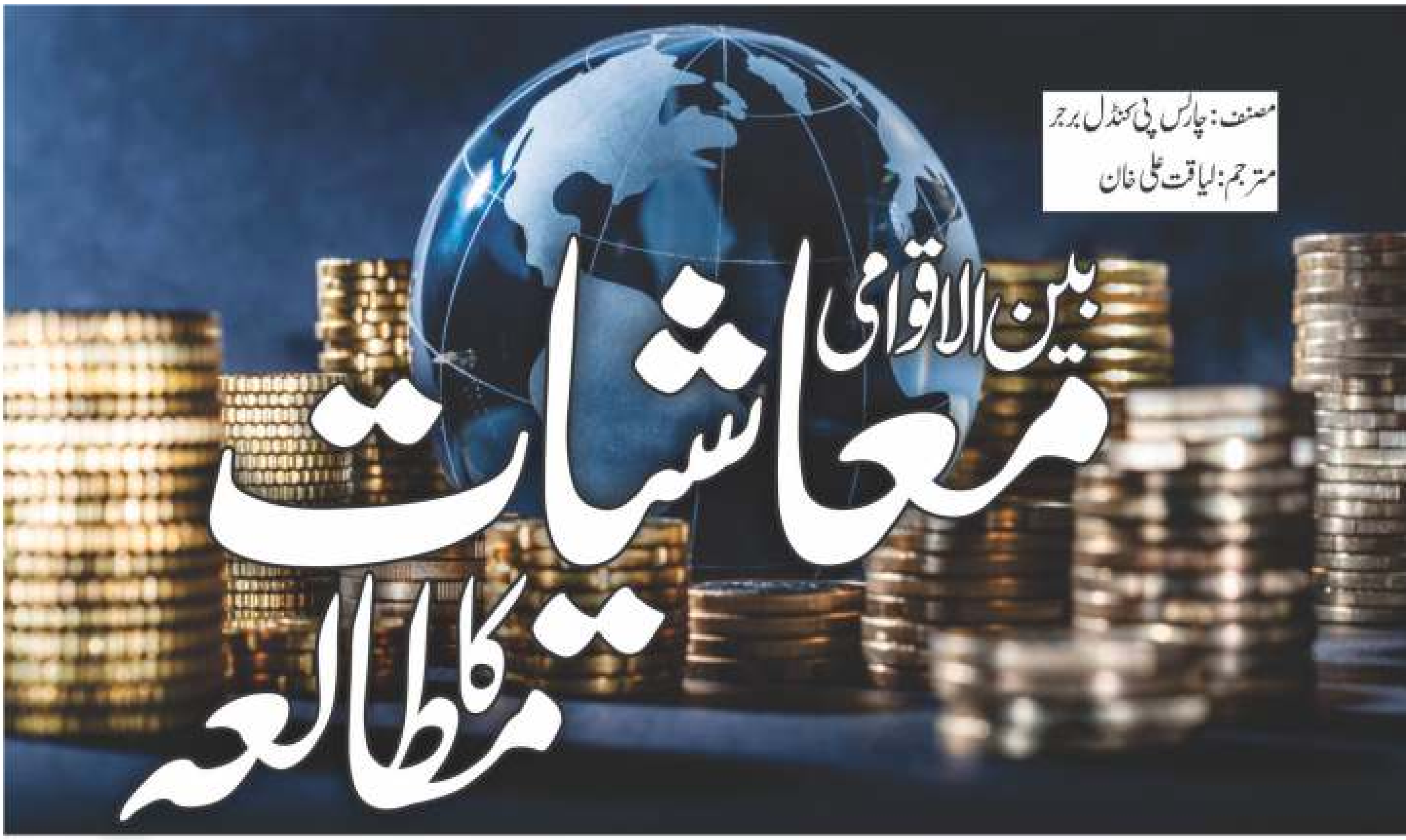

بین الاقوامی معاشیات کا مطالعہ

مصنف: چارلس پی کنڈل برجر
مترجم: لیاقت علی خان

بین الاقوامی تجارت اور معاشیات

بین الاقوامی تجارت کا مطالعہ شروع کرنے والا طالب علم بے جا طور پر یہ سوال کر سکتا ہے کہ اس موضوع کو معاشیات کی علاحدہ شاخ کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ زر اور بنک کاری، معاشیات محنت اور نظریہ قیمت سب ہی کو مضمون کے نمایاں حصے قرار دینے کی معقول وجہ ہے۔ تاہم بین الاقوامی تجارت کے میدان میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام معاشی اصولوں کو صرف ایک خاص ڈھنگ سے استعمال کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی تجارت وسائل کے استعمال اور مبادلہ سے متعلق مسائل پر عصری معاشیات میں بحث کی جا سکتی ہے اور اس کے زر آمدنی والے حصہ پر معاشیات کلاں میں پس کیوں نہ اس مضمون کی جداگانہ حیثیت کو ختم کیا جائے۔؟

یہ ایک معقول سوال ہے اور اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی تجارت کو نمایاں حیثیت اس لیے دی جاتی ہے کہ (1) ایسا کرنا ایک پرانا دستور ہے۔ (2) حقیقی دنیا میں بین الاقوامی معاشی سوالات بہت سے فوری اور اہم مسائل کو سامنے لاتے ہیں۔ (3) بین الاقوامی تجارت اور داخلی تجارت کے قوانین اور ضابطے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور (4) بین الاقوامی تجارت کا مطالعہ علم معاشیات کے بارے میں ہماری سمجھ بوجھ کو روشنی دیتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا ہے۔

بین الاقوامی تجارت کی روایات

آج کی دنیا میں ذہنی انقلاب کی رفتار تیز ہے اس لیے بہت سے طلبا کہہ سکتے ہیں کہ صرف روایات کو برقرار رکھنے کی خواہش بین الاقوامی تجارت کے علاحدہ مطالعہ پر بہت زیادہ مجبور نہیں کر سکتی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے معاشی فکر کی تاریخ میں بین الاقوامی تجارت کو الگ رکھنا اور ان کے بارے میں آدم اسمتھ، ریکارڈو میل اور مارشل کے نظریات کو جان لینا ہی کافی ہوگا۔ اس کے علاوہ سوئیڈن کے جدید معاشی برٹل امین نے ثابت کر دیا ہے کہ بین علاقائی اور بین اقوامی تجارت میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے پھر کیوں نہ بین الاقوامی کو بین علاقائی معاشیات میں شامل کر لیا جائے۔

لیکن واضح رہے کہ بین الاقوامی تجارت کی جداگانہ حیثیت کا انحصار صرف نظریاتی بحث پر نہیں ہے۔ معاشیات کو سیاسی فلسفے سے سماجی سائنس میں ڈھالنے کے لیے حقائق اور اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع میں ان اعداد و شمار کو حاصل کرنے کے صرف دو ذرائع تھے۔ شہروں اور گاؤں کے الگ الگ بازار اور بادشاہوں کی کسٹم چوکیوں کے ریکارڈ۔ بازار سے ملنے والے اعداد و شمار کو یکجا کر کے معاشی صورت حال کی پوری تصویر بنا لینا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ تمام بازاروں کے بارے میں جانکاری نہ مل پاتی تھی۔ داخلے کے بندرگاہوں پر جمع کی گئی معلومات کی مدد سے صرف بیرونی تجارت کا خاکہ تیار کیا جا سکتا تھا۔ غیر قانونی درآمد اور برآمد کے سبب پیدا ہونے والے فرق کو چھوڑ کر یہ خاکہ ٹھیک ہی ہوتا تھا۔ پس بیرونی تجارت سے متعلق اعداد و شمار اس مواد کا پہلا سرچشمہ تھے جس کو معاشیات میں تجرباتی تحقیقات کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس کے علاوہ معاشی عناصر میں آپسی تعلق کا مطالعہ قومی سطح پر شروع ہونا چاہیے، کیونکہ صرف یہی ایک ایسی اکائی ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس حسب ضرورت اعداد و شمار ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی معاشی مسائل

لیکن بین الاقوامی معاشیات کا مطالعہ ایک علاحدہ مضمون کے طور پر کرنے کے لیے دوسری اور زیادہ اہم وجوہات موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بین الاقوامی معاشیات اور دوسرے مضامین کی تفصیلات ایک ہی جیسی ہوں لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زرد بنک کاری اجرت اور قیمت معاشیات کی ان تین علاحدہ شاخوں کو ہی لیجیے جن سے ہم نے مقابلہ کا آغاز کیا تھا۔ ان سے متعلق مسائل کا حل قومی سطح کی نسبت بین الاقوامی میدان میں کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

زر اور بنک کاری میں بین الاقوامی مسائل زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ کچھ ملکوں

بین الاقوامی تجارت کی جداگانہ حیثیت کا انحصار صرف نظریاتی بحث پر نہیں ہے۔ معاشیات کو سیاسی فلسفے سے سماجی سائنس میں ڈھالنے کے لیے حقائق اور اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع میں ان اعداد و شمار کو حاصل کرنے کے صرف دو ذرائع تھے۔ شہروں اور گاؤں کے الگ الگ بازار اور بادشاہوں کی کسٹم چوکیوں کے ریکارڈ۔ بازار سے ملنے والے اعداد و شمار کو یکجا کر کے معاشی صورت حال کی پوری تصویر بنا لینا ممکن نہ تھا۔

میں جیسے ارجنٹائن ہندوستان اور ترکی میں زرمبادلہ کا بحران کافی سنگین اور پرانا ہے اور کچھ دوست ممالک جیسے برطانیہ میں اتفاقی اور عارضی یورپ کے ملکوں کے میزان ادائیگی میں دس سال تک متواتر بیشی رہی مگر 1963 کے تقریباً بیت جانے پر انھیں کبھی بیشی کبھی کمی کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے میزان ادائیگی کا صحیح تصور کیا ہوگا اور مصنف کی رائے میں حتمی طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ یو ایس اے کی بیرونی تجارت میں وہ خسارہ فی الواقع ہے بھی یا نہیں جس کے بوجھ تلے عام خیال کے مطابق امریکہ دبا جا رہا ہے۔ یہ مسائل واضح کرتے ہیں کہ عالمی سطح کی نسبت کسی ایک ملک کے اندرادائیگیوں میں کہیں زیادہ ٹھہراؤ ہوتا ہے۔

اجرتوں کے سلسلے میں علاقائی دشواریاں پیدا ضرور ہوتی ہیں تاہم اپنے پھیلاؤ اور اہمیت کے اعتبار سے وہ ان مشکلات سے مختلف ہوتی ہیں جن کا سامنا بین الاقوامی تجارت کے میدان میں کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر نیو انگلینڈ کے سوتی ملوں میں کام کرنے والوں کا کارولیناز اور جنوب کے دوسرے علاقوں کے مزدوروں سے مقابلہ رہتا ہے مگر وہ ان کی اجرتوں میں اضافے کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ لوہے کی صنعت میں مزدوروں کی یونین جو سمجھوتے کرتی ہے ان میں ایک ہی جیسے کام کے لیے اجرتوں میں کسی علاقائی فرق کو گوارا نہیں کیا جاتا۔ ٹیمسٹر یونین ٹرک ڈرائیوروں کے لیے پورے ملک میں اجرتوں کو یکساں کرانا چاہتی ہے لیکن یو ایس اے میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں ایک ہی پیشے میں لوگوں کو کیا ملتا ہے مقامی طور پر نہ تو مزدور اس بارے میں عام طور پر بیدار ہیں اور نہ ہی اس سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس بین الاقوامی تجارت کے میدان میں ہم دوسرے ملکوں کی 'کنگال محنت' سے غیر پسندیدہ مقابلہ کی شکایت برابر سنتے رہتے ہیں۔

قیمتوں سے متعلق بین علاقائی مسائل زیادہ تیزی اور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسان برابری کے خواہاں ہوتے ہیں۔ شہری لوگ رہن سہن کی اونچی لاگت کے بارے میں تشویش کا شکار رہتے ہیں۔ ہنگامی حالات میں قیمتوں کے طرزِ عمل کو بدلنے کے لیے ان پر کنٹرول لاگو کر دیا جاتا ہے لیکن عالمی سطح پر تو قیمتیں شاید ہی کبھی مناسب و معقول تصور کی جاتی ہیں۔ پسماندہ ملکوں کو شکایت ہے کہ ابتدائی چیزوں پر جنھیں وہ فروخت کرتے ہیں نفع کم ملتا ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ان چیزوں کی قیمت (وہ برازیل کی کافی ہو یا چلی کا تانبہ، ملایا کا ربر یا ٹن ہو یا کچھ اور) مناسب اور منصفانہ ہونی چاہیے۔

ہمارے سامنے بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ اگر پسماندہ ملک بگڑی ہوئی شرائطِ تجارت (ان قیمتوں کا آپسی رشتہ جن پر وہ خریدتے اور بیچتے ہیں) کے بارے میں فکرمند ہیں تو ساتھ ہی ترقی یافتہ ممالک خاص طور پر برطانیہ اپنے کاروبار کی شرائط کو خطرناک حد تک غیر موافق سمجھتے ہیں۔

اوپر پیش کی گئی دلیلیں فیصلہ کن نہیں ہیں تاہم یہ خیال بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ہی حکومت کے دائرہ اختیار میں رہنے والے معاشی مسائل کے مقابلے میں ممالک کے مابین ابھرنے والے مسائل کی نوعیت مختلف اور ان کا حل زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

بین الاقوامی مسائل بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں اور ان کو سلجھانا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے بدلتے رہنے کا ایک الگ انداز ہے۔ 1920 سے شروع ہونے والے دس سالوں میں سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ جرمنی اتحادیوں کو جنگ کا ہرجانہ کیسے ادا کرے اور اتحادی یو ایس اے کا جنگی قرضہ کس طرح واپس کریں۔ 1990 کی دہائی میں سب سے بڑا مسئلہ روزگار کا ہو گیا۔ اس مسئلہ کا بین الاقوامی پہلو یہ تھا کہ کسی ملک کو اپنی بیروزگاری دوسرے ملکوں میں پھیلانے سے کیسے روکا جائے۔ دوسری بڑی جنگ کے بعد بین الاقوامی معاشی مسئلہ پھر بدلا۔ چالیسویں دہائی کے آخری برسوں میں یورپ اور مشرق بعید کے ملکوں کی دوبارہ تعمیر کا مسئلہ درپیش تھا۔ 1990 کی دہائی میں تجارت کی توسیع اور مبادلہ زر کی بحالی توجہ کا مرکز بنے۔ ساٹھویں دہائی کے آخر میں تو گوناگوں مسائل کا گویا ڈھیر ہی لگ گیا۔ جنگ کے بعد سے 1957 تک ڈالر کی کمیابی کو نمایاں

حیثیت حاصل تھی۔ اب اس کی جگہ یو ایس۔ اے کے میزان ادائیگی میں رونما ہونے والے خساروں نے لے لی۔ یورپ (بغیر یا بشمول برطانیہ)، وسطی اور لاطینی امریکہ، یورپی افریقہ، مشرق وسطی وغیرہ کے مختلف علاقوں میں ترقی پذیر ملک کے درمیان معاشی تعاون کے مسائل سامنے آئے۔ ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک کے بیچ تجارت اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک بات قدرے دلچسپ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے اپنے درمیان تجارت پر رکاوٹوں کو کافی کم کر دیا ہے۔ لیکن کم ترقی یافتہ ملکوں سے آنے والی اشیا کی راہ میں ان کے یہاں رکاوٹی دیواریں آج بھی پریشان کن حد تک اونچی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان ہی ملکوں کی معاشی امداد کے لیے ترقی یافتہ قومیں بڑے بڑے وعدے کرتی ہیں۔ پھر موجودہ عالمی زرعی نظام کو بہت سے معاشی، ساہوکار، اور سیاستداں کسی نہ کسی پہلو سے غیر تسلی بخش سمجھتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس نظام کو کس طرح ایسا روپ دیا جائے جس سے اس کے بارے میں تشویش کچھ کم ہو۔

بین علاقائی بنام بین الاقوامی تجارت

بین علاقائی اور بین الاقوامی تجارت میں وہ کون سا فرق ہے جو ان دونوں میں پیدا ہونے والے معاشی مسائل کی نوعیت اور شدت میں پائے جانے والے اختلافات کو واضح کر سکے؟ بین الاقوامی اور گھریلو تجارت کے اصول اور ضابطے کیوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟

ان سوالوں کے مختلف جواب دیے گئے ہیں اور کوئی ایک جواب ضروری نہیں ہے کہ دوسرے جواب کی کاٹ ہی کرتا ہو۔ پرانے زمانے کے ماہرین معاشیات نے وسائل پیداوار — زمین، محنت اور سرمایہ — کے بین علاقائی اور بین الاقوامی طرز عمل میں فرق کو امتیاز کی بنیاد قرار دیا۔ بعض لوگوں کی رائے میں زر اور نظام زر کے اختلافات دونوں کو الگ کرتے ہیں۔ نئے حریت پسند لفظ حریت پسندی کو ایک خاص مفہوم دیتے ہوئے بین الاقوامی تجارت میں سرکار کی مداخلت کو بنیادی معاملہ سمجھتے ہیں۔ سیاسی نظریہ کے مطابق وجہ اختلاف قومی استحکام کے تقاضے ہیں۔

بہر حال اہم بات یہ ہے کہ بین علاقائی اور بین الاقوامی تجارت کے اس پہلو کو واضح کیا جائے جو ان دونوں کو باقی معاشیات سے علاحدہ کرتا ہے۔ ان دونوں موضوعات میں اہم چیز علاقہ ہے۔ عمومی توازن کا نظریہ عام طور پر یہ تاثر دیتا ہے کہ گویا قومی معیشت پورے علاقے میں کسی ایک نقطہ پر قائم ہے اور بہت سی مختلف معیشتیں

> قیمتوں سے متعلق بین علاقائی مسائل زیادہ تیزی اور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسان برابری کے خواہاں ہوتے ہیں۔ شہری لوگ رہن سہن کی اونچی لاگت کے بارے میں تشویش کا شکار رہتے ہیں۔ ہنگامی حالات میں قیمتوں کے طرز عمل کو بدلنے کے لیے ان پر کنٹرول لاگو کر دیا جاتا ہے لیکن عالمی سطح پر تو قیمتیں شاید ہی کبھی مناسب و معقول تصور کی جاتی ہیں۔

ایک دوسرے کے پاس الگ الگ نقاط کی شکل میں ہیں۔ ایسی صورت میں اشیا اور خدمات بنا لاگت حرکت کرتی ہیں اور عمومی توازن سے متعلق بحث کا یہ بنیادی مفروضہ سمجھا جاتا ہے۔ بین علاقائی اور بین الاقوامی تجارت کے بیان میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں بہت سے مقاصد کے لیے بنا لاگت حرکت کا مفروضہ عمومی توازن کے نظریہ سے مستعار لیا جاتا ہے لیکن اور بہت سے معاملات میں اس کو کھلے طور پر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ چھٹے باب میں ہم قیمتوں، اشیا کی نقل و حرکت، اور صنعت کے 'قید مقام' پر جگہ کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

عوامل کی صلاحیت نقل و حرکت

بین الاقوامی اور گھریلو تجارت کے فرق کو واضح کرنے کے لیے پرانے معاشیوں نے پیداواری عوامل کے طرز عمل پر کافی زور دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کے اندر تو محنت اور سرمایہ حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن عالمی سطح پر یہ صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ اگر ہم جغرافیائی صلاحیت حرکت کو نظر انداز کر کے معاملہ کو استعمال کے اعتبار سے دیکھیں تو کسی ملک کے اندر زمین تک متحرک دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اراضی کے ایک ہی ٹکڑے کو حسب خواہش کبھی گیہوں اگانے اور کبھی مویشی پالنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ امکان اس میں محدود حرکت پیدا کر دیتا ہے۔ ملک کے اندر عوامل پیداوار کی حرکت پذیری کو اس لیے اہمیت دی جاتی تھی کہ اس کی وجہ سے اس میں عوامل کا معاوضہ تقریباً یکساں رہتا تھا لیکن عالمی سطح پر اس صلاحیت کے فقدان کی وجہ فرانس میں ایک جیسی ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن اجرت کی اس سطح کا ان ہی جیسے جرمن یا اطالوی برطانوی یا آسٹریلیائی مزدوروں کی سطح اجرت سے کوئی تعلق ہونا ضروری نہیں تھا۔ اگر کسی بنکر کو پیرس کی نسبت لیونز میں زیادہ اجرت ملتی تو پیرس سے بنکر اتنی تعداد میں لیونز جانے لگتے کہ وہاں اجرتیں کم اور پیرس میں زیادہ ہونے لگتیں اور یہ عمل دونوں مقامات پر اجرتوں کے لگ بھگ یکساں ہو جانے تک جاری رہتا۔ اس کے برعکس لیونز اور میلان، ڈرسڈن، مانچسٹر، یا نیو بڈفورڈ کے درمیان ایسی کوئی قوتیں کارفرما نہیں ہوتیں جو اس یکسانیت کو قائم رکھ سکیں۔ ان شہروں میں بنکروں کی اجرتوں کا تعین بالکل آزادانہ طور پر ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر اثر ڈالے بغیر گھٹ بڑھ سکتی ہیں۔ زمین اور سرمایہ کے بارے میں ملک کے اندر عوامل کے معاوضوں میں یکسانیت اور ملکوں کے بیچ ان میں فرق کی موجودگی کو بھی حقیقی تصور کیا جاتا تھا۔

عالمی سطح پر ہی نہیں ملکوں کے اندر بھی نقل و حرکت کی راہ میں کافی رکاوٹیں موجود ہوتی ہیں۔ اوپر دی گئی پیرس اور لیونز کی مثال زیادہ صحیح نہیں ہے کیونکہ فرانسیسی طبعاً ایک سے دوسرے مقام پر جا کر بسنا پسند نہیں کرتے۔ امریکہ میں لوگ بڑی تعداد میں ترک سکونت جنگ جیسے محرکات کے زیر اثر ہی کرتے ہیں۔ پہلی عالمی

جنگ کے زمانے میں اور اس کے فوراً بعد اوہیو، مشیگن، اور ایلی نائس پر جنوب سے حملے ہوئے اور لوگ کافی بڑی تعداد میں کیلیفورنیا اور ٹکساس کی جانب چلے گئے۔ ایسا ہی دوسری عالمی جنگ کے دوران بھی ہوا تاہم بڑے پیمانے پر افراد کی نقل وحرکت عام نہیں ہے۔

یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ بین علاقائی اور بین الاقوامی نقل وحرکت کی صلاحیت کی شدت میں فرق ہوتا ہے۔ اور عام طور پر لوگ اندرون ملک نقل کرنا زیادہ پسند کریں گے بہ نسبت ملک کے باہر جانا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں زبان - رواج اور روایات میں یکسانیت ہونا ضروری نہیں تاہم دوسرے ملکوں کی بہ نسبت اندرون ملک اس کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

سرمایہ بھی ممالک کی نسبت اندرون ملک زیادہ متحرک ہوتا ہے تاہم ملک کے اندر بھی اس کی نقل وحرکت رکاوٹوں سے پورے طور پر مبرا نہیں ہے۔ شرح سود میں عام طور پر علاقائی فرق پائے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ملکوں کے بیچ سرمایہ بالکل ہی غیر متحرک نہیں ہے۔ حصہ چہارم میں ہم دیکھیں گے کہ ایک سے دوسرے ملک میں سرمایہ جانے سے کیا صورت حال سامنے آتی ہے۔

اس بحث کے باوجود قومی اور عالمی سطحوں پر عوامل پیداوار یکساں طور پر حرکت پذیر نہیں ہوتے۔ جس حد تک ان میں فرق ہوتا ہے اسی لحاظ سے بین الاقوامی تجارت کے اصول کبھی مختلف ہوتے ہیں۔ اگر نیو انگلینڈ کے خالص اون کے کپڑوں کی مانگ جنوب کے مصنوعی اونی ملاوٹ والے کپڑوں کے حق میں بدل جائے تو سرمایہ اور محنت دونوں وہاں سے جنوب میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر فرانسیسی ریشم کی مانگ کم اور... ریشم کی مانگ زیادہ ہو جائے تو فرانس سے اٹلی کی جانب سرمائے اور محنت کی ایسی حرکت رونما نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں ضروری تبدیلی کے لیے دوسرے طریقہ کار کی حاجت پڑتی ہے۔

مختلف کرنسیاں

عام انسان کے لیے گھریلو اور بین الاقوامی تجارت میں خاص فرق یہ ہے کہ آخر الذکر میں مختلف ممالک کی کرنسیوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈار کیلیفورنیا میں اتنا ہی مقبول عام ہے جتنا مینا من میں۔ سوئس اب تک بیسل

طلائی معیار میں مبادلہ شرحیں مقرر رہتی ہیں اور ان میں تبدیلی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اگر دنیا کی سبھی کرنسیاں طلائی معیار پر ہوں تو مبادلے کی شرحیں مستحکم رہیں گی۔ اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں فرق درحقیقت مختلف کرنسیوں کے وجود سے نہیں بلکہ غیر ملکی شرح مبادلہ کے بارے میں مختلف ممالک کی پالیسیوں میں اختلاف کے سبب پیدا ہوتا ہے۔

سرکار کا سکہ ہے لیکن وہاں سے صرف چند میل پر واقع اسٹراسبرگ (فرانس) یا فرائی برگ (جرمنی) سے اشیا خریدنے کے لیے تب ہی استعمال کیا جاسکتا ہے جب اسے فرانسیسی فرینک کا جرمن مارک میں تبدیل کرلیا جائے۔

بہر حال اگر ذرا باریکی سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ زیادہ اہم کرنسیوں کا فرق نہیں بلکہ ان کی آپسی شرح مبادلہ کے بدل جانے کا امکان ہے۔ جب سوئٹزرلینڈ، بلجیم اور فرانس لاطینی زرئی یونین کے ممبر تھے اور تینوں فرینک 'ایک کے بدلے ایک' کی شرح پر آپس میں بدلے جاسکتے تھے اس وقت کوئی بھی شخص (تاوقتیکہ وہ کچھ خریدنے والا ہی نہ ہو، اس بارے میں شاید ہی کوئی دلچسپی رکھتا تھا کہ اس کے پاس تینوں میں سے کون سا فرینک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خریداری کے وقت اس فرینک کا پاس ہونا ضروری تھا جسے چیز کو فروخت کرنے والا قبول کرنے کو تیار ہو لیکن اگر (1) شرح مبادلہ پہلے سے مقرر ہو (ii) اس کے آپس میں بنا روک ٹوک بدلے جاسکیں اور (iii) ان دونوں صورتوں کے لیے دینے کی امید ہو تب کرنسیوں کا اختلاف بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

بین الاقوامی تجارت کا یہ پہلو صاف طور پر سرمایہ کی حرکت پذیری سے تعلق رکھتا ہے۔ یو ایس اے میں سرمایہ کی آزادانہ نقل وحرکت کا سبب یہ ہے کہ فلوریڈا سے من سوٹا تک ڈالر صرف ڈالر ہے اور کچھ بھی نہیں (گو 1932 اور 1968) کے ڈالر قوت خرید کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ملک کے اندر سرمائے کی نقل وحرکت زیادہ ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔ مثلاً قرض دینے اور لینے والے دونوں ایک ہی قانون کے پابند ہوتے ہیں اس لیے قرضوں کی وصولیابی آسان ہو جاتی ہے لیکن قابل ذکر فائدہ یہ ہے کہ زر سے متعلق تمام اندیشے اور شبہات مٹ جاتے ہیں۔ کرنسیوں کی شرح مبادلہ میں تبدیلی سرمائے کی نقل وحرکت کو متاثر کرسکتی ہے۔ بعض حالات میں یہ حرکت بڑھ جائے گی۔ مثلاً جرمن فارک کے بدلے زیادہ برطانوی پونڈ ملنے کی امید برطانوی سرمائے کو جرمنی جانے پر اکسائے گی۔ مجموعی طور پر غیر ملکی کرنسیوں کی قیمت میں رد و بدل کا اندیشہ لوگوں میں سرمائے کو ملک ہی میں رکھنے کا رجحان پیدا کرتا ہے لیکن محکم شرحوں کے ایک طویل دور کے بعد سرمایہ دنیا میں گھومنے پھرنے کے لیے زیادہ دلیر ہو جاتا ہے اور اس کی گھریلو اور بین الاقوامی حرکت پذیری تقریباً ایک سی ہو جاتی ہے۔

طلائی معیار میں مبادلہ شرحیں مقرر رہتی ہیں اور ان میں تبدیلی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اگر دنیا کی سبھی کرنسیاں طلائی معیار پر ہوں تو مبادلے کی شرحیں مستحکم رہیں گی۔ اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں فرق درحقیقت مختلف کرنسیوں کے وجود سے نہیں بلکہ غیر ملکی شرح مبادلہ کے بارے میں مختلف ممالک کی پالیسیوں میں اختلاف کے سبب پیدا ہوتا ہے۔

■

ماخذ: بین الاقوامی معاشیات، **مصنف:** چارلس پی کنڈل برجر، **مترجم:** لیاقت علی خاں، **دوسری طباعت:** 2010، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شکیل افروز

ف س اعجاز سے انٹرویو

شکیل افروز: 'ماہنامہ انشاء' نے اپنی اشاعت کے 40 برس پورے کر لیے۔ اس کے لیے آپ کو مبارکباد۔ اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں؟

ف س اعجاز: 1986 میں میں نے ماہنامہ انشاء شروع کیا تھا۔ پیشتر ایک رسالہ 1966 میں اپنے بڑے بھائی عطاالرحمٰن صاحب کے ساتھ شائع کیا تھا 'فانوس ڈائجسٹ'۔ وہ ملک کا پہلا اردو ڈائجسٹ اور کلکتہ کا پہلا فوٹو آفسیٹ رسالہ تھا۔ حالانکہ زیادہ عرصہ آفسیٹ سے نہیں نکل سکا۔ تب اردو زبان کے حالات ایسے حوصلہ شکن نہ تھے۔ حوصلوں کی داد دی جاتی تھی۔ کلکتہ میں 9 اردو اخبارات نکلتے تھے جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اردو کے حالات کیسے تھے۔ آزاد ہند کے علاوہ بھی چار پانچ معروف اخبار جیسے عصرِ جدید، امروز، روزانہ ہند، اور شام کا اخبار آبشار کسی نہ کسی حلقہ میں پہنچتے تھے۔ لیکن کلکتہ میں کوئی ادبی رسالہ مستقل حیثیت کا کبھی نہیں تھا۔ جب انشاء نکالا تو تین برس کے بعد سے ایسا لگا کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ اس سے بہتر تھا میں کوئی روزنامہ نکال لیتا۔ بعض حلقوں سے آواز بھی اُٹھی کہ کوئی اخبار نکالا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ آپ اخبار اچھا نکال سکتے تھے۔ کلیم الدین شمس تو بضد تھے۔ لیکن میری یہی سوچ تھی کہ ادب اور صحافت کی خدمت ادبی رسالے کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میں دن میں صحافت کے لیے وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ میرا کاروبار اور گھریلو ذمے داریاں تھیں۔

ش ا: اس زمانے میں اور موجودہ دور میں کیا فرق ہے؟

ف س ا: اس وقت اور اب میں کافی فرق ہے۔ اُس زمانے میں ہر بڑے چھوٹے شہر میں ہاکر ہوا کرتے تھے جو اخبار اور رسالے دونوں فروخت کیا کرتے تھے۔ خاص نمبر بھی نکلتا تھا تو کچھ وہ بھی منگوا لیا کرتے تھے۔ لیکن رقم کی ادائیگی کا سلسلہ کبھی اچھا نہیں تھا۔ وہ ادھار منگواتے تھے اور پیسے ہضم کر لیا کرتے تھے۔ ایسے میں اپنے حوصلے کو ہی سرمایہ بناتا تھا۔ کوئی خریدے نہ خریدے۔ سرمایہ بھی اپنا، ہمت بھی اپنی، بقایا ادا ہو یا نہ ہو۔ اشتہارات کا مسئلہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے لیکن کلکتہ اشتہارات کے تعلق سے دوسرے شہروں سے اچھا تھا۔ تاہم اب مشتہرین کا رویہ بدل گیا ہے۔ آج ڈیجیٹل میڈیا ہے۔ اب لوگ پرنٹ میڈیا کو اس طرح نہیں لیتے۔ اس سے حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ رسالہ جاری رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔

انشاء پہلا رسالہ ہے جس کے ذریعے ثقافتی پروگرام بھی ہوتے اور اشاعتی سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں۔ اس وقت کوئی دوسرا صحافتی ادبی پبلی کیشن نہیں تھا۔ بیشتر اداروں سے زیادہ تر نصابی یا دینی کتابیں چھپتی تھیں۔ میں انشاء پبلی کیشنز سے اپنی کتابوں کے ساتھ کچھ کچھ دوسروں کی کتابیں بھی چھاپتا تھا۔ آہستہ آہستہ انشاء پھیلا اور بیرونِ ملک گیا تو وہاں کے ادیبوں کی کتابیں چھاپیں اور یہاں سے اکسپورٹ بھی کیا۔ اب ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی Localisation ہو گیا ہے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اردو ادیبوں کا مذاق (Taste) ذرا پیچیدہ قسم کا ہے۔ بہرحال اخبار کم خریدے جا رہے ہیں۔ رسالے بھی کم فروخت ہو رہے ہیں اور رسالے یہاں ہیں بھی کتنے۔ یہ ساری باتیں اشاعتی مسائل سے جڑی ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے ادیب اور شاعر انشاء میں چھپتے رہے۔ خواجہ احمد عباس، رام لعل، آنند نرائن ملا، قمر رئیس، تنویر احمد علوی، تارا چرن رستوگی، مانک ٹالہ، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، گوپی چند نارنگ اور درجنوں صفِ اوّل کے قلمکار انشاء میں چھپے۔ سب کے نام اچانک یاد بھی نہیں آتے۔ ان کے علاوہ پاکستان اور دیگر ممالک کے بھی۔ ان ادیبوں کی تحریریں کلکتہ کے کسی اور رسالے میں نہ تو اس سے پہلے چھپیں اور نہ انشاء کے علاوہ کہیں اور نظر آئیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انشاء کے ذریعے کلکتہ کا اشاعتی ماحول کیسا ہو گیا تھا۔

ش ا: انشاء میں کتابوں پر تبصرے اہتمام سے چھپتے رہے ہیں؟

ف س ا: ہاں وہ اس لیے کہ ہم کتاب اور مصنف کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ انشاء سے پہلے کلکتہ کے رسالوں میں تبصروں کی عام روش نہیں تھی۔ مبصر تھے ہی نہیں۔ اکا دکا کوئی ادھر ادھر اخبار میں لکھ دیا کرتا تھا۔ قمر رئیس صاحب کے مشورے پر میں نے خود تبصرے لکھنا شروع کیے۔ اب تک 250 سے زائد تبصرے لکھے ہوں گے۔ انشاء نے باقاعدہ یہاں مبصرین بنائے۔ اُس وقت جو انشاء سے وابستہ تھے اُن میں رئیس الدین فریدی، پروفیسر ہیرالال چوپڑہ، کبھی کبھی سالک لکھنوی اور بعض تبصرے علقمہ شبلی نے کیے اور مبصرین تیار کیے۔ ان میں معصوم شرقی، عاصم شہواز شبلی اور اب نصراللہ نصر ہیں۔ اتفاقیہ طور پر بھی تبصرے لکھنے والے ڈاکٹر عنوان چشتی جیسے عالم تھے۔ مظفر حنفی جب کلکتہ میں تھے تو ان کی بھی قلمی وابستگی انشاء سے رہی۔ باہر کے ادیب انشاء میں چھپ کر بہت خوش ہوتے۔

ش ا: اب تک انشاء کے کتنے خاص شمارے شائع ہوئے؟

ف س ا: 28 خاص نمبر نکل چکے ہیں۔ گوشے الگ ہیں۔ جو شخصی یا موضوعی ہوا کرتے تھے۔ بہت دنوں کی بات نہیں۔ صوفی بُلھے شاہ پر بھرپور گوشہ چھپا، رومی نمبر تو برسوں پہلے چھپا، خسرو درپن کے نام سے امیر خسرو پر کام کیا۔

ش ا: پہلے ہندوستان سے کتنے رسالے نکلتے تھے اور آج؟

ف س ا: اس زمانے میں بہت سارے رسالے شائع ہوتے تھے۔ شمع، بیسویں صدی۔ شمع سب سے بڑا ادارہ تھا۔ اس کے بعد بیسویں صدی تھا۔ روبی تھا۔ شمع کے پاس کام کا بہت بڑا پیمانہ تھا اور بہت بڑا سرمایہ تھا۔ ان کے خاندانی مسائل ہوئے تو ان کے سب رسالے بند ہو گئے۔ ان کا تو ہندی میں بھی رسالہ 'سُشما' نکلتا تھا۔ کتابیں بھی چھپتی تھیں۔ بہت ہمہ گیر اردو ادارہ تھا۔ اس کے باوجود وہ بند ہو گیا۔

بنگال میں اس وقت بائیں اردو اکاڈمی تھی۔ لیکن

مجھے کسی سے کوئی مدد نہیں ملی۔ حالانکہ اکاڈمی میں جو ترقی پسند ادیب تھے وہ شخصی طور پر میرے خیر خواہ تھے اور بعض سینئر ادیب انشاء کے ممبر بھی بنتے رہے۔ لیکن ادارے کی حیثیت سے انھوں نے کبھی میری مدد نہیں کی بلکہ رکاوٹ کھڑی کرتے رہے۔ عجیب بات ہے کہ اکاڈمی کبھی تنقید برداشت نہیں کرتی تھی۔ تاہم موجودہ اکاڈمی کا تعاون کسی نہ کسی شکل میں مل رہا ہے۔ ندیم الحق خود ایک صحافی ہیں۔ اکاڈمی کے وائس چیئر مین ہیں۔ وہ ان باتوں کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ ان کے والد محمد وسیم الحق کے اخبارِ مشرق میں بھی چھپتا تھا۔ اس زمانے میں 'آزاد ہند' کا غلبہ تھا۔ کلکتہ کے جو بہ زعمِ خود ترقی پسند ادیب اس سے وابستہ تھے تو وہ کھلے عام اپنی چیزیں اخبارِ مشرق کو اشاعت کے لیے نہیں دیتے تھے۔ میں نے دو چار لوگوں کو دیکھا جو ڈھکے چھپے اخبارِ مشرق کے دفتر جاتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں ملیح آبادی بھی اعتراض نہ کردیں حالانکہ ملیح آبادی ایسا کبھی نہ کرتے۔ اُن میں اعزاز افضل اور علقمہ شبلی تھے۔ میں شروع سے ہی اخبارِ مشرق میں چھپتا تھا۔ اس سے قبل ان کے ہفت روزہ 'فلم ویکلی' میں بھی چھپتا تھا۔ اردو میں جگجیت سنگھ کا پہلا انٹرویو میں نے لیا تھا جو فلم ویکلی میں چھپا۔ 'ہمراز' فلم کی ہیروئن وِمی جس سے اختر الایمان صاحب نے ملوا یا تھا اور اُن کے ایما پر ہی میں نے اُس کا پہلا انٹرویو لیا تھا۔ وہ بھی فلم ویکلی میں چھپا تھا۔ اخبارِ مشرق میں احسن مفتاحی میرے قدرداں تھے۔

ش ا: یومیہ صحافت سماج میں کیا کردار نبھا رہی ہے؟

ف س ا: کلکتہ میں اردو روزنامے تو اب ایک دو ہی ہیں۔ عملاً تو اخبارِ مشرق سرِ فہرست ہے۔ یا کسی قدر 'عوامی نیوز' ہے۔ اور کوئی قابلِ ذکر میڈیا ایسا نہیں ہے جو ادیب ساز ثابت ہو رہا ہو اور چمکدار ہنر تیار کرتا ہو۔ راشٹریہ سہارا معیار میں بہتر تھا۔ وہ بند ہو چکا ہے۔ اردو ادبی سرگرمیوں کی خبریں ایک ہی ڈھرے کی چھپ رہی ہیں جو زیادہ تر شخصی پیمانے پر علاقائی باتوں یا محدود اور روایتی موضوع پر ہوتی ہیں۔ مقامی بیٹھکیں، شعری نشستیں، واہ واہ والی محفلیں بکثرت ہوتی ہیں۔ ان ہی کی رپورٹیں میڈیا میں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اردو اخبار اس میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اسے بہرحال سماج کے ہر حلقے کی نمائندگی کرنا ہوتی ہے۔ پھر بھی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارات دیکھیے۔ انگریزی، بنگلہ اور ہندی۔ وہ ادیب ساز ہیں۔ ان اخبارات کے ذریعے ادیبوں کی صحیح قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ان کے قاری واقف رہنا چاہتے ہیں کہ ان کا ادیب کیا کر رہا ہے۔ اردو میں صرف ممبئی کا روزنامہ انقلاب ایسی روش رکھتا ہے۔ شاہد لطیف صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ بہت باشعور ہیں۔ ملیح آبادی صاحب کے روزنامہ آزاد ہند کے اتوار کے دو صفحے یہ کام موثر طور پر کرتے تھے۔ آزاد ہند صحیح ادیبوں کو سامنے لاتا تھا لیکن اب یہاں ایسا کچھ نہیں محسوس ہوتا۔ غیر روایتی کاموں کی جو سرپرستی ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی۔ ان سے اردو اخبارات کے مدیران واقف بھی نہیں ہوتے اور نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں با صلاحیت ادیبوں کو ترجیح کیسے دینا چاہیے۔

ش ا: آپ یومیہ صحافت کے احوال بتائیے۔ آج کی بات کریں تو اردو صحافت آخری دور میں ہے۔ اردو اخبارات دم توڑ رہے ہیں۔ ایڈیشن سمٹ رہے ہیں۔ تو کیا جس شہر میں اردو صحافت نے جنم لیا وہاں سے یہ ختم ہو جائے گی؟

ف س ا: ابھی تو آثار امید افزا نہیں کہے جا سکتے۔ اردو صحافت دم توڑ بھی سکتی ہے۔ آخر زندہ رہنے کے اسباب بھی تو ہونے چاہئیں۔

زندہ رہنے کے تو اسباب جدا ہوتے ہیں
معجزے سے ہی سلیمان الگ ہوتا ہے

اخبار زندہ رہے تو کیوں رہے؟ 'اخبار' ایک لفظ ہے۔ لیکن اخبار بہت بڑی چیز ہے۔ یہ ایک مملکت ہوتا ہے۔ صحافت کے ذریعے سیاسی اور سماجی شعور پروان چڑھتا ہے، ادب پرورش پاتا ہے۔ یوں تو ادب ادب ہے، صحافت صحافت ہے۔ صحافتی ادب الگ ہے۔ ادبی صحافت الگ ہے۔ اخبار ان ساری چیزوں کو لے کر چلتا ہے۔ ایک دھارے میں کتنے دھارے ملتے ہیں۔ یہ اخبار کے ایڈیٹر پر منحصر ہے کہ وہ کتنا حساس اور باخبر ہے؟ سماج کے تقاضوں کو کس طرح دیکھتا ہے اخبار کے ذریعے اسپورٹس بھی ہے۔ اردو اخبارات اسپورٹس کی خبروں کو اچھی طرح پیش کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کا تعلق ان نوجوانوں سے ہے جو اسپورٹس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ باقی کالم بھی ہوتے ہیں۔ جمعہ کا کالم، توضیح القرآن، تفسیر القرآن، خواتین کا صفحہ، کسی اخبار سے یا پاکستانی ڈائجسٹ سے نکال کر ہو بہو پیش کر دیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے اخباروں کو ہمارے ادیبوں کے اندر جو ہنر ہے اس کی شناخت کرنی چاہیے اور اسے فروغ دینا چاہیے۔

اب کوئی اچھا ناول نگار ہے۔ افسانہ نگار ہے۔ خود آپ کا جو ناول آیا ہے 'تماشائے اہلِ کرم' غالب کے سفرِ کلکتہ کے حوالے سے۔ یا میری بہت ساری کتابیں ہیں۔ مجھے کہنے میں کوئی جھجک نہیں، نہ ہی بڑے بول کی بات ہے۔ میں نے بہت سارے منفرد کام کیے ہیں۔ 30/32 کتابیں ہیں۔ بعض چیزوں کے ہندی و انگریزی میں ترجمے ہوئے۔ انشاء کے خصوصی شماروں کی سیر کیجیے۔ ابھی مراٹھی میں میرے افسانوں کا ترجمہ ہو کر ایک کتاب آئی ہے۔ اردو ادیبوں کو اِس طرح پھیلاوا نہیں ملتا۔ آج کی بات کل ختم ہو جاتی ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل کو اس میں با صلاحیت ادیبوں کی مدد اور رہنمائی کرنی چاہیے۔ لیکن یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔

ایڈیٹر صحافت کا رِنگ ماسٹر ہوتا ہے۔ آج کی صحافت اِس درجہ کورپوریٹ ہو گئی ہے کہ صرف کاروباری پیمانہ رہ گیا ہے اور یہ صرف کلکتے کی بات نہیں ہے۔ بس ایک سسٹم ہے اور تجارت کے طور پر چل رہا ہے۔ صحافت میں نظریہ ہوتا ہے۔ اب یہ چیز کہاں ہے۔ اگر نظریاتی صحافت نہیں ہو گی تو نظریاتی ذہن بھی نہیں ہوگا۔ بس یوں ہی کاغذ سیاہ ہوتے رہیں گے۔ اخبار چھپتا رہے گا۔ بکتا رہے گا۔ لیکن ذہن سازی نہیں ہو گی۔

ش ا: کیا اقلیت کے مسائل اردو سے جڑے ہوئے ہیں؟۔

ف س ا: اردو کا جب نام آتا ہے تو اقلیت کا سوال ہوتا ہی ہے۔ اس کے مسائل ہوتے ہیں۔ اخبارات میں جس طرح ان کے مسائل پیش ہونے چاہئیں وہ نہیں ہوتے۔ سنبھل مسجد میں حادثہ ہوا۔ چار مر گئے۔ اس پر بہت دنوں تک باتیں ہوں گی لیکن کوئی نظریاتی چیزیں سامنے نہیں آئیں گی۔ اردو والوں، مسلمانوں کو صحیح لیڈر شپ کی ضرورت ہے۔ اخبار لیڈر شپ پیدا کرسکتا ہے۔ مولانا آزاد، فارقلیط عثمانی، نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں کی تحریریں ملت ساز اور بہت سیکولر ہوتی تھیں۔ وہ لوگ ملت و قوم کا ذہن بناتے تھے۔ کسی بات کے لیے عوام کو آمادہ کر لیتے تھے۔ آج ایسا نہیں ہے۔ صحافت نئی ذہنی اپج نہیں بنا رہی ہے۔

ش ا: آپ نے ابھی کہا کہ کلکتہ میں اردو صحافت دم توڑ دے گی...

ف س ا: میں نے اردو کے بارے میں نہیں کہا۔ اردو صحافت دم توڑ سکتی ہے جب اسے بچانے کی آپ کی کوشش ہی نہیں رہے گی۔ جب اردو محلّے میں حجام کی دکان میں جہاں روز 'اخبارِ مشرق' آتا تھا اس کی جگہ اب ہندی کا اخبار آتا ہے اور جب اردو صحافت کے دو سو سالہ جشن میں بلاوجہ ہندی، بنگالی، اور انگریزی صحافیوں

کو ایوارڈ دیے جاتے ہوں اور اس میں چالیس سال کی شاندار خدمات کے اعتراف میں ماہنامہ انشاء یا کسی بھی اردو رسالے کو پوچھا بھی نہ جائے تو پوچھنا پڑتا ہے کہ صحافت کی تعریف آپ کی نظر میں کیا ہے؟ میں تو ایسا کوئی دن نہیں جاتا کہ جب یہ نہ سوچتا ہوں کہ مجھے رسالہ بند کر دینا چاہیے۔ ابھی 40 ویں سال کا پہلا شمارہ نکالا ہے۔ اس میں دو اداریے ہیں۔ ایک ہے 'عقل داڑھ' (Wisdom teeth)۔ آپ اس کا مطالعہ کر لیجیے۔ عقل مندوں کے لیے اس میں کافی اشارے ہیں۔

کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر جو اردو پڑھاتے ہیں جن کی معراج صرف یہ ہے کہ کسی تعلیمی ادارے سے، کسی اکاڈمی سے، سرکاری ادارے سے جڑ جائیں تو اس کو وہ اپنی منزل سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ سوچتے نہیں۔ یہ کام وہ گروہ بندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ زبان، ادب اور صحافت کیسے آگے بڑھے گی؟ دیکھئے کلکتہ میں رئیس الدین فریدی صاحب ایک نستعلیق شخصیت تھے۔ وہ امروہہ کے تھے۔ شاعر تھے، صحافی تھے، روزانہ ہند کے ایڈیٹر تھے۔ عمر کے آخری حصے میں کلکتہ سے دہلی چلے گئے۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھے۔ ان کی خدمات ہیں۔ ان کا بیٹا اور بیٹی پہلے ہی دلّی چلے گئے تھے۔ ان کی سوانح عمری کی قسطیں اجالا میں چھپی تھیں۔ اور کئی باب انشاء میں شائع ہوئے۔ اس زمانے میں انشاء بیرونی ممالک میں خاصا جاتا تھا کیونکہ ڈاک کھلی ہوئی تھی۔ اب فارین ڈاک آتی ہے نہ جاتی ہے۔ تو بعض ممالک میں ان کی قسطیں پڑھی گئیں تو خطوط آنے لگے کہ ان کی سوانح حیات کب چھپے گی؟ وہ سب خریدنے کا اشتیاق رکھتے تھے لیکن وہ چھپی نہیں۔ ان کے گھر کے کسی نے بھی Active role ادا نہیں کیا۔ اُن کے انتقال کے تین برسوں بعد وہ کتاب آئی۔ ''دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا''۔ لیکن کتاب کا چھپا پا جانا کافی نہیں ہوتا۔ اچھی اچھی کتابیں چھپیں لیکن انھیں منزل نہیں ملی۔ جیسے آغا جانی کشمیری کی خودنوشت 'سحر ہونے تک' کے ساتھ ہوا۔ کتاب انھوں نے خود اپنی زندگی میں چھپوائی اور بیشتر اسٹاک کسی وجہ سے ڈمپ ہو گیا۔ برسوں بعد انشاء میں قسط وار وہ کتاب چھپی جس کی دنیا بھر میں پذیرائی ہوئی۔ اور ان کے پس مرگ ان کی خواہش کی تکمیل میں میں نے وہ کتاب شائع کی اور اُسے منزل مل گئی۔ فریدی صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کی کتاب کا عنوان میں نے ہی تجویز کیا تھا۔ اس کا پیش لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔ 'چراغ صحافت'۔ میں نے فریدی صاحب کو چراغ صحافت کہا ہے تو آپ دیکھیے کیوں کہا ہے؟ جب کتاب اور مصنف کو اُس کا منشا نہیں ملتا تو وہ یہ تضیع اوقات کیوں کرے۔ میں تو خود اب سوچتا ہوں کہ میں اگر اردو میں نہیں لکھتا تو کیا ہوتا؟ اگر میرا اپنا روزگار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ لیکن یہ بھی ہے کہ اگر آپ کاروباری کی طرح سوچیں گے تو ادب یا صحافت نہیں کر سکتے۔

میں تو یہی سوچتا رہا کہ اپنی زبان و ادب کی خدمت کر کے قوم کی خدمت کر رہا ہوں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، لکھ رہے ہیں، وہ قومی سرمائے میں تبدیل نہیں ہو رہا ہے۔ اگر قوم کو اس کی ضرورت نہیں ہے تو آپ نہیں بھی لکھیں گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ زمینی حقیقت کو سمجھیے۔

ش ا: تو منزل کہاں ہے؟

ف س ا: آپ خود سوچیں منزل کہاں ہو سکتی ہے۔ کوئی ادیب ہے، زندہ رہا، بالآخر مر گیا۔ مرنے کے بعد آٹھ دس جلسے اس کی یاد میں کر دیے گئے۔ اخبار میں دو چار قطعات لکھ دیے گئے۔ اس کا مونوگراف چھپ گیا۔ جیسے ان چیزوں کے لیے ہی بیچارے کے مرنے کا انتظار تھا۔ اس سے زیادہ اردو میں اور کچھ ہوتا ہو تو آپ بتائیں مجھے۔ ادیب تو مر جاتا ہے مگر ان رسمی باتوں سے ادب زندہ نہیں رہتا۔ ادیب کو اس کے کارنامے ہی زندہ رکھیں گے۔ یہاں زبان حرارت اور سانسوں کو ترس رہی ہے۔

ش ا: ریختہ والوں نے اردو کا کافی سرمایہ Digital میں منتقل کر دیا تو کیا پورا اردو ادب ایک دن ہندی میں ڈب ہو جائے گا؟

ف س ا: اب ایسے آثار نمودار ہو گئے ہیں۔ ریختہ والے یہ کریں، نہ کریں، ریختہ والوں کی خدمات اپنی جگہ ہیں۔ ایک غیر اردو داں سنجیو صراف جو اتنا بڑا سرمایہ دار ہے، اس نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور نہ جانے کتنی نادر کتابیں، کتنے نمبر اور لغات اپنی سائٹ پر پیش کر دیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انھوں نے اردو ادبیات کو اردو میں ہی محفوظ کرنے کی نیت سے یہ کام کیا۔ اب یہ ہے کہ وہ کام اردو میں محفوظ رکھا جائے گا ورنہ اس کی قدر کون کرتا ہے۔ اس کا اجر کون دے رہا ہے۔ یہ سوال ضرور ہے کہ اس ادب کو بالآخر ضم کون کر رہا ہے۔ وہ Dissolve ہو رہا ہے ہندی میں جا کر۔ اس طرح اسے لوگ قبول کر رہے ہیں تو یہ ان کی ... سنجیو صراف کی... پوزیٹو سوچ ہے۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ آج شکیل افروز کچھ لکھیں گے تو اس کو محفوظ نہیں کریں گے۔ ایسا انھوں نے نہیں کیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ کی چیز ریختہ میں جائے اور اس کے ذریعے ہندی اسے جذب کر لے۔ ان کے یہاں ریڈر بھی زیادہ ہیں۔ وہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ ابھی دیکھیے کہ اردو کا کوئی ایسا کام نہیں ہے غالب، میر اور قلی قطب شاہ سے لے کر ساحر اور مجروح تک کا، جو ہندی میں دستیاب نہ ہو۔ اردو کی چیزوں کے اردو میں قدر دان نہیں ہیں۔ خریدار نہیں ہیں۔ اس سے جو مسئلہ پیدا ہو رہا ہے، اسے حل کیسے کیا جائے؟ اسے سوچے گا کون؟ ہم تو نہیں سوچ رہے ہیں۔ ہمارے تو مقاصد بدل چکے ہیں۔ بہت شارٹ ٹرم مقاصد ہیں ہمارے۔ عقل داڑھ نہیں نکلی ہے ہماری۔ ہر چیز سرکار سے مفت لینے کی عادت پڑ گئی ہے ہمیں۔ اردو کتابیں اردو والے خرید سکتے ہیں لیکن خریدنے کی نیت نہیں رکھتے۔ تو حکومت اور اکاڈمی کیا ان کے دل و دماغ میں کتابیں ٹھونس دے گی؟ آجکل میں مشاعروں میں دیکھتا ہوں نئے شاعر اور شاعرات ایسے بھی ہیں جو اپنا کلام موبائل سے دیکھ کر پڑھتے ہیں جو ہندی میں ٹائپ کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کس بات کے آثار ہیں؟

مغربی بنگال اردو اکاڈمی میں کام ہو رہا ہے۔ اکاڈمی فعال ہے۔ اس کا پیٹرن کسی قدر بدل دیا جائے تو یہ انڈیا کی بیسٹ اکاڈمی ہو جائے گی۔ تجربہ کار ادیبوں، مصنفوں اور ناشروں کو بلا کر کبھی کبھی اُن سے مشورے لینے چاہئیں۔

ش ا: آپ کی آئندہ کتاب کا نام؟۔

ف س ا: دو ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ 'جزیرۂ جاں' اور ایک سوانحی مضامین کا مجموعہ 'یہ میں ہوں'۔

ش ا: بہت بہت شکریہ اعجاز صاحب۔ کئی موضوعات پر کھلی اور دوٹوک باتیں ہوئیں۔

ف س ا: آپ کا بھی شکریہ شکیل افروز صاحب۔ آپ کے سوالوں نے بہت ساری باتوں کا احاطہ کر لیا۔

■

Shakil Afroz
12/4B, Patwar Bagan Lane
Kolkata-700009 (WB)
Mob.: 8240878209
Email:afroseshakil@gmail.com

Fay Seen Ejaz
25-B, Zakaria Street
Kolkata-700073 (WB)
Mob.:9830483810
inshapublications@yahoo.co.in

تعلیم میں سائنس

مصنف: دیپک کمار
مترجم: سہیل احمد فاروقی

ارضیات اور علم معدنیات کی تعلیم

دربار نے 1885 کے وسط میں ارضیات کے لیے پروفیسر شپ کے عہدے کی تجدید میں کامیابی حاصل کرلی لیکن اس کے بعد بھی وہ عہدہ خالی پڑا رہا کیونکہ کوئی موزوں آدمی نہیں مل سکا۔ قدرتی علوم کے تمام معاملات میں پریزیڈنسی کالج کی غربت پر ترس کھا کر Oldham نے 1862 میں خالی اسامی کے متبادل کے طور پر خود جی ایس آئی میں اسکول آف اپلائڈ سائنس کے ایک مرکز کے قیام کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ حکومت کو منظور نہ تھا۔ یہ خوف لاحق تھا کہ تدریس کا بار گراں ماہرین ارضیات کو ان کی ارضیاتی سرگرمیوں کے بنیادی مقصد سے ہٹا دے گا۔ 1869 میں اولڈ ہام نے اپنی پیشکش کی تجدید کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ کم از کم دو طلبا کو سرکاری خرچ پر ہر سال ٹریننگ دی جائے۔ یہ تجویز بھی شعبہ مالیات نے مسترد کردی جس نے اپنی عقل کے زعم میں یہ مضحکہ خیز تجویز پیش کی کہ وظائف کے بجائے یونیورسٹی کو چاہیے کہ حوصلہ افزائی کے طور پر اضافی نمبر دے۔ یونیورسٹی نے بجا طور پر اس کا یہ جواب دیا کہ ارضیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبا کی حوصلہ افزائی کا یہ طریقہ اس منصوبے کو برباد کردے گا جس کی بنیاد پر یونیورسٹی کے امتحانات کرائے جاتے ہیں اور یہ معاملہ وہیں رکا رہا۔

تاہم ستمبر 1880 میں حکومت نے مقامی معاشرے کے بہتر تعلیم یافتہ طبقوں میں ایک ذہنی سائنسی رویے کی حوصلہ افزائی کا عزم کیا اور بنگال، مدراس اور پنجاب کی حکومتوں سے کہا کہ ارضیاتی ٹریننگ کے انتظام کے وسائل کے متعلق اپنی تجاویز حکومت کو دیں۔ اپنے جواب میں بنگال کے ڈی پی آئی نے اسے ترجیح دی کہ طلبا کو طبیعیات یا نباتیات کی تعلیم دی جائے جس میں کہ عملی مظاہرے کے ذرائع ارضیات کے مقابلے میں فوری طور پر دستیاب تھے جس میں ان ذرائع کا یقیناً فقدان تھا۔ نیز یہ کہ اس بات میں کوئی معقولیت نہیں تھی کہ ارضیات پڑھانے کے لیے انگلینڈ سے ایک اختصاص یافتہ پروفیسر بلانے کے اخراجات برداشت کیے جائیں سوا اس کے کہ ارضیات کو تعلیم کے ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے والے ہندستانیوں کے لیے روزگار کی فراہمی کا کوئی امکان ہو۔ بنگالی کردار و شخصیت کا بھی ہوا کھڑا کیا گیا اور اسے ناممکن قرار دے دیا گیا کہ بنگالی طلبا ارضیات جیسے گنجلک مضمون کو محض سائنس سے محبت کی خاطر پڑھیں گے۔ مدراس کا ڈی پی آئی بھی مختلف وجوہ سے ہی سہی بنگال میں تعینات اپنے ہم منصب کے انداز پر سوچ رہا تھا۔ اسباب یہ تھے کہ اولاً ارضیات جیسی اطلاقی سائنس کیمیا، طبیعیات اور حیاتیات کے معقول سابق علم کا متقاضی تھا جس کا انتظام نہ ہوسکا اور دوسرے یہ کہ اس پریزیڈنسی کے اہم تعلیمی مراکز ان مقامات پر واقع تھے جن کا ارضیاتی ڈھانچہ میدانی مظاہروں اور ہدایات کے لیے معقول امکان فراہم نہیں کرسکتا تھا۔ حکومت پنجاب نے بھی ارضیات میں اس وقت تک کے لیے لیکچرز منعقد کرنے پر نا آمادگی ظاہر کی جب تک کہ طبیعیاتی سائنس کے معیار میں بہتری نہ آجائے۔

ان مایوس کن رپورٹوں کے عین برعکس میور سینٹرل کالج الہ آباد کے پرنسپل اے ایس ہیریسن کی طرف سے دسمبر 1880 میں پیش کردہ میمورنڈم تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ارضیات کی کلاسوں کے لیے نمایاں طور پر ایک پروفیسر کا عہدہ مخصوص کیا جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کی بھی وکالت کی کہ اگر باصلاحیت طلبا کو ارضیات کی طرف متوجہ کرنا ہے تو دو سال کی تعلیم کے دوران 40 یا 50 روپے ماہانہ کے دس بارہ وظائف طلبا کو دینے ہوں گے۔

اولڈ ہام کے جانشیں ایچ بی میڈیکوٹ کو ارضیات کے اور حیاتیات قدیمہ، علم معدنیات اور پٹرولیات جیسی اس کی دیگر شاخوں میں خصوصی کورسوں کا آغاز کرنے سے سخت اختلاف تھا اور اس لیے وہی بہانہ تھا یعنی ہندستانیوں کا ذہنی دیوالیہ پن۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ جہاں تک بی ایس آئی کا تعلق ہے ہندستانی کالجوں میں میں ارضیاتی ٹریننگ کے خصوصی انتظامات کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محکمہ صرف پندرہ گریڈ یافتہ افسروں کی ہی تقرری کرتا ہے اور یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس کی بنیاد پر خصوصی کلاسیں کھولنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔ گورنر جنرل نے ان خیالات سے اتفاق کیا۔ اس طرح ارضیات کی تعلیم کھٹائی میں پڑی رہی اور آخر 1893 میں پریزیڈینسی کالج کلکتہ میں ارضیات کی پروفیسر شپ قائم ہوئی اور بعض طلبا ارضیات میں آنرز کے ساتھ بی اے کا امتحان دینے لگے۔

انگلینڈ میں 1851 میں کان کنی اور ارضیاتی تعلیم کا ایک اسکول قائم ہو چکا تھا پھر بھی 1857 میں مائننگ ایسوسی ایشن آف گریٹ برٹین نے کان کنی والے ہر ضلع میں مرکزی مائننگ کالج اور مائننگ اسکول کا مطالبہ کیا۔ ہندستان میں 1904 سے پہلے کسی بھی طرح کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ ملک کے معدنیاتی وسائل کو کام میں لانے کے میدان میں حیرت ناک تبدیلیاں آچکی تھیں۔ 1901 کے مائنس ایکٹ نے کانوں کے منیجروں اور سپروائزروں کے لیے کسی نہ کسی شکل کی مائننگ کی تعلیم لازمی قرار دے دی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اس طرح کی ٹریننگ کہاں سے حاصل کی جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے حکومت سے کان کنی کا ایک ضلعی سطح کا اسکول کھولنے کی فرمائش کی۔ بنگال گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمیٹی اس تجویز پر بحث کے لیے مقرر ہوئی۔ جی ایس آئی کے ڈائرکٹر ٹی ایچ ہالینڈ اور کانوں کے دو انسپکٹر اسٹوییز اور گرنڈی نے خصوصی اسکول کے قیام کی حمایت کی۔ لیکن زیادہ بارسوخ سول حکام نے اس بنیاد پر تجویز کو مسترد کر دیا کہ ایسے اسکول کی حقیقتاً کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی تھی۔ دلاسہ دینے کے لیے شپ پور انجینئرنگ کالج میں کان کنی کی ایک کلاس کھول دی گئی۔

نباتیات اور علم جنگلات کی تعلیم

نباتیاتی تحقیقات پر ہندستان میں کمپنی کی موجودگی کے ابتدائی سالوں سے ہی خاصی توجہ دی جارہی تھی لیکن اس کے تعلیمی پہلوؤں کو نظر انداز کیا جارہا تھا۔ کلکتہ میں نباتیات کی تعلیم کو صرف طب کے نصاب میں جگہ دی گئی تھی۔ 1863 میں جب طبیعیاتی علوم کو کلکتہ یونیورسٹی کے بی اے امتحان کے لیے اختیاری قرار دیا تو نباتیات کا کوئی مقام نہیں تھا۔ اس کے بعد اس کورس میں نباتیات کو اختیاری مضمون کا درجہ دیا گیا۔ مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں نے بھی اس مضمون کا کسی حد تک اعتراف کیا۔ لیکن مدراس یونیورسٹی کے طب کے کورس میں نباتیات پر ایک لکچر بھی نہیں رکھا گیا۔

جارج واٹ کو 1873 میں نباتیات کے پروفیسر کا عہدہ سنبھالنے کے لیے کلکتہ بھیجا گیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ مقامی حکومت نے ایسی کسی پروفیسر شپ کو باقی رکھنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور ان سے نباتیات کے بجائے کیمیا پڑھانے کے لیے کہا گیا اور وہ آٹھ سال تک کیمیا پڑھاتے رہے۔ نباتیات کو کورس میں اختیاری مضمون بنا دیے جانے کے بعد بھی کالج نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ نباتیات اور ارضیات پڑھانے کے بجائے جس میں باغیچوں میں کام کرنا اور دورے کرنا پڑتا انھیں طبیعیات اور ریاضی کی تدریس کا انتظام کرنا آسان تر لگا۔ ڈھاکہ کالج کے پرنسپل نے 1875 میں نباتیات کے موضوع کو ہٹانے کی درخواست کی مگر اس وقت بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر رچرڈ ٹمپل نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے کلکتہ میڈیکل کالج میں منعقد ہونے والے نباتیات کے لکچروں کی تعداد چالیس سے گھٹا کر بیس کر دی۔ ایسا انھوں نے کلکتہ بوٹانک گارڈن کے سپرنٹنڈنٹ جارج کنگ کی خوشنودی کے لیے کیا تھا جو وہاں لکچر دیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے لیے زیادہ وقت نہیں دینا چاہتے تھے۔ ڈی پی آئی اور میڈیکل کالج کی کونسل نے اس پر احتجاج کیا جو ناکام رہا۔ دیگر کالجوں میں مثلاً پٹنہ، راج شاہی، ہگلی اور کٹک میں نباتیات خاصا مقبول مضمون تھا۔ مگر 1882 میں عضویات کے اضافے نے اس مضمون کو مشکل بنا دیا اور اس کی مقبولیت ماند پڑنے لگی۔ پٹنہ اور راج شاہی میں نباتیات کی کلاسیں موقوف کر دی گئیں۔ ہگلی کالج میں 1887 میں صرف پانچ طلبا نے نباتیات کا مضمون اختیار کیا اور پرنسپل نے اس کے خاتمے کے لیے کہہ دیا۔ ڈی پی آئی، ایلین کرافٹ نے وسعتِ نظر سے کام لیتے ہوئے اس بنیاد پر اس موضوع کو برقرار رکھنا چاہا

> **نباتیاتی تحقیقات پر ہندستان میں کمپنی کی موجودگی کے ابتدائی سالوں سے ہی خاصی توجہ دی جارہی تھی لیکن اس کے تعلیمی پہلوؤں کو نظر انداز کیا جارہا تھا۔ کلکتہ میں نباتیات کی تعلیم کو صرف طب کے نصاب میں جگہ دی گئی تھی۔ 1863 میں جب طبیعیاتی علوم کو کلکتہ یونیورسٹی کے بی اے امتحان کے لیے اختیاری قرار دیا تو نباتیات کا کوئی مقام نہیں تھا۔ اس کے بعد اس کورس میں نباتیات کو اختیاری مضمون کا درجہ دیا گیا۔**

کہ حکومت کو مختلف مضامین کا انتخاب کھلا رکھنا چاہیے۔ لیکن اس دلیل پر کسی نے کان نہ دھرا اور جی ایس آئی نے ''حقیقی ضرورت نہیں ہے'' کے عام عذر کی بنیاد پر ایک بار پھر ان کلاسوں کو ختم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پریزیڈنسی کالج کو چھوڑ کر بنگال کے کسی بھی کالج میں نباتیات کے مضمون کے ساتھ انصاف نہ ہو سکا۔

نباتیات کا مضمون جنگل بانی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ درحقیقت یہ جنگل بانی اور زراعتی تجربات دونوں کو ذہنی اساس فراہم کرتا تھا۔ رچرڈ ٹمپل نے اس کو محسوس کر لیا تھا اور وہ جنگل بانوں کو نباتیات کی تربیت دینا چاہتے تھے۔ برانڈ مین نے 1878 میں دہرہ دون میں سنٹرل فارسٹ اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی اور جی او آئی نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اسکول کو فوری کامیابی حاصل ہوئی اور نظری تعلیم 1881 میں شروع کر دی گئی۔ یہاں پڑھائے جانے والے مضامین میں درخت پروری (Sylviculture) سروئنگ، نباتیات، مبادیات کیمیا، طبعیات اور قانون شامل تھے۔ یہ کورس صرف فارسٹ رینجر کے سرٹیفکیٹ کے لیے کام کرنے والے ہندستانیوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔ تمام اعلیٰ حکام یوروپی نژاد تھے جنھوں نے نینسی (Nancy) میں French Ecole Forestiere ٹریننگ حاصل کی تھی۔ نظری تعلیم کا انتظام انگلینڈ کے کوپر ہل کالج میں ہو سکتا تھا لیکن عملی تربیت کے لیے انھیں نینسی جانا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک محدود پیمانے پر بھی دہرہ دون کا اسکول ایک اچھا تجربہ ثابت ہوا اور اس سے جنگل بانوں کو زیادہ منظم انداز میں مشاہدات و تجربات کرنے کا حوصلہ ملا۔ مگر پیشہ ور ماہرین نباتیات اپنے اس مضمون کو اور بہتر انداز سے پڑھانا چاہتے تھے۔ ریونیو سکریٹری جے ولسن نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بات حکومت ہند کے لیے باعث شرم ہے کہ ہندستان میں اتنے خوبصورت اور بیش قیمت جنگلات ہونے کے باوجود اس ملک میں فارسٹ سائنس کے فروغ کی سمت میں کوئی ایسا کام نہیں ہوا جو اسے 'فارسٹ پریکٹس' سے ممتاز کر سکے۔ اس بدنما داغ کو مٹانے کا وقت آپہنچا ہے۔ 1906 کے اوائل میں اسکول کو کالج کا درجہ دیا گیا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا نام امپیریل فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا جو تحقیق کے میدان میں اس کی پیش قدمی کا اشارہ تھا۔

زراعت اور امراض مویشیان کی تعلیم

برطانوی حکومت شاید دنیا کی سب سے بڑی جاگیر کی مالک اور اس کی واحد استفادہ کنندہ تھی۔ اس کے باوجود اس نے ایک لمبے عرصے تک زراعت کے شعبے میں سائنسی تعلیم کو نظر انداز کیا۔ کمپنی نے عملاً اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا اور جب برطانوی تاج نے اقتدار سنبھالا تو کسی حد تک امید قائم ہوئی۔ 1860 کی دہائی

نباتیات کا مضمون جنگل بانی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ درحقیقت یہ جنگل بانی اور زراعتی تجربات دونوں کو ذہنی اساس فراہم کرتا تھا۔ رچرڈ ٹمپل نے اس کو محسوس کر لیا تھا اور وہ جنگل بانوں کو نباتیات کی تربیت دینا چاہتے تھے۔ برانڈ مین نے 1878 میں دہرہ دون میں سنٹرل فارسٹ اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی اور جی او آئی نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔

میں لینڈ ہولڈرز ایسوسی ایشن اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے بار بار اس طرح کی تعلیم کے آغاز کا مطالبہ کیا۔ لیکن حکام صرف زبانی ہمدردی جتاتے تھے اور طرح طرح کے عذر پیش کرتے تھے۔ حکومت مدراس نے ایک قابل ذکر اقدام کیا اور 1865 میں سیدا پیٹ (Saidapet) کے مقام پر کم از کم جنوبی ہند کی ضروریات کے لیے موزوں تصور کی جانے والی کم معروف مشینوں، آلات، کھادوں، فصلوں، کچر کے طریقوں اور پالتو جانوروں وغیرہ کی صلاحیت کو جانچنے کی سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے ایک تجرباتی فارم قائم کیا۔ جب اس کے سپرنٹنڈنٹ رابرٹسن نے اس طرف اشارہ کیا کہ کس طرح ادب کی تعلیم نے اس کے بہترین افراد سے اسے محروم کر دیا تھا اور انھوں نے ایک زرعی کالج کے قیام کا تقاضا کیا تو مدراس ریونیو بورڈ نے اس بنیاد پر ان سے اتفاق نہیں کیا کہ ہندستان کی 'بے وقعت' زراعت بھی 30 ملین افراد کا پیٹ بھر رہی تھی، چاول، کپاس، چینی، تلہن اور برآمدی تمباکو کی زائد پیداوار دے رہی تھی اور 4½ ملین اسٹرلنگ کا ریونیو ادا کر رہی تھی۔ مگر رابرٹسن اپنے مطالبے پر اڑے رہے اور 1876 میں سیدا پیٹ میں ایک زرعی کالج قائم ہو گیا۔

اسی سال بہار میں پٹنہ کالج کی جوڑی کے طور پر ایک اور زرعی کالج کی تجویز رکھی گئی۔ اس وقت بنگال کے ڈی پی آئی نے یہ قبول کیا کہ چونکہ ان کے سامنے رہنمائی کے لیے کوئی نظیر نہیں تھی امریکی اور یوروپی نمونوں کی تقلید کرنی پڑے گی۔ Cinencester کو بہت زیادہ نظریہ زدہ سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ Massachusetts کو شدید طور پر تجربہ پسند قرار دیا گیا۔ اس لیے انھوں نے بلجیم کی مثال کو ترجیح دی جس کی تقلید جزوی طور پر کی جا سکتی تھی۔ جزوی طور پر اس لیے کہ انھیں خوبصورت تجربہ گاہ، وسیع کفایتی میوزیم، قیمت سے قطع نظر حکومت بلجیم کی طرف سے کالجوں کو فراہم کردہ سائنسی آلات کی خاطر خواہ تقلید دیکھنے کی کوئی امید نہ تھی۔ لیکن جزوی تقلید بھی ہوتی نظر نہ آئی۔ اس کے بجائے پٹنہ میں ایک صنعتی اسکول قائم کیا گیا اور منظر پوسا میں منتقل ہو گیا جہاں حکومت تمباکو کے کلچر کا تجربہ کر رہی تھی۔ لیفٹیننٹ گورنر رچرڈ ٹمپل اس فارم کو مستقل طور پر رکھنا اور عضویاتی نباتیات اور زرعی کیمیا سے متعلق سائنسی تجربات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں تمباکو کے تجربے کی ناکامی نے حکام کو مایوس کر دیا اور اس طرح ہندستانیوں کو زرعی علوم سکھانے کی کوشش پر رقم خرچ کرنے کی عدم افادیت کا آسان بہانہ مل گیا اور پوسا اسٹیٹ تمباکو کی کاشت کے لیے ڈنلپ کمپنی کے Ms. Begg کو پٹے پر دے دی گئی۔

زرعی سائنس کے لیے اپنے ذوق وشوق کو رچرڈ ٹمپل نے بمبئی پریزیڈنسی منتقل کیا۔ 1879 میں پونا سول انجینئرنگ کالج میں ایک زرعی کلاس کھولی گئی اور اسی طرح کی کلاسیں مرکزی ضلعی اسکولوں میں بھی کھولی گئیں۔ ٹمپل معاملت دار اور کارکن جیسے ہندستانی ریونیوافسروں کو زرعی علم کی تشہیر کا موثر ترین ذریعہ سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ بمبئی یونیورسٹی زراعت میں ایک ڈگری کورس چلائے۔ لیکن یونیورسٹی نے ڈپلوما سے زیادہ کسی ڈگری کے لیے آمادگی سے انکار کر دیا۔ آگے چل کر Voelcker کو یہ ڈپلوما کورس ایک ادھورے گھر جیسا لگا جو کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھا لیکن ڈگری کے برابر نہ تھا۔ یہ تمام انتظامات نچلے گریڈوں میں ملازم رکھے گئے ہندستانیوں کے لیے تھے۔ ضرورت اس کی تھی کہ اونچے گریڈوں میں زراعت میں سائنسی اور عملی تربیت یافتہ افسران کا تناسب برقرار رکھا جائے۔ 1881 کے کمیشن برائے قحط سالی (Famine Commission) نے پہلے آئی سی ایس کے پروبیشنروں کے لیے نظریاتی ٹریننگ کی تجویز رکھی اور پھر کسی زرعی کالج میں ان میں سے چند افراد کی عملی ٹریننگ کی۔ حکومت ہند نے تجویز کو نا قابل عمل قرار دیتے ہوئے اسے مسترد کر دیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ نے یہ دعویٰ کیا کہ کوئی سطحی نظریاتی ٹریننگ نہ صرف یہ کہ بے فائدہ بلکہ کسی سول سرونٹ کے لیے نقصان دہ بھی ہوگی۔ کیونکہ وہ ہندستان میں منصفی اور انتظامیہ کے افسران کی کارکردگی کے لیے ضروری سمجھے جانے والے مضامین کے مطالعے سے اس کی توجہ ہٹا دے گا اور وقت بھی ضائع کرے گا۔

دریں اثنا حکومت بنگال نے رائل ایگری کلچرل کالج سائرن سٹر میں 200 پاؤنڈ سالانہ کے دو خصوصی وظیفے قائم کیے جو ڈھائی سال تک کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس گریجویٹوں کو ملتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر ممکن یا مطلوب حد تک مغربی تحقیق کے واثق نتائج کو مشرقی روایت پر چسپاں کرنے کے لیے کالجوں اور اسکولوں کے قیام کی تمہید کے طور پر ماہرین کی ایک جماعت کی تشکیل کی جائے۔ یہ ایک اہم اقدام تھا اور وہ حکومت ہند کی طرف سے نہیں بلکہ مقامی حکومت کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جب سالسبری کے ایگری کلچر کالج نے وائسرائے سے ہندستانی رعایا کے لیے وظائف قائم کرنے کی درخواست کی تھی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بنگال کی مثال استعماری حکومت کو متحرک کرنے میں ناکام رہی تھی۔ لیکن یہ تجربہ بھی کچھ خوش گوار نہ ثابت ہوا۔ سائرن سٹر کے بعض طلبا قانون اور دیگر مطالعات کی طرف متوجہ ہوگئے۔ حکومت بنگال نے ان کے نام وارننگ جاری کی۔ خود ان طلبا کو بھی مایوسی ہوئی جب وطن واپسی پر انھوں نے دیکھا انھیں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے علاوہ اور کچھ نہ مل سکتا تھا۔ اس لیے 1887 میں حکومت نے ان وظائف کا سلسلہ منقطع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک انتہا پسندانہ قدم تھا جو دردسر کے علاج کے لیے سر قلم کرنے کے مترادف تھا۔

زرعی سائنس کے لیے اپنے ذوق وشوق کو رچرڈ ٹمپل نے بمبئی پریزیڈنسی منتقل کیا۔ 1879 میں پونا سول انجینئرنگ کالج میں ایک زرعی کلاس کھولی گئی اور اسی طرح کی کلاسیں مرکزی ضلعی اسکولوں میں بھی کھولی گئیں۔

اس طرح جو ولولہ 1870 کی دہائی کے وسط میں پیدا ہوا تھا 1880 کی دہائی کے وسط تک سرد پڑ گیا۔ پونا یونٹ کو چھوڑ کر جہاں کپاس اور Plough Technology کے میدان میں اہم تجربات ہو رہے تھے دیگر تمام مراکز پر زوال آرہا تھا۔ مثال کے طور پر سیدا پیٹ اس نظری تعلیم کی اہمیت کے باوجود جو وہ دے رہا تھا 'عمل پسند' کسانوں کو قریب نہ کر سکا اور اس لیے مدراس کے ڈائرکٹر آف ایگری کلچر ڈبلیو ولسن نے اسے ناکام قرار دے دیا۔ ولسن زراعت کے فن اور اس کی سائنس میں امتیاز کرتے تھے اور اول الذکر کو مقدم رکھنا چاہتے تھے جو سیدا پیٹ کا کالج نہیں کر رہا تھا۔ فطری طور پر اس میں انھوں نے اپنی ہتک محسوس کی اور انھوں نے سیدا پیٹ میں رائج نظام کی مذمت کرتے ہوئے اسے کسی زبان کے ذریعے اس کی قواعد سیکھنے کے عمل سے مماثل قرار دیا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ زرعی تعلیم اور تجربات کے سلسلے کا یکسر خاتمہ ہو گیا تھا۔ بھلا ہو اے سی بک کا جن کے اصرار نے اس مسئلے کو زندہ رکھا۔ جون 1888 میں حکومت ہند نے 'قدرتی علوم کے اطلاق کی طرف مائل' مطالعات کے آغاز کا عزم کیا۔ حکومت مدراس نے فوراً ہی اشارہ سمجھ لیا اور دسمبر 1888 میں سیدا پیٹ ایگری کلچر کالج کی کارکردگی کی رپورٹ دینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ کمیٹی نے سیدا پیٹ کو مطلقاً لازمی قرار دیا اور امراض مویشیاں اور جنگل بانی کی تعلیم کے انتظامات کیے جانے کی سفارش کی۔ لیکن حکومت مدراس نے اس سے اتفاق نہ کیا اور اس کے بجائے پانچ زرعی اسکولوں کی منظوری دے دی۔

البتہ ڈاکٹر ووئیلکر سے پست حوصلوں کو سہارا ملا۔ ان کی نکتہ چینی نے پورے مسئلے کو ایک بار پھر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندستان میں سائنسی تحقیق کی حوصلہ افزائی کسی طرح بھی نہیں کی جا رہی تھی اور یہ کہ ان افراد کو جنھیں سائنس کے میدان میں اصل کارنامے انجام دینا چاہیے تھا انھیں سائنسی تحقیق کو ترک کر کے اسکول انسپکٹر کی ذمے داری سنبھالنی پڑی۔ انھوں نے سیدا پیٹ کالج کی غیر متعین حیثیت کے لیے حکومت مدراس کی اختیار کردہ پالیسی میں بار بار کی تبدیلی کو ذمے دار ٹھہرا لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ نصاب کو ہندستانی کے بجائے انگریزی تجربات کے نمونے پر وضع کیا گیا تھا۔ اس طرح چھنٹائی، جلوائی اور زمین کو ہموار کرنے جیسے کاموں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ہندستانی زراعت کے لیے اب ایک غیر معروف امونیا سلفیٹ، خشک خون کی پیڑیاں اور مصنوعی کھاد کو متعارف کرایا گیا۔ جانوروں کو موٹا کرنے کے طریقوں کو سیکھنے کی ضرورت کو سمجھا گیا اور وہ بھی ایسے ملک میں جہاں جانوروں کو کسی طرح بھی موٹا کرنے کا رواج نہ تھا۔ دوسری جانب ہندستانی زراعت کے لیے دلچسپی کے حامل بہت سے مضامین کو خارج کر دیا گیا۔ مثلاً نہر اور کنویں کے ذریعے آب پاشی، کھلی کی بھوسی، گھی وغیرہ۔

ڈاکٹر وویلکر کی موجودگی اور مشورے سے فائدہ اٹھانے کے لیے اکتوبر 1890 میں حکومت ہند نے زراعت کے ڈائرکٹروں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کے جواب میں کانفرنس نے اس موضوع پر بحث کی کہ کیا زراعت کی خصوصی تعلیم کی ضرورت تھی اور کیا اس عمل کو اوپر سے نیچے کی ترتیب میں یا نیچے سے اوپر کی ترتیب میں انجام دیا جانا تھا۔ بک نے موخر الذکر کو ترجیح دی یعنی یہ کہ زرعی کالجوں اور اسکولوں سے ڈگری کے حصول پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ صرف ابتدائی انداز میں یہ سکھایا جائے کہ کوئی فصل کس طرح لگائی جاتی ہے۔ یہی وہ بات تھی جسے انھوں نے زرعی ذہن کی کاشت کے پہلے عمل، ذہن کے کھیت میں پہلی بار کھاد ڈالنے کا نام دیا جس میں زرعی ترقی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مالی تنگی نے انھیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ اعلیٰ معیار کے زرعی کالجوں کے قیام اور سائرن سسٹر کے بجائے سیدا پیٹ اور دہرہ دون میں ہندستانیوں کی تعلیم کے بہت زیادہ خواہش مند تھے۔ ایک دوسرا نقطۂ نظر مدراس کے ایگری کلچر کمشنر ایچ ایف کلاگسٹون نے پیش کیا جنھوں نے بک سے اختلاف کرتے ہوئے اوپر سے نیچے کے بہاؤ کی وکالت کی۔ انھوں نے کہا: وہ سرچشمہ جس سے تدریس کی قوت پھوٹتی ہے ایک بلند سطح پر رکھا جانا چاہیے اور ہم اس چشمے کو پورے ملک میں صحت مندی کے ساتھ بہتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ اس کی سوت صاف ستھری نہ ہو۔ کانفرنس نے آخرکار یہ سفارش کی کہ اعلیٰ زرعی تعلیم خصوصی اداروں کے ذریعے نہ فراہم کی جائے بلکہ موجودہ اداروں کے ساتھ اسے منسلک کر دیا جائے اور یہ کہ سائنسی زراعت میں تربیت یافتہ افراد کی درخواستوں کو ریونیو اور اس سے ہم رشتہ شعبوں میں قبول کیا جائے۔

ان تجاویز پر 1893 میں منعقد ایک دوسری کانفرنس میں غور کیا گیا اور یہاں بھی بک کے خیالات غالب رہے۔ اگلے ہی سال حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ سوال ایسا ہے کہ اسے زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے بتدریج حل کیا جائے گا اور یہ کہ زراعت کی مبادیات کو عام تعلیمی پروگرام کے علاوہ ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کے بجائے اسے بنیادی تعلیم کے نظام کا اٹوٹ حصہ بنا کر زیادہ کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ یہ حکومت کی طرف سے کیا گیا محتاط طور پر اختیار کردہ توسیعی اقدام تھا۔ زراعت مطالعہ کا ایک مخصوص شعبہ ہونے کے بجائے، جس میں تجسس و تجربے کے ہمراہ عملی کام کی بھی اہمیت ہو، عام اسکولی نصاب کا ایک حصہ بن کر رہ گئی اور وہ بھی ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے۔

حکومت ہند کا 1897 تک یہ خیال تھا کہ زراعت کی تدریس کے دعویدار اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے صوبائی کے بجائے قومی سطح کے ہونے چاہئیں اور یہ کہ ایک دو قومی سطح کے کالج پورے ہندستان کی ضرورت کے لیے کافی ہوں گے۔ مگر صوبائی حکومتیں اپنے متعلقہ علاقوں میں کالج کی سطح کی تدریس کے لیے بے چین تھیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ زرعی کالج میں دی جانے والی تعلیم محصول اراضی اور ہم رشتہ ملازمتوں میں ریاستی حکام کو اتنی ہی اچھی ٹریننگ فراہم کرتی تھی جتنی کہ کسی آرٹس کالج میں۔ استعماری حکومت کو یہ منطق پسند آئی اور اس نے 1897 میں مدراس، بمبئی، کلکتہ اور شمالی ہند کے کسی اور شہر میں اعلیٰ معیار کے چار کالجوں کے قیام کی تجویز رکھی۔

> **حکومت ہند کا 1897 تک یہ خیال تھا کہ زراعت کی تدریس کے دعویدار اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے صوبائی کے بجائے قومی سطح کے ہونے چاہئیں اور یہ کہ ایک دو قومی سطح کے کالج پورے ہندستان کی ضرورت کے لیے کافی ہوں گے۔**

اس فیصلے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ 1897 میں شب پور انجینئرنگ کالج میں زراعت کی کلاسیں کھل گئیں۔ بعض ضلعی سطح کے اسکولوں میں بھی زراعت کی کلاسیں شروع ہو گئی تھیں لیکن جلد ہی یہ سلسلہ بند ہو گیا کیونکہ یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان کے نصاب میں زراعت کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے نئے ضابطوں میں زراعت کی ڈگری کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ شک کیا جا رہا تھا کہ یونیورسٹیوں سے زرعی کالجوں کا الحاق ان اداروں کو سرکاری ملازمت کے حصول کا وسیلہ سمجھنے کے رجحان کو تیز تر کرے گا اور انھیں ان افراد کے عملی امکان سے مزید خارج کر دے گا جو حاصل کی گئی ٹریننگ سے نجی کاشت کاری یا انصرام آراضی سے منافع کمانے لگیں گے۔ 1901 میں منعقد زرعی تعلیم پر شملہ کانفرنس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے یہاں تک سفارش کی تھی کہ دیسی زبان کے متبادل کے طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے کیونکہ اس کے ذریعے حکومت زراعت کی تعلیم کو ان افراد میں مقبول بنانے کی توقع رکھتی تھی جو اسے پیشے کے طور پر اختیار کر کے روزی حاصل کرتے ہیں اور انگریزی سے ناواقفیت کی وجہ سے اس سے خارج نہیں کر دیے جاتے۔

کانپور میں قانون گوئی کی تربیت کے لیے کھولے گئے اسکول نے ترقی کر کے ایک نئے زرعی کالج کی شکل اختیار کر لی۔ 1897 کی قرارداد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے این ڈبلیو پی حکومت نے الہ آباد یونیورسٹی سے اس اسکول کو کالج کا مرتبہ دینے کے لیے کہا اور یونیورسٹی سینٹ (Senate) اس کے لیے فوراً آمادہ ہو گئی۔ اس کے تین بنیادی مقاصد تھے: اساتذہ کو ٹریننگ دینا، مالکان آراضی کو تعلیم دینا اور مال گذاری کے حکام کی فراہمی برقرار رکھنا۔ یہاں پر تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور ایم اے کی سطح کی تعلیم یہاں تک کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی زیر غور تھی۔ اس سے پہلے 1897 میں حکومت ہند نے این ڈبلیو پی میں ایک زرعی کالج کی خواہش کی پذیرائی کی تھی لیکن جب باضابطہ وہ تجویز سامنے آئی تو حکومت نے سرد مہری اختیار کر لی۔ جی او آئی کے ایگری کلچرل سکریٹری جے بی فلر نے اس سے اتفاق کیا کہ اس طرح کا ایک کالج طلبا کی خاصی تعداد کو متوجہ کر سکے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے 'قبل از وقت' قرار دے کر اس کی خدمت بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ آراضی کا انصرام سنبھالنے والے افراد کو ٹریننگ دینے میں اس کے نصاب تعلیم کی کوئی وقعت نہیں تھی اور یہ کہ ریونیو افسر کو جتنی ضرورت عملی زراعت سے واقفیت کی تھی اتنی سائنس کی نہ تھی۔ اس لیے کالج کے بجائے فلر نے بقول خود ایک زمینداری اسکول کے قیام کی وکالت کی اور وائسرائے نے اس کی منظوری دے دی۔ اسی طرح 1903 میں جب حکومت مدراس نے زرعی تعلیم کی حوصلہ افزائی کے طور پر سیدا پیٹ کے طلبا کے لیے دیہی تدریسی اسامیوں کے قیام کے لیے سالانہ 11,700 روپے طلب کیے تو حکومتِ ہند نے دینے سے انکار کر دیا۔

اگر چہ 1897 کی قرارداد میں چار اعلیٰ معیار کے کالجوں کی بات کہی گئی تھی لیکن حکومت ہند نے اپنے انتخاب کو صرف ایک ادارے تک محدود کر دیا جو کہ زرعی تعلیم و تحقیق کے لیے ایک محور کا کام کرتا۔ لیکن گرفت کون کرتا؟ استعماری حکومت پس وپیش میں پڑی ہوئی تھی جبکہ صوبائی حکومت زراعت پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے خرچ کر رہی تھی۔ Phipps کا ایک لاکھ ڈالر کا عطیہ آندھی کے پیر ثابت ہوا۔ یہ رقم پوسا میں ایک زرعی و تحقیقی انسٹی ٹیوٹ کھولنے کے لیے خرچ کی گئی جس میں ابتدائی سے لے کر متقدم مرحلے تک زرعی تعلیم کا ایک مکمل نصاب فراہم کیا جاتا تھا۔ تقریباً اس زمانے میں جنگل بانی کے لیے اسی طرح کے ادارے کے قیام پر غور کیا جا رہا تھا۔ تحقیق کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ ہونے لگی تھی۔

امراض مویشیان کی تعلیم دو اسباب سے اہم تھی۔ یہ ایک زراعت اساس معیشت میں کلیدی اہمیت رکھتی تھی اور فوج کو بھی اپنے گھوڑوں کے لیے سرجنوں اور مددگاروں کی مسلسل فراہمی درکار تھی۔ 1880 کی دہائی کے وسط میں فوج کے مقاصد کے لیے پونا کالج آف سائنس میں امراض مویشیان کی کلاسیں لگائی گئیں۔ لاہور میں ایک امراض مویشیان کا اسکول تھا جہاں مقامی زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ 1886 میں بمبئی میں امراض مویشیان کا ایک کالج کھولا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کالج تھا جہاں امراض مویشیان سے متعلق تعلیم انگریزی زبان میں پوری طرح یورپی طریقے سے دی جاتی تھی۔ اس تجویز کا آغاز جانوروں پر ظلم کے انسداد کی انجمن (Society for the Prevention of Cruelty to Animals) سے ہوا تھا۔ ڈی ایم پیٹ نے زمین کا عطیہ دیا۔ کچھ امداد کے لیے حکومت ہند سے رجوع کیا گیا لیکن جواب انکار میں تھا۔ اس کے بعد بمبئی کی حکومت اور بمبئی بلدیہ اس بوجھ کو بانٹنے پر راضی ہو گئے۔ ابتدا میں اس کالج نے طلبا کی خاصی تعداد کو متوجہ کیا۔ حوصلہ افزائی کے وسائل تھے مفت پیشہ ورانہ تعلیم اور روزگار کے روشن امکانات۔ 1887 میں طلبا کی تعداد 80 تھی لیکن 1891 میں یہ تعداد ایک دم سے گھٹ کر 42 ہو گئی۔ پرنسپل نے حکومت سے اس کالج کے چند طلبا کی ہر سال ملازمت میں تقرری کی ضمانت دینے کے لیے کہا۔ اگر چہ یہ ممکن نہ تھا، کالج نے اپنی بقا کا انتظام کسی طرح کر لیا۔ 1890 میں اسے ایک مرضیاتی و جرثومیاتی تجربہ گاہ بھی مل گئی۔ اس کے پہلے پرنسپل جے ایچ اسٹیل نے ہندستان میں امراض مویشیان کا ایک سہ ماہی مجلّہ شروع کیا۔ مجموعی طور پر اس کالج نے اچھی طرح کام کیا اور آگے چل کر اسے حکومت ہند کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر آئچیسن نے جب یہ سنا کہ بامبے ویٹریزی کالج میں عملہ کم ہے تو انھوں نے شعبہ امراض مویشیان کے سی پی کو معطل کر دیا اور وہاں کے سرجن کو بمبئی منتقل کر دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ وویلکر کے دورے کے فوراً بعد زراعت کو بہت زیادہ توجہ ملنے لگی تھی۔ پونا کالج فار سائنس میں 1890 میں ایک جرثومیاتی تجربہ گاہ قائم ہوئی۔ اصل خیال یہ تھا کہ اسے پاسچر کے انتھراکس ٹیکے کی تقسیم کی تجربہ گاہ بنالیا جائے۔ اس کالج میں امراض مویشیان کی تعلیم کے لیے مختص رقوم کو نئی تجربہ گاہ کی مد میں منتقل کر دیا گیا اور اب یہ اصل تحقیق کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ اس کا نام امپیریل بیکٹر یولوجیکل لیباریٹری رکھا گیا اور پورے ہندستان میں امراض مویشیان کے سروے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی۔ اس طرح پونا میں امراض مویشیان کی تعلیم کا اصل منصوبہ پس پشت جا پڑا۔

بنگال، بمبئی اور لاہور سے پیچھے تھا۔ 1883 میں کلکتہ میں امراض مویشیان کے ایک کالج کے قیام کی تجویز رکھی گئی تھی مگر حکومت بنگال نے اس کی مالی کفالت سے انکار کر دیا۔ 1886 میں اس پر دوبارہ غور کیا گیا اور پھر ترک کر دیا گیا۔ 1809 میں کلکتہ کے تاجر طبقے نے ایک 'پنجرہ پول' (جانوروں کی پناہ گاہ) قائم کی اور اس سے امراض مویشیان کی تعلیم کی ضرورت پر ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ دریں اثنا چونکہ پونا اور بمبئی نے راہ دکھائی تھی 1893 میں کلکتہ میں بھی امراض مویشیان کا ایک کالج کھل گیا۔ تین سال بعد اس کو بھی کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ اگر چہ طلبا کی تعداد کافی زیادہ تھی، کامیابی کی فیصد شرح لاہور اور بمبئی کے مقابلے میں کم تھی۔ کلکتہ میڈیکل کالج کے برخلاف امراض مویشیان کا کالج بہت کامیاب ثابت نہ ہوا۔ لاہور میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ جیسا کہ کیپٹن ٹرانڈل سپرنٹنڈنٹ، سول ویٹریزی ڈپارٹمنٹ، بنگال) نے بیان کیا:

لاہور میں طلبا زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے تین چوتھائی مسلم ہیں جو کم عمری ہی سے جانوروں کو سنبھالنے میں پوری طرح ماہر ہیں اور ان کی ایک بڑی تعداد Native Cavalry Regiments کے سواروں پر مشتمل ہے۔ بنگال میں حالات بہت مختلف ہیں جہاں داخلہ پانے والے بمشکل ایک فیصد طلبا گھوڑ سواری کر سکتے ہیں یا کبھی کسی جانور کو سنبھالا ہو اور بہت سے تو پہلے پہل اتنے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ گھوڑے کے نزدیک بھی نہیں جا سکتے۔

مدراس میں بھی کم وبیش یہی مسئلہ تھا۔ اگر چہ تجویز تقریباً 1893 میں پیش کی گئی تھی امراض مویشیان کا کالج 1901 سے پہلے قائم نہ ہو سکا اور وہ بھی کرزن کی ذاتی مداخلت کے بعد۔ مدراس کے گورنر کے نام اپنے ایک خط میں کرزن نے لکھا تھا:

''میں آپ کو ان باتوں کی بس ایک مثال دیتا ہوں جن کی وجہ سے ہمارا سکریٹریٹ افراتفری کا شکار ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مدراس گورنمنٹ زرعی علم اور اس کی بہتری کو فروغ دینے کے لیے کچھ نہیں کرے گی اور یہ کہ ہمارے کسی بھی مشورے کو فعال یا مجہول مقاومت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ایک شخص گووند داس یاد ہے جس نے آپ کو امراض مویشیان کے اسکول کے لیے 10,000 روپے کی پیشکش کی تھی اور اسے لینے سے انکار کر دیا گیا۔''

لاہور اور اجمیر کے امراض مویشیان کے اسکول بہتر طور پر اپنے مقصد کی تکمیل کر رہے تھے۔ چونکہ ان میں ذریعہ تعلیم اردو تھا اس لیے یہ دونوں اسکول عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ لیکن آگے چل کر لاہور اسکول کو زیادہ تقویت دینے کے لیے اسے اسکول کا درجہ دینا اور اجمیر کی رقوم کو لاہور منتقل کرنا زیادہ ضروری سمجھا گیا اور اس طرح 1905 میں اجمیر اسکول کا خاتمہ ہو گیا۔ ان امراض مویشیان کے اسکولوں اور کالجوں کو بڑے پیمانے پر خدمت کے لیے فعال نہیں بنایا گیا۔ شہری امراض مویشیان کے لیے تو وہ مفید ثابت ہی ہوئے لیکن ان سے سب سے زیادہ فائدہ فوج نے اٹھالیا۔

■

ماخذ: سائنس اور راج، **مصنف**: دیپک کمار، **مترجم**: سہیل احمد فاروقی، **پہلی اشاعت**: 2009، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اردو غزل پر تصوف کے اثرات

عبدالرحمن شافی

تصوف کا باضابطہ آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا، اپنی ابتدا کے ساتھ ہی یہ زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ تصوف نے جہاں اخلاق واعمال کو متاثر کیا، وہیں شعروادب پر بھی اپنے لازوال نقوش ثبت کیے۔ شاعری کی دیگر تمام اصناف کے بالمقابل غزل پر اس کا گہرا اثر پڑا اور صنف غزل بھی دوسری تمام اصناف ادب کے مقابلے میں پیش قدمی کرتے ہوئے تصوف کا دامن تھام لیتی ہے۔ دونوں ایسے مدغم ہوئے کہ نا تو تصوف ہی غزل کی جدائی قبول کرتا ہے اور نا ہی غزل اس کا دامن چھوڑتی ہے۔ جس طرح شاعری میں تصوف کے شامل ہونے پر شاعری کو متنوع مضامین ملے۔ غزل میں تصوف کے رموز و نکات کھل کر بیان کیے گئے، یہاں تک کہ اس کے دقیق مسائل چند مصرعوں میں بیان ہونے لگے۔ گویا اب تصوف کو اظہار کے لیے ذہن میسر آ گیا تھا۔ وحدت الوجود جیسا عظیم الشان نظریہ جس کی تفصیل کیلیے کئی ضخیم جلدیں بھی کم ہیں، وہ چند مصرعوں میں نظم کیا جانے لگا۔ مثلاً غالب کا یہ شعر دیکھیے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اسی طرح بیدم شاہ وارثی کا یہ شعر بھی۔

ہر شے میں دیکھتا ہوں جھلک حسن یار کی
مشتاق کو تمیز نہیں نور و نار کی

غزل میں تصوف کی شمولیت کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ان دونوں میں مزاج ومذاق کے اعتبار سے ہم آہنگی اور یک رنگی تھی۔ جس کے سبب غزل نے تصوف کے تمام استعارات وخیالات کو اس کے پورے لوازمات کے ساتھ قبول کیا، اسی مناسبت کی بنا پر تصوف غزل کے پورے منظرنامے بلکہ اس کی سرشت کا ایک خاص جز بن گیا۔

دیکھا جائے تو تصوف اور شاعری کا بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ تصوف سراپا اخفائے حال ہے، شاعری سراپا ظہور، شاعری، جس میں تصنع، تکلف اور ناز و انداز ہے۔ اس کے برعکس تصوف، جہاں تواضع، اخلاص، فنائیت، نیاز اور گوشہ نشینی ہے۔ ایک طرف سراسر ریا و نمود، محفل وانجمن کی آرائش وزیبائش ہے، وہیں دوسری جانب حجرہ نشینی، دنیا و مافیہا سے قطع تعلق اور خود کو گوشہ نشین بنالینا ہے۔

ان دونوں کے اختلاط سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ شاعری کے علاوہ دوسری کوئی زبان مسائل تصوف کو اتنے سہل انداز میں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ سالک کے قلب پر کوئی کیفیت گزرے، اظہار حال کسی صورت جائز نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ فعل تنزل اور بعد کا سبب بن جاتا ہے۔ منصور حلاج اس کی اولین مثال ہے (اگرچہ اس واقعہ کی نوعیت الگ تھی اور حلاج پر بعد والی بات منطبق بھی نہیں ہوتی، لیکن اظہار کے سبب ہی انھیں تکالیف سے دوچار ہونا پڑا تھا) اگر سالک سوزش عشق کا اظہار نہ کرے (جو کہ من وعن وہ نہیں کرسکتا) تو بقول غالب 'پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے' کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اس وقت شاعری کی زبان ہی وہ ذریعہ ہے، جو سالک کے احوال کو ذہن عطا کرتی ہے۔ اور اس کی باطنی کیفیات کا پاس رکھتے ہوئے مجاز و کنایہ کے قالب میں وہ سب کچھ بیان کر دیتی ہے، جنھیں وہ کھل کر نہیں کہہ سکتا تھا۔ جسے عارفین تو بخوبی سمجھتے ہیں لیکن غیر عارف کی سمجھ سے وہ بالا ہوتی ہے۔

انھیں کیفیات کو مخفی رکھنے کے لیے صوفیا نے تصوف کی کچھ مخصوص اصطلاحات وضع کیں، جنھیں اردو شعرا نے بڑی فراخ دلی سے نہ صرف یہ کہ قبول کیا بلکہ انھیں پوری اردو شاعری کا جزو لاینفک بنادیا۔ اردو غزل پر تصوف کی اصطلاحات واستعارات اثر انداز ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ وہ فارسی شاعری سے براہ راست متاثر ہوئی۔ فارسی میں صوفیانہ خیالات کی ترجمانی، حقائق ومعارف کی آگہی اور مشاہدات کی اتنی شدت اور کثرت تھی، کہ اردو زبان وادب اس سے دامن نہ بچا سکے۔ وہ خیالات اردو شاعری میں فنی تقاضوں کے ساتھ داخل ہوئے، جو حکیم سنائی، عطار، رومی وغیرہ کی عارفانہ مثنویوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح سعدی، حافظ، عراقی، امیر خسرو اور جامی کی فارسی غزلوں میں عشق حقیقی کی جھلک، مظاہر خداوندی اور واردات قلبی کی جو کیفیات نظر آتی ہیں، وہی بعد کے زمانے میں اردو غزل پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ احمد جامی کا یہ شعر دیکھیے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر ست

ترجمہ: جو لوگ (رب کی) تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل ہو جاتے ہیں، انھیں ہر زمانے میں غیب سے ایک نئی زندگی عطا کی جاتی ہے۔

شاعری میں استعارے کی زبان اس کے حسن میں اضافے کا سبب ہوتی ہے۔ یعنی لفظ کے معنی عام مفہوم سے ہٹ کر لیے جاتے ہیں، جیسے شمع پروانہ، یا لیلیٰ مجنوں، جو کہ شعری زبان میں مختلف معنی رکھتے ہیں۔ ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی شمع کے معنی موم بتی، یا پروانے کے معنی اس کیڑے کے نہیں لیتا، جو موم بتی کے گرد چکر لگاتا ہے، بلکہ ذہن فوراً عاشق اور محبوب کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ 'ادب' لٹریچر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن معاشرتی زندگی میں احترام کے معنی بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ اسی اصول کے تحت اردو شاعری میں مستعمل اصطلاحات کو جس وقت عرفان و آگہی کے پیرائے میں بیان کیا گیا، ان کے مفاہیم میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ تاثیر اور تاثر پیدا ہوا۔ جہاں رندی و مے خانہ، ساقی و شراب، جیسے موضوعات مخرب اخلاق شمار کیے جاتے تھے۔ وہیں رندی و مے کشی کے مخصوص الفاظ، حقائق و معارف کے ترجمان بن گئے۔ شراب کے جس قدر لوازمات ہیں، مثلاً میکدہ، جام و صہبا، سبو، شیشہ، صراحی، خمار، نشہ، صبوحی اور سرور وغیرہ۔ تصوف نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی، پھر یہی استعارات عزت و وقار کے ساتھ استعمال ہوئے۔ اب لفظ مے فروش 'ساقی یا پیر مغاں' اور لفظ جام 'دل' کے معنی سے موسوم ہوا۔ جیسے لفظ میکدہ مرشد کی قیام گاہ کے یا خدا کے گھر سے معروف ہوا، اسی طرح نشہ، سرور، اور نغمہ ان سب کیفیات سے مبدل ہو گئے جو ایک سالک پر دوران وجد و حال طاری ہوتے ہیں۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''تصوف کا یہ اعجاز تھا کہ وہ الفاظ جو رندی اور عیاشی کے لیے خاص تھے، حقائق اور اسرار کے ترجمان بن گئے۔ ساقی کا لفظ ہر زبان میں اس بد پیشہ شخص کے لیے موضوع ہے جس کی بدولت سیکڑوں آدمی لباس عقل سے عاری ہو جاتے ہیں اور سوسائٹی کے ذلیل ترین افراد میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن تصوف میں یہی شخص مرشد کامل اور عارف اسرار ہے۔''

(شعر العجم، حصہ پنجم، شبلی نعمانی)

صوفیانہ شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ وصل و ہجر کی کیفیات میں بھی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور نا ہی ایسے الفاظ و استعارات کو بروئے کار لاتی ہے، جو نزاہت و متانت کے خلاف ہوں، جیسے عیش، جوانی، رقیب، معانقہ، چلمن، رسوا، آنچل، مہندی، کمر، دہن، تل وغیرہ۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے اسی مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

جو میخانہ میں ہے ام الخبائث حضرت واعظ
پہنچ جاتی جو حجرے میں شراب الصالحیں ہوتی

متصوفین شعرا کے یہاں شراب اور نشہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، جس سے عرف عام میں یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ میخانہ اور اس کے لوازمات ان حضرات کو زیادہ مرغوب ہیں۔ اسی طرح بت، کافر، صنم، بتخانہ، دیر، برہمن وغیرہ الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی ان لوگوں کا شعار ہے اور ایمان کے مقابلہ میں ان لوگوں نے مذکورہ باتوں کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ مثلاً لفظ 'بت' مجازی اور صوفیانہ شاعری دونوں میں کثرت سے مستعمل ہے۔ ساتھ ہی اس کے متعلقات بھی جیسے، بتکدہ، بتخانہ، ناقوس، بت پرست وغیرہ مختلف مواقع کے لحاظ سے الگ معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ شعرائے مجاز اسے محبوب کے معنوں میں لیتے ہیں۔ چونکہ بت پتھر کا ہوتا ہے اس لیے اس میں سنگ دلی اور ستمگری کا عنصر ہونا لازمی بات ہے اور یہ ہمیشہ سے شعرا کا مقبول موضوع رہا ہے۔ داغ لفظ 'بت' کو مجاز کے پیرائے میں کس طرح باندھتے ہیں، اس شعر میں دیکھیں۔

نہ سمجھا، عمر گزری اس بت کافر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

مگر صوفیا 'بت' کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں، چونکہ کائنات کی ہر ایک چیز اس واحد مطلق کا مظہر ہے، اسی لیے ہر شے صوفیا کے نزدیک بت ہے یا یوں کہیے کہ ہر وہ چیز جو وصول الی اللہ میں واسطہ اور ذریعہ بنے 'بت' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین مجازی کو بھی حقیقی رنگ میں دیکھتے ہیں اور دنیا کی ہر ایک شے کو عشق حقیقی کی علامت سمجھتے ہیں۔ جیسے مجنوں کے نزدیک دن کی روشنی، لیلیٰ کے حسن کا جلوہ اور رات کی سیاہی، لیلی کی زلفوں کا پرتو تھا، اسی طرح عارفین بھی ہر ایک رنگ میں اسی کی جلوہ نمائی دیکھتے ہیں۔ اسی ضمن میں شاہ نیاز احمد بریلوی کی غزل کا یہ مطلع ملاحظہ ہو۔

کافر عشق ہوں میں بندۂ اسلام نہیں
بت پرستی کے سوا اور مجھے کچھ کام نہیں

اور میر کا وہ مشہور زمانہ شعر۔

میر کے دین و مذہب کو، پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ان اشعار میں یا اسی قبیل کے دوسرے شعروں میں قشقہ، دیر، ترک، وغیرہ اصطلاحات بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

صوفیانہ شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ وصل و ہجر کی کیفیات میں بھی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور نا ہی ایسے الفاظ و استعارات کو بروئے کار لاتی ہے، جو نزاہت و متانت کے خلاف ہوں، جیسے عیش، جوانی، رقیب، معانقہ، چلمن، رسوا، آنچل، مہندی، کمر، دہن، تل وغیرہ۔ یہ سب وہ اصطلاحات ہیں جن کا تعلق خارجی کیفیات سے ہے، چونکہ صوفیانہ شاعری فحش خیالات و الفاظ سے پاک ہوتی ہے اور تصوف میں عریانیت اور فحش نگاری سے کلی طور پر احتراز کیا جاتا ہے۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں:

صوفیانہ شاعری کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان الفاظ اور خیالات سے بالکل پاک ہوتی ہے جو پاکیزگی اور نزاہت اور تہذیب و متانت کے خلاف ہیں، مثلاً بوس و کنار، آغوش وغیرہ۔ کیونکہ تصوف میں عشق حقیقی کا بیان ہوتا ہے اور عشق حقیقی کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔'' (شعر العجم حصہ پنجم، شبلی نعمانی)

بیدم شاہ وارثی کا وہ قطعہ بھی دیکھیے، جس میں انھوں

نے شیشہ و پیمانہ، شکست توبہ، طاق حرم، بت خانہ جیسے استعارات کو اس طریقہ سے پیش کیا ہے، کہ ذہن بالکل بھی جام و مینا، رندی و معصیت کی جانب نہیں جاتا، بلکہ توجہ محبوب حقیقی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ قطعہ ملاحظہ فرمائیں۔

شکست توبہ کی تقریب میں جھک جھک کے ملتے ہیں
کبھی پیمانہ شیشہ سے کبھی شیشے سے پیمانہ
نہ محراب حرم سمجھے نہ جانے طاق بت خانہ
جہاں دیکھی تجلی ہو گیا قربان پروانہ

اسی قبیل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں، جن میں مذکورہ استعارات کو بروئے کار لایا گیا، لیکن ان سبھی الفاظ کو اس خوبی و کمال سے برتا گیا کہ ہر ایک لفظ کے معنی، عرفان و آگہی کے مرقع کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ امیر مینائی کہتے ہیں۔

ترا میکدہ سلامت، ترے خم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اترتا، مجھے کیوں خمار ہوتا

اصغر نے یوں بیان کیا کہ۔

حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے
سو راہ طریقت کھلی اک لغزش پا سے

جگر نے کہا۔

ہر دل ہے تیری بزم میں لبریز مے عشق
اک اور بھی پیمانہ سے پیمانہ بنا دے

ریاض خیر آبادی جو کہ خمریات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، کہتے ہیں۔

کوئی مست میکدہ آ گیا، مئے بے خودی وہ پلا گیا
نہ صدائے نغمۂ دیر اٹھی نہ حرم سے شور اذاں اٹھا
گئے ساتھ شیخ حرم کے ہم، نہ کوئی ملا نہ لیے قدم
نہ تو خم بڑھا، نہ سبو جھکا، جو اٹھا تو پیر مغاں اٹھا

تصوف نے اردو شاعری کی نشو نما میں صرف اصطلاحات سے ہی کام نہیں لیا، بلکہ اس کے مروجہ اصولوں کو بھی جلا بخشی، اس نے جذبات کے ساتھ احساسات اور افکار کو بھی متاثر کیا۔ تصوف کی اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات اردو شاعری، خصوصاً غزل میں اس کثرت سے داخل ہوئے کہ وہ فن شاعری کا اعجاز معلوم ہونے لگے۔ اس کثرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تصوف کے مسائل دقیق اور پیچیدہ ہوتے ہیں، اس لیے نثر میں ان کا بیان آسان نہیں۔ مثلاً مسئلہ وحدت الوجود کی تعریف نثر میں میکش اکبرآبادی کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

''صوفیا کے نزدیک وجود یعنی ہستی ہی حق ہے، اس کی کوئی شکل نہیں ہے نہ حد ہے، لیکن اس کا ظہور شکلوں ہی میں ہوتا ہے۔ موجودات کا ایک ذرہ بھی اس وجود کا غیر نہیں ہے۔ یہ وجود ایک ہے اور خارج میں وجود کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ہو۔'' (مسائل تصوف از میکش اکبرآبادی، ص 60)

اس نظریہ کو جس وقت شاعری کے پیرائے میں بیان کیا گیا، تب اس کا بیان نہ صرف یہ کہ آسان ہوا، بلکہ پر لطف بھی ہو گیا۔ وحدت الوجود کے مسائل اب چند مصرعوں میں بیان ہونے لگے۔ میر کا یہ شعر دیکھیے۔

پایا نہ یوں کے کریے، اس کی طرف اشارہ
یوں تو جہاں میں ہم نے، اس کو کہاں نہ پایا

اور شاہ نیاز بریلوی کہتے ہیں۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا

اسی طرح اصغر گونڈوی نے کہا۔

ازل میں کچھ جھلک پائی تھی اس آشوب جانم کی
ابھی تک ذرے ذرے پر ہے حالت رقص پیہم کی

تصوف کا یہ رجحان اتنا بڑھا کہ مجازی غزلوں میں بھی عشق و مستی، حقیقت و معرفت کی جھلک دکھائی دینے لگی اور صورت حال یہاں تک پہنچی کہ حقیقت و مجاز میں فرق کرنا دشوار ہو گیا۔ حتیٰ کہ محبوب کے سراپے میں بھی حسن مطلق تلاش کیا جانے لگا۔ انعام اللہ خاں یقین کا یہ شعر دیکھیے۔

خدا کی بندگی کہیے اسے یا عشق معشوقی
یہ نسبت ایک ہے، سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

تصوف نے غزل کو ایک زرخیز زمین عطا کی، لیکن وہ شعرائے لکھنو میں اپنا وہ مقام نہ بنا سکا جو اس کا حق تھا۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ شعرائے لکھنو نے جبر و استبداد اور ناکامی و محرومی کا وہ زمانہ نہیں دیکھا جس میں شعرائے دہلی کی تربیت ہوئی تھی۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ وہ معاشی طور پر فارغ البال تھے، ہر طرف مال و دولت کی فراوانی اور عیش و عشرت کا ماحول تھا، گویا ''ہر شب شب برات ہر روز روز عید'' تھا۔ نشاط و سرور کے اس ماحول میں تصوف کا نہ ہونا کوئی امر محال نہ تھا۔ بالمقابل شعرائے لکھنو کے، شعرائے دہلی کے کلام میں، دہلی کے نامساعد حالات اور صوفیا کی کثرت کی بنا پر درد آگینی، نالہ و فریاد، آہ و بکا جیسے عناصر پایا جانا ایک فطری بات تھی۔ لیکن شعرائے لکھنو میں یہ عوامل مفقود ہونے کے باعث ان کے کلام میں تصوف معدوم ہے مگر اس کے باوجود بھی دبستان لکھنو میں ایسے بہت سے شاعر تھے جو اردو میں کلاسیکی روایات کے علمبردار تھے اور جن کے یہاں تصوف کا رنگ خاصہ گہرا ہے۔ جن میں خاص طور پر خواجہ حیدر علی آتش، امیر مینائی، شاہ نیاز احمد بریلوی، امیر اللہ تسلیم، شاہ افضل الہ آبادی اور متاخرین میں نثار اکبرآبادی، آسی غازی پوری، بیدم شاہ وارثی، شاہ محمد احمد پرتاپ گڑھی، جیسے شعرا نے اپنے کلام کے ذریعہ تصوف کی اس شمع کو جلائے رکھا جسے شاہ ابو سعید ابوالخیر نے روشن کیا تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ متصوفانہ شاعری کے چند اہم عناصر ایسے بھی تھے، جنھوں نے ہمارے معاشرتی اور سماجی اقدار پر بھی خوشگوار اثرات ڈالے، جن سے اخوت، مساوات اور انسان دوستی جیسے اخلاق نے رواج پایا۔

■

Abdur Rahman Shafi
Research Scholar, Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.: 7017903577
abdurrehmanmalik70@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

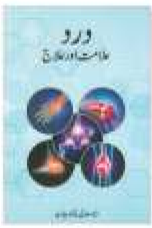

درد : علامت اور علاج

مصنف: ابوسعدی خالد جاوید

صفحات: 200، قیمت: 130 روپے، تیسرا ایڈیشن: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر یوسف رامپوری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج، دہلی

'صحت' قدرت کی جانب سے انسان کے لیے ایک ایسا انمول عطیہ ہے کہ جس کی جتنی بھی قدر کی جائے اور شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ وہی لوگ صحت کی قدر وقیمت کا اچھی طرح سے اندازہ کرسکتے ہیں جو کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے زندگی کی بہت سی لطافتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لیے ہر عہد میں باشعور اور عقلمند انسانوں کے ذریعے صحت پر خصوصی توجہ دی گئی، حفظانِ صحت کے اصول وضع کیے گئے، نوع بہ نوع تجربات کیے گئے، امراض کی تشخیص کی گئی، جڑی بوٹیاں تلاش کی گئیں، دوائیاں بنائی گئیں اور علاج ومعالجے کے مختلف طریقے دریافت کیے گئے۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے بلکہ گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں فی زمانہ صحت کے شعبے میں زیادہ کام ہورہا ہے۔ دراصل یہ وقت کی ضرورت ہے۔ پہلے مریضوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی، نہ دنیا کی اتنی آبادی تھی، نہ لوگ بار بار بیمار ہوتے تھے، اور نہ ہی ماحولیات میں اتنی زیادہ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی، مگر موجودہ عہد گویا بیماریوں کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ایک سے ایک مہلک بیماری سامنے آرہی ہے۔ ہر عمر کے لوگ مختلف امراض میں مبتلا پائے جارہے ہیں۔ بچے، نوجوان، جوان، بوڑھے، مرد، عورت بالعموم سب کو بیماریوں نے اپنی چپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اسپتال مریضوں سے بھرے پڑے ہیں، بازاروں میں قدم بہ قدم میڈیکل کھلے ہوئے ہیں جن پر دوائیاں خریدنے والوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ ہر شہر، قصبہ اور قریہ میں کلینک، شفاخانے اور ڈاکٹر موجود ہیں مگر ہنوز مزید شفاخانوں اور ڈاکٹروں کی کمی محسوس ہورہی ہے۔ اس صورت حال نے دورِ حاضر کے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ کس طرح بیماریوں سے خود کو محفوظ رکھیں اور اگر بیماریوں میں مبتلا ہوجائیں تو ان سے کیسے نجات پائیں؟ چنانچہ بہت سے لوگ حفظانِ صحت کے اصولوں کا تتبع کرتے ہوئے دکھائے دے رہے ہیں، کچھ لوگ مختلف امراض کی معلومات حاصل کرنے کے لیے کتب ورسائل کا مطالعہ کررہے ہیں، کچھ لوگ یوٹیوب پر موجود صحت اور بیماریوں سے متعلق ویڈیوز دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ماہرینِ صحت اپنی اپنی معلومات اور تجربات کی بنیاد پر مختلف طریقے اختیار کرکے اس تعلق سے لوگوں کی رہنمائی کررہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اطبا اور طب کی معلومات رکھنے والے مصنفین ومرتبین اس موضوع پر کتابیں بھی قلم بند کررہے ہیں اور کچھ ادارے صحت کی ضرورت کے پیشِ نظر ان کتابوں کو شائع بھی کررہے ہیں۔

اس حوالے سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا کردار قابلِ تحسین ہے کہ یہ ادارہ جہاں زبان وادب کے مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے، وہیں طب وسائنس، قانون اور تاریخ کے موضوعات پر بھی گراں قدر کتابوں کی اشاعت کو عمل میں لاتا ہے۔ اس ادارے سے حفظانِ صحت اور مختلف امراض پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے زیر اہتمام حال ہی میں شائع ہونے والی تازہ ترین کتاب 'درد: علامت اور علاج' ہے۔ کتاب کے مرتب ابوسعدی خالد جاوید ہیں جو وسیع المطالعہ شخص ہیں اور طب ومیڈیکل سائنس میں گہری دلچسپی ومعلومات رکھتے ہیں۔ یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کتاب سے اطباء بھی استفادہ کرکے اپنے مریضوں کا علاج کرسکتے ہیں اور براہ راست قارئین بھی احتیاط کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کو زیادہ سے زیادہ استفادے کے لائق بنانے کی

کوشش کی گئی ہے اور اسے اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ اس سے عمومی استفادہ آسان ہو۔ جیسا کہ ابوسعدی خالد جاوید زیر نظر کتاب میں خود رقمطراز ہیں:

''اس مواد کو ترتیب دیتے وقت مناسب اضافے اور ترمیمات کرنا ضروری تھیں۔ کچھ نامانوس محاورے اور مقامی الفاظ بدلنا پڑے۔ بہت سے نسخے جو فی زمانہ ناقابل استعمال نظر آئے حذف کر دیے گئے۔ پرانے اوزان کو نئے عشری اوزان میں تبدیل کیا گیا ہے، طب جدید کے اکثر نسخوں کو خارج کر دیا گیا کیونکہ اس میں بڑی جلدی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ محولہ کتابوں سے قابل لحاظ اضافات کیے گئے۔''

کتاب کا بنیادی موضوع اگرچہ 'درد' ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب درد کے ساتھ بہت سے امراض کی تشخیص اور علاج کے تعلق سے بھی اچھا خاصا مواد فراہم کرتی ہے۔ درد مختلف قسم کا ہوتا ہے، آنکھ کا درد، دانت کا درد، پیٹ کا درد، گردے کا درد، پتے کا درد، جگر کا درد، سینے کا درد، حلق کا درد، دل کا درد وغیرہ۔ پیش نظر کتاب میں ان سبھی سے بحث کی گئی ہے۔ درد کی نوعیتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، ان کی علامتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے علاج کے طریقے بتائے گئے ہیں، بہت سے مجرب نسخوں اور دوائیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کتاب کو گیارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں درد کا عمومی تذکرہ ہے۔ اسی کے تحت درد کے عمومی اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں اور درد کا کلی علاج بھی بتایا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے عمومی درد کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں، یعنی درد چاہے وہ کسی بھی طرح کا ہو، کہیں بھی ہو، فوری طور سے اس کا علاج کیسے کیا جائے؟ دراصل درد ایک بے چین اور تڑپا دینے والی شے ہے۔ خواہ درد آنکھ میں ہو یا دانت میں یا پیٹ میں یا کہیں اور مریض کو اس طرح بے قرار کر دیتا ہے کہ برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کبھی کبھی مریض شدت درد کی تاب نہ لا کر کراہنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں سب سے پہلے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے درد کو کم کیا جائے یا روکا جائے۔ چنانچہ اس باب میں ایسے طریقوں اور نسخوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ پہلی فرصت میں درد پر کیسے قابو پائیں؟

کتاب میں الگ الگ اعضا کے درد کو الگ الگ ابواب کے تحت بیان کیا گیا ہے جن میں درد کی تفصیلات، علامات، اقسام، اسباب اور علاج و طریقۂ علاج پر گفتگو کی گئی ہے۔ جیسا کہ دوسرے باب ''سر کا درد'' میں جن ذیلی عنوانات کے تحت سر کے درد کی تفصیلات سے بحث کی گئی ہے، وہ اس طرح ہیں: سر کا درد (عام)، درد سر کی مختلف اقسام کا تدارک، گرم درد سر، سرد درد سر، خشک درد سر، درد سر ضربی و سقطی۔ اسی طرح دیگر ابواب کے تحت آنکھ، ناک، کان، دانت، معدے، جگر اور پتے کے درد کی بھی تفصیلات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ صاحب کتاب نے باب نہم میں تلی کے ورم سے بھی گراں قدر بحث کی ہے۔ جیسے تلی میں ورم ہونا، تلی میں پیپ پڑ جانا، تلی کا پھول جانا، تلی میں پتھری ہو جانا وغیرہ۔ دسویں باب میں گردے کی ریح، گردے اور مثانے کی پتھری اور مثانے کے ورم کے سدباب کے لیے مجرب و منتخب نسخے پیش کیے گئے ہیں۔ گیارہویں باب 'تج اور مغض' میں جن امراض کا احاطہ کیا گیا ہے، ان میں قولنج، آنتوں کے کیڑے، گٹھیا، بواسیر اور پیچش جیسے امراض شامل ہیں۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں صرف 'درد' کی شدت، درد کی اقسام، درد کے اسباب اور درد کی روک تھام پر ہی توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے بلکہ مکمل مرض کے علاج و معالجے پر بھی خاص دھیان دیا گیا ہے۔ جن نسخوں کو تجویز کیا گیا ہے وہ صرف درد کو ہی نہیں روکتے بلکہ مرض کا علاج بھی کرتے ہیں۔ گویا کہ یہ کتاب مختلف امراض کا علاج بھی پیش کرتی ہے۔ صاحب کتاب اس بات کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو میں ایک نہایت قیمتی کتاب کی صورت میں مفید مواد پیش کیا۔ اس کتاب کے ایک سے زائد ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1991 میں شائع ہوا اور تیسرا ایڈیشن جسے قومی اردو کونسل نے چھاپا ہے سال رواں یعنی 2025 میں منظر عام پر آیا۔ اس ایڈیشن میں کتابت و طباعت کے معیار کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کاغذ بھی عمدہ اور شستہ ہے۔ امید ہے کہ اس تازہ ترین ایڈیشن کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

انسانی دماغ کمپیوٹر اور تعلیم

مصنف: انس مسرور

صفحات: 100، قیمت: 35 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد یونس انصاری، دہلی

انس مسرور انصاری کی کتاب 'انسانی دماغ کمپیوٹر اور تعلیم' مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں بچوں کی دلچسپی کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ اس میں سنجیدہ کہانیوں کے علاوہ تاریخ کے سبق آموز واقعات شامل ہیں۔ اس مجموعے میں 21 کہانیاں شامل ہیں، ان میں انسانی دماغ، کمپیوٹر اور تعلیم، جیسی صحبت ویسی رنگت، منفی اور نگیٹیو سوچ کے دائرے سے باہر نکلنا، وقت ایک سیلاب ہے، کامیابی اور ناکامی، وقت کی اہمیت، تعلیم سب کچھ ہے، تعلیمی تربیت اور ماں کا رول، موتیوں کے سوداگر، یہ دنیا ہے، چالاک طوطا، دوستی کا مطلب، استاد کی خدمت، حلال کی کمائی، خان مفلس، بہادر شکاری، انصاف کی طاقت، خزانے کا مالک، حویلی کی پہیلی، ماسٹر پیارے لال، آم کی چٹنی قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے کہانیوں کے ذریعے عصری علوم و فنون کی بنیادی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ چھوٹے بچے جو اردو پڑھنا، لکھنا سیکھ چکے ہیں وہ ان سبھی ضروری معلومات سے آگاہ ہو جائیں جو زندگی کے اگلے مرحلے میں ان کے کام آنے والی ہیں۔ جب یہ بچے جوانی میں قدم رکھیں گے تو انھیں کمپیوٹر اور جدید تعلیم سے سابقہ پڑے گا، اس لیے یہ کہانیاں پہلے سے ان کے لیے راہ ہمواری کا کام کریں گی۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں وقت کی اہمیت پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سے متعلق دو کہانیاں 'وقت کی اہمیت' اور 'وقت ایک سیلاب ہے' مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔ 'وقت کی اہمیت' بہت اہم کہانی ہے۔ اس میں وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت و افادیت کو مختلف زاویوں سے بیان کیا گیا ہے۔ موجودہ عہد کے بچے لایعنی اور فضول کاموں میں اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں، انھیں اس کا ذرہ برابر احساس بھی نہیں ہے۔ بچے اگر وقت کا صحیح استعمال کریں تو زندگی میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ ایک اچھا اور نیک انسان بھی بن سکتے ہیں، شاید اسی لیے مصنف نے اس کہانی میں بچوں کی توجہ بطور خاص مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ 'وقت ایک سیلاب ہے' میں بھی وقت کی قدر و قیمت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وقت کی رفتار ہماری سوچ سے کہیں زیادہ

ہے۔اس لیے وقت کی برق رفتاری کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ وقت اس دریا کی مانند ہے جو منجمد نہیں متحرک ہے، اس کا کام ہے بہتے رہنا۔ اس لیے انسان کو وقت کی اہمیت کے پیش نظر اپنے آپ کو مصروف رکھنا بہت ضروری ہے۔ وقت ہی اچھے اور برے کے مابین امتیاز کرتا ہے۔ ایک اچھا اور کامیاب انسان بننے میں وقت کے صحیح استعمال کا بہت اہم کردار ہے۔ کامیاب آدمی وقت کو کبھی برباد نہیں کرتا، وہ ہمیشہ اپنے مقصد کو پانے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی لیے وقت کامیابی کی کلید بھی کہا جاتا ہے۔

اس کتاب میں تعلیم کو بچوں کی توجہ کا اہم مرکز بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے دو کہانیاں بعنوان 'تعلیم سب کچھ ہے' اور 'تعلیمی تربیت اور ماں کا رول' بھی شامل کی ہیں۔ ان کہانیوں کے توسط سے انس مسرور انصاری یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ تعلیم سے ہی انسان کے اندر شعور آتا ہے۔ تعلیم انسان کو اچھے اور برے میں تمیز کرنے کے قابل بناتی ہے۔ تعلیم سبھی کے لیے ضروری ہے، چاہے مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، شہری ہو یا دیہاتی وغیرہ۔

تعلیم کی اہمیت وافادیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ ضروری نہیں کہ تعلیم حاصل کرکے آپ یقینی طور سے ملازمت حاصل کرلیں گے۔ بیشتر افراد اسی مقصد کو ذہن میں رکھ کر اسکول وکالج کا رخ کرتے ہیں جو کہ ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس خیال کو ترک کرکے حصول تعلیم کی طرف بڑھنا چاہیے جو کہ انسانی ذہن کے تاریک دریچوں کو روشن کرکے جینے کا صحیح ڈھنگ بتاتی ہے۔ کتاب میں شامل 'تعلیمی تربیت اور ماں کا رول' کہانی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں یعنی عورت اگلی نسل کو تیار کرنے میں بنیادی کردار نبھاتی ہے۔ بچے کا پہلا اسکول ماں ہی ہوتی ہے جہاں وہ نہ صرف ابتدائی تعلیم حاصل کرتا ہے بلکہ بہتر سے بہتر تربیت بھی پانے کی کوشش کرتا ہے۔ 'انسانی دماغ کمپیوٹر اور تعلیم' کی اگلی کہانی 'استاد کی خدمت' بھی اسی موضوع سے وابستہ ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انس مسرور نے مختلف جہتوں سے تعلیم کے موضوع کا احاطہ کیا ہے اور اس ضرورت، اہمیت اور وقعت کو سمجھانے کی سعی کی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے کتاب کا انداز واسلوب نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ چھوٹے چھوٹے عام فہم جملوں سے انھوں نے کہانیوں کا ترتیب دیا ہے، تاکہ بچوں کو انھیں پڑھنے اور سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

انس مسرور کا مطالعہ کافی وسیع اور گہرا ہے۔ انھوں نے کمپیوٹر اور تعلیم کے علاوہ زندگی کے اہم مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔ یہ کتاب مصنف کی ادب اطفال میں دلچسپی کی مظہر ہے جو مستقبل میں بچوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/240 روپے IFSC: CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

تحقیق و تنقید

خواتین کے ناولوں میں تانیثی فکر(1980-2000)

مصنفہ: ڈاکٹر ناز آفرین

صفحات: 200، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر جاں نثار معین، مدینہ پولٹری ڈسٹری بیوٹرس،

مین روڈ نیو فلائی اوور، احمد نگر کالونی، ظہیر آباد (تلنگانہ)

ڈاکٹر ناز آفرین ایک محققہ، استانی اور سرگرم سماجی کارکن ہیں۔ وہ ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ خواتین کے مسائل پر 35 سے زائد تحقیقی مضامین لکھ چکی ہیں۔

ڈاکٹر ناز کی تازہ تصنیف 'خواتین کے ناولوں میں تانیثی فکر (1980-2000)' اردو ادب میں تانیثی مطالعے کی ایک نہایت سنجیدہ، مدلل اور منظم کاوش ہے، جو محض تانیثی نظریات کا بیان نہیں بلکہ خواتین کے ناول میں موجود تانیثی عناصر کا تنقیدی، تاریخی اور فکری تجزیہ بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ کتاب اردو فکشن میں نسائی شعور کی تشکیل، ارتقا اور اس کے اظہار کی جہات کو نمایاں کرتی ہے، جو اردو تنقید کے دائرے میں اہم اضافہ ہے۔ مصنفہ بحیثیت محققہ، مدرسہ اور سماجی کارکن اپنی شناخت رکھتی ہیں۔

ابتدائیے میں مصنفہ نے تحقیق کے دائرہ کار، مقصد، اہمیت اور طریق کار کو سلیقے سے واضح کیا ہے۔ یہاں قاری کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مصنفہ کا زاویۂ نظر محض نسائی نظریہ سے متعلق نہیں بلکہ وہ ادب، معاشرہ اور تاریخ کے تکون میں عورت کے مقام کا ہمہ جہت جائزہ لینا چاہتی ہیں۔ سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے موضوع کی وضاحت کے ساتھ قاری کے لیے فکری زمین بھی ہموار کردی ہے۔

معروف نقاد قمر جمالی کا تحریر کردہ پیش لفظ کتاب کی فکری اہمیت کو سراہتے ہوئے مصنفہ کی علمی دیانت، تحقیقی بصیرت اور زبان و بیان کی خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ قمر جمالی نے بجا طور پر اس کتاب کو تانیثی ادب کے مطالعات میں ایک سنجیدہ تحقیقی دستاویز قرار دیا ہے۔

حصہ اول 'تحریکِ نسواں کا تاریخی جائزہ' نظریاتی بنیاد پر مبنی ہے۔ اس میں خواتین ناول نگاروں کے موضوعات، تانیثیت کے تاریخی پس منظر، اس کے ارتقائی مراحل اور اردو ادب پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کیریئرازم، کام کا دباؤ واستحصال، مارکیٹنگ اور ماڈلنگ، معاشی خود مختاری، صارفیت جیسے موضوعات کو سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی سطح پر پرکھا گیا ہے۔ اس باب میں محض نظریاتی گفتگو نہیں کی گئی ہے بلکہ تانیثی فکر کے مختلف عالمی اور مقامی مظاہر کو ادب کے سیاق میں شامل کر کے ایک جامع فریم ورک مہیا کیا گیا ہے۔ بالخصوص عالمی کانفرنسوں، اقوامِ متحدہ کی رپورٹس اور حقوق نسواں پر ہونے والی بین الاقوامی گفتگو کا حوالہ دے کر اردو ادب کو عالمی فکری دھارے سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

حصہ دوم 'خواتین کے ناول میں تانیثی فکر 1980 سے قبل' اردو فکشن میں تانیثی فکر کے ارتقا کو سمجھنے میں نہایت مددگار ہے۔ 1980 سے قبل کی ناول نگارات کی تخلیقات کا نہایت محتاط تجزیہ کیا گیا ہے اور تانیثی عناصر کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سے تاریخی تسلسل سے آگہی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ فکشن نگارات نے شعوری یا غیر شعوری طور پر کس طرح نسائی شعور کے بیج بوئے۔ اس باب میں تقابلی جائزہ لینے کے بجائے تانیثی شعور کے نمایاں اسالیب اظہار اور فکری لچک پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تانیثی فکر محض ایک نظریاتی وابستگی نہیں بلکہ ایک فکری ردِعمل اور داخلی شعور کی تجلی ہے۔ جو ناول کے کرداروں، واقعات اور بیانیے میں منعکس ہوتی ہے۔

باب سوم 'خواتین کے ناولوں میں تانیثی فکر 1980-2000' کے تحت خواتین کے ناول کا باریک بینی سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جو موضوعاتی وسعت کا حامل ہے بلکہ اس میں تنقیدی گہرائی اور فکر بھی بھرپور ہے۔ اس باب میں آزادی، خود مختاری، شناخت، معاشرتی جبر، جنسی ہراسانی، قتلِ جنین جیسے نازک مگر اہم مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان موضوعات پر جس جرأت، حساسیت اور فکری سلیقے کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، وہ ان کی تحقیقی پختگی کا مظہر ہے۔ کرداروں کی تشکیل، بیانیے کی تنظیم، مکالماتی سطح اور فنی ساخت کے پہلوؤں کو بھی فنی اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔ بالخصوص ان ناولوں کا تجزیہ ہے جن میں طبقہ نسواں مظلوم، مزاحمت اور بغاوت کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ عورت کی وجودی شناخت، صنفی تفریق کے خلاف احتجاج اور ثقافتی گھٹن سے نجات کی کوششیں نہایت فنکارانہ انداز میں اجاگر کی گئی ہیں۔

آخر میں کتابیات، حوالہ جات اور مراجع کی تنظیم نہایت منظم اور علمی ہے۔ ہر ماخذ کی درست درجہ بندی اور حوالہ جاتی ترتیب اس بات کی دلیل ہے کہ تحقیقی آداب کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔ اسلوب نہایت شستہ، علمی اور استدلالی ہے۔ جملوں میں غیر ضروری پیچیدگی سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے موضوع کو سادہ مگر باوقار انداز میں بیان کیا ہے۔ زبان کی شائستگی، بیانیے کا تسلسل اور ابواب کی منطقی ترتیب کتاب کو ایک اعلیٰ علمی و فنی معیار پر فائز کرتی ہے۔

یہ کتاب اردو فکشن میں تانیثی فکر کے تحقیقی مطالعے کی ایک بھرپور اور مستند دستاویز ہے۔ محض نظریاتی مباحث یا ناول نگارات کی فہرست سازی کے بجائے ہر باب میں علمی تجزیہ، فکری مکالمہ اور ادبی بصیرت کو یکجا کر کے ایک تحقیقی نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف ان محققین، ناقدین اور طالب علموں کے لیے رہنما ہے جو تانیثی ادب کو سنجیدگی سے سمجھنا اور اس کے تہہ دار پہلوؤں پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کو اردو تانیثی ادب کے مطالعات میں ایک حوالہ جاتی حیثیت حاصل ہے، جو آنے والے برسوں میں تنقیدی گفتگو میں شامل رہے گی۔ چونکہ یہ اردو ادب میں تانیثی تنقید کے دائرے میں نہایت اہم اضافہ ہے۔ اس سے اردو تحقیق و تنقید میں نئی راہیں کھلنے کے قوی امکانات ہیں۔

ترتیب

عطا عابدی - حیات اور شاعری: ایک مطالعہ

مرتب: محمد ضیاء الحق

صفحات: 305، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، حامد کالونی

محلہ: فیض اللہ خان، دربھنگہ (بہار)

عطا عابدی کو اپنی شخصی خوبیوں اور نمایاں ادبی کاوشوں کی بنا پر اعتراف و اعتبار

حاصل ہے۔ انھوں نے شعر اور نثر دونوں پیرایۂ اظہار کو اپنایا اور کامیاب رہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'آئینۂ عقیدت' (حمد و نعت) 1987 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد عکس عقیدت، افکار عقیدت، بیاض، نوشت نوا، زندگی، زندگی اور زندگی، خوشبو خوشبو نظمیں اپنی اور 'دریچے سے' شعری مجموعے ان کی شاعری کے تسلسل کا اظہار ہیں۔ انھوں نے کئی شعری اصناف مثلاً حمد و نعت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ، ہائیکو وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور پسند کیے گئے۔ بچوں کے لیے سبق آموز نظمیں ان کی شعری تخلیقات کے اختصاص میں شامل ہیں۔ 'مطالعے سے آگے'، 'شعر اساس تنقید' ان کی تنقیدی بصیرت کی تمثال ہے جبکہ 'بچوں کی کتابیں: تعارف و تذکرہ' (بہار کے حوالے سے) اور 'آزادی کے بعد بہار کے ادبی رسائل' تحقیق کے باب میں ان کی سنجیدہ کوششوں کا آئینہ ہے۔ ادب اطفال کے ضمن میں 'مناظرے مذکر و مؤنث کے' سے بچوں کے لیے ان کی فکرمندی ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے 'سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب' اور 'تشکیل و تعبیر' جیسی اہم کتابیں بھی ترتیب دی ہیں۔ مذکورہ بالا کا مقصد عطا عابدی کی تخلیقی اپج سے آشنائی اور اعتراف کی صورت گری ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی اہم ہے کہ ان کی شخصیت اور فن کاری کے حوالے سے تین کتابیں 'شعر و شناخت' (مصنف: ڈاکٹر ریحان احمد قادری)، عطا عابدی اور ادب اطفال' (مرتب: ڈاکٹر منور راہی) اور 'التفات و اعتراف' (مرتب: ڈاکٹر اوینا ش امن) منظر عام پہ آچکی ہیں اور اس سلسلے کی چوتھی کتاب 'عطا عابدی: حیات اور شاعری (مرتب: محمد ضیاء الحق' ابھی ابھی شائع ہوئی ہے جو میرے مطالعے کا حصہ بنی ہے۔

اس کتاب کے مرتب محمد ضیاء الحق ہیں۔ درس و تدریس سے ان کی وابستگی ہے اور شعبۂ اردو، آر این اے آر کالج، سمستی پور بہار میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پہ فائز ہیں۔ صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ یہ ان کی پہلی ادبی ترتیبی کاوش ہے۔ انھوں نے 27 صفحات پر محیط مبسوط پیش لفظ میں مشمولہ قلم کاروں اور ان کی تحریروں پر روشنی ڈالی ہے۔

'عطا عابدی: حیات اور شاعری' چھ ابواب میں منقسم ہے اور سبھی کے لیے عنوانات مختص کیے گئے ہیں۔ باب اول اور دوم میں ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ باب اول 'شخص و عکس' میں منظومات کے تحت پندرہ شعراء ڈاکٹر رؤف خیر، ڈاکٹر ظفر کمالی، عاصم شہنواز شبلی، خالد عبادی، تسلیم نیازی، امان ذخیروی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سلفی، پروفیسر عبدالمنان طرزی، سوامی شیا مانند سرسوتی روشن، ثناء اللہ ثنا دوگھروی، ڈاکٹر قمر گوالیاری، ڈاکٹر منصور عمر، منیر سیفی، احمد علی برقی اعظمی، شکیل سہسرامی کے کلام میں عطا عابدی کی ادبی خدمات کا ذکر ہے۔ اسی باب میں 'منثورات' کے تحت عطا عابدی: ایک تعارف (خالد مصطفیٰ صدیقی)، عطا عابدی: ایک تاثر ((پروفیسر وہاب اشرفی)، ماہ نومبر کے آفتاب و مہتاب (نذیر احمد یوسفی)، ڈاکٹر عطا عابدی: ایک دیدہ ور قلم کار (خورشید پرویز) مضامین سے ڈاکٹر عطا عابدی کی شخصیت اور ادبی کارگزاریوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد مجتبیٰ احمد، ڈاکٹر محسن رضا رضوی، ڈاکٹر ایوب راعین، ڈاکٹر منور راہی، ڈاکٹر مظفر نازنین، توصیف احمد اور ڈاکٹر ریحان احمد قادری کی تحریریں بھی اس باب کا حصہ ہیں۔

باب دوم 'شعر و شناخت' کو موضوعاتی نہج سے تین خانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عطا عابدی کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری ہے۔ 'عکس عقیدت' اور 'افکار عقیدت' کا مطالعہ ان کی ذہنی اور فکری آبیاری کا روشن مینارہ ہے۔ اس حوالے سے اٹھائیس مضامین کی شمولیت سے اس باب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، عبدالرافع، ڈاکٹر منصور عمر، سلیم انصاری، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، کوثر صدیقی، ڈاکٹر مشتاق احمد، اظہر نیر اور دیگر قلمکاروں نے 'عکس عقیدت' کی شاعری سے گفتگو کرتے ہوئے عطا عابدی کے صادق جذبوں کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح 'افکار عقیدت' کے حوالے سے پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر منظر اعجاز، یعقوب سروش، بدیع الزماں سحر وغیرہ مشاہیر قلم کار نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسی باب کے حصہ 2 میں ڈاکٹر عطا عابدی کی غزلیات پر معتبر اہل نظر کے ذریعے تحریر کردہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ عطا عابدی بحیثیت غزل گو اعتراف و شناخت کی عمدہ کڑی ہے۔ یہاں مضمون نگاران کی ایک کہکشاں آباد ہے جس میں پرانے اور نئے لکھنے والے موجود ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'بیاض' اور 'نوشت نوا' میں شامل غزلیہ شاعری کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے مضامین رتبصرے متاثر کرتے ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر ثوبان فاروقی، ارشد کمال، ڈاکٹر مبین صدیقی، ڈاکٹر اسلم حنیف، خالد عبادی، ڈاکٹر قاسم فریدی، عبدالاحد ساز، احسن امام احسن، ڈاکٹر محمد مستمر، عبدالرافع، پروفیسر سلیمان اظہر جاوید، نعمت شمع، ڈاکٹر مشتاق احمد، بسمل عارفی اور سید ظفر ہاشمی وغیرہ کئی اہل قلم نے 'بیاض' کے محتویات سے گفتگو کی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر سید باری، علقمہ شبلی، بے نام گیلانی، احمد عثمانی، محمد متین ندوی اور ڈاکٹر منور حسن کمال کے مشمولہ مضامین سے عطا عابدی کی شاعری کے جواہر نگاہوں میں روشن ہوتے ہیں۔ مذکورہ ادباء کے مضامین میں 'نوشت نوا' کو مرکزیت حاصل ہے۔ دوران مطالعہ عطا عابدی کی شاعری کے تعلق سے صاحب طرز نثر نگار حقانی القاسمی کی تحریر کے ان سطور نے من موہ لیا۔ ان کی شاعری کے حوالے سے اہم رائے کے طور پر یہ سطور پیش کرتا ہوں:

"یہ ایسی شاعری ہے جو مادیت اور صارفیت کے عہد میں کتھارسس کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ یہ باطن کو فروزاں کرنے اور انسانی اذہان کو منفیت کے سیاہ بادلوں سے بچانے کی کوشش ہے۔ عطا عابدی کو اپنی ذات کا عرفان اور شعور ہے۔ اپنی جڑوں سے وابستگی نے ان کے شعری کردار کے دائرہ کو محدود نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے مختلف زاویوں کو سمجھنے اور شاعری میں متشکل کرنے کے لیے مہمیز کیا ہے۔" (ص 255)

'زندگی، زندگی اور زندگی' کے حوالے سے سید حسن نواب، ڈاکٹر آصف سلیم، ڈاکٹر رفیق احمد، ابو صارم صارم، ایم رحمٰن، اور ڈاکٹر ریحان احمد قادری کی تحریریں عطا عابدی کی نظموں کے مطالعے پر محیط ہیں۔ 'دریچے سے' پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالمتین جامی، پروفیسر آفتاب اشرف اور ڈاکٹر احسان عالم کے مضامین سے اس ترتیبی کاوش کو سجایا گیا ہے۔ یہ تحریریں متعدد اصناف شاعری میں عطا عابدی کی طبع آزمائی کے اوصاف ظاہر کرتے ہیں۔

ادیبہ حیات شفا کا مضمون 'عطا عابدی کی پانچ نظمیں' باب چہارم ہے۔ یہاں منتخب نظموں کے جائزے سے ادب اطفال میں عطا عابدی کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ باب پنجم اہل قلم کی مختصر تحریروں کی یکجائی ہے جس میں عطا عابدی کی شعری تخلیقات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آخری باب 'انسلاک و اشتراک' میں عطا عابدی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مرکوز تین کتابوں کے مشمولات کی فہرست شامل ہے۔

اس کتاب کو ڈاکٹر عطا عابدی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے ترتیب دی گئی کتابوں کا تسلسل کے طور پر دیکھتا ہوں۔ جہاں عطا عابدی کی حیات اور فن پر لکھے گئے مضامین، عطا عابدی کی شاعری کا مطالعہ اور ادب اطفال کے ادیب و شاعر عطا عابدی کے تعلق سے مشاہیر ادباء کے مضامین تین کتابوں کا حصہ بنے وہیں محمد ضیاء الحق کی یہ تالیف عطا عابدی کی شاعری کو مزید جاننے اور سمجھنے میں معاونت کرے گی۔ اس کتاب میں ترتیب کا حسن اور مشمولات کی پیش کش کا انداز متاثر کرتا ہے۔ یقین ہے، اس سے استفادہ کیا جائے گا اور التفات واعتراف کی راہ ہموار ہوگی۔

تراجم

نوائے سروش: ایک انوکھی کتاب

شاعر: خلیل جبران، مترجم: احمد حسین

صفحات: 164، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 20214

مطبع: یوروپین پرنٹرس، نئی دہلی

تبصرہ: عظمیٰ، ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی- دہلی

خلیل جبران کی تصانیف عالمی ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں جن میں فلسفہ، روحانیت اور انسانی جذبات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ 'نوائے سروش' دراصل خلیل جبران کی مشہور کتاب 'The Prophet' کا اردو ترجمہ ہے جسے احمد حسین نے غیر معمولی سلیقے، جذبے اور فکری گہرائی کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

احمد حسین کا ترجمہ اس قدر دلنشین ہے کہ پڑھتے ہوئے اکثر یہ گمان ہوتا ہے جیسے اصل متن اردو ہی میں لکھا گیا ہو۔ ترجمہ نہ صرف سادہ اور رواں ہے بلکہ احساسات اور جذبات کی وہی گہرائی بھی برقرار رکھی گئی ہے جو جبران کی اصل تحریر کا خاصہ ہے۔

خلیل جبران نے اس کتاب میں محبت، شادی، اولاد، جرم وسزا، جدوجہد، خوشی وغم، وقت، مذہب، دوستی، نیکی، تعلیم اور موت جیسے آفاقی موضوعات کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر انسان کی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر ابھرتے ہیں، اور جن کے جوابات کی تلاش میں ہم اکثر بے چین رہتے ہیں۔

کسی بھی کتاب کے ترجمے کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہوتا ہے کہ اس کے اصل متن کو اس طرح نئی زبان میں ڈھالا جائے کہ قاری کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہو کہ وہ اصل کتاب پڑھ رہا ہے ترجمہ نہیں۔ احمد حسین کا کارنامہ یہاں یہ ہے کہ انھوں نے بہت حد تک اس میں کامیابی حاصل کی ہے ان کا ترجمہ لفظی ہونے سے زیادہ حسی محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے محض الفاظ کی منتقلی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے چھپے جذبے کو بھی بہت حد تک ابھارا ہے، ان کی زبان سادہ، پراثر اور دلنشین ہے، جو فلسفیانہ پیچیدگی کو عام فہم بناتی ہے۔

محبت کے باب سے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

''جب محبت تمھیں پکارے تو اس کی آواز پر لبیک کہو
جب محبت تمھارے لیے اپنی بانہیں کھول دے
تو تم اس سے لپٹ جاؤ''

(حسین احمد: نوائے سروش (ترجمہ النبی از خلیل جبران)، 2024، ص 33)

کتاب میں 28 نثری نظمیں شامل ہیں، جو ایک مربوط کہانی کے طور پر بھی پڑھی جا سکتی ہیں اور انفرادی موضوعات کے اعتبار سے بھی۔

بقول احمد حسین:

''جبران اپنی اس کتاب میں دنیا میں آمد اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر جانے کی مختصر کہانی پیش کرتے ہیں وہ زندگی کا مقصد اور دنیا میں جینے کے طریقہ ہائے کار بتاتے ہیں اور مسائل سے نپٹنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 17)

کہانی مصطفیٰ نامی خیالی کردار کے گرد گھومتی ہے جو شہر فالیس میں چند دنوں کا مہمان ہے جس کے ذریعے سے شہر فالیس کے لوگوں کو علم وحکمت کی باتیں بتائی جاتی ہیں، مصطفیٰ لوگوں کو اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں بہت سی قیمتی باتیں بتاتا ہے جو اس نے خود بھی زندگی سے سیکھیں تا کہ لوگ اس کی باتوں سے فیض یاب ہو سکیں۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ 100 سے زائد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

مجموعی طور پر، احمد حسین نے ترجمہ نگاری میں سادگی اور روانی کو برقرار رکھتے ہوئے پیچیدہ اور فلسفیانہ خیالات کو عام فہم بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کی اس کاوش سے خلیل جبران جیسے عظیم اور قلندرانہ فکر کے حامل شاعر کی تخلیق کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی ان سوالات کے جوابات تک پہنچنے میں بھی مدد ملتی ہے جو اپنے اندر زندگی کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

فکشن

تماشا (افسانچوں کا مجموعہ)

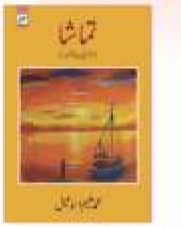

مصنف: محمد علیم اسماعیل

صفحات: 130، قیمت: 200 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: فردوس انجم، لیموں والا، کے جی این ڈائری، وارڈ نمبر 6 اقبال نگر، ضلع: بلڈھانہ (مہاراشٹر)

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں افسانچہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ اور نوجوان نسل کا ایک سیلاب اس صنف میں اپنے جوہر دکھانے کے لیے امڈ پڑا۔ محمد علیم اسماعیل ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ساتھ ہی عمدہ افسانچے بھی تخلیق کرتے ہیں۔

میں نے شروع سے ہی محمد علیم اسماعیل کو پڑھا ہے ان کے دو افسانوی مجموعے 'الجھن اور رنجش' کے علاوہ تیسری کتاب 'افسانچے کا فن' کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اور اب میرے ہاتھ میں ان کی ابھی ابھی شائع ہوئی خالص افسانچوں کی کتاب 'تماشا' ہے۔ جس کا انتساب محترم بشیر مالیرکوٹلوی کے نام کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں افسانچے کے پہلے ناقد ڈاکٹر عظیم راہی کا مضمون ہے جو علیم اسماعیل کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں کہیں وہ اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں اس کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مضمون بھی موصوف کے فن پر روشنی ڈال رہا ہے۔ اس کے بعد علیم اسماعیل کا مضمون 'افسانچے کی حمایت میں' بہت ہی جاندار مضمون ہے۔ اس مضمون میں افسانچے کے خدوخال سے لے کر ناقدین کی اہمیت اور افسانچے پر اعتراضات سے لے کر اس کی صنفی حیثیت اور دیگر

کئی اہم پہلوؤں پر اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مضمون مجھے پسند آیا۔ جیسے جیسے صفحات کھلتے گئے زندگی کے مختلف موضوعات پر مبنی تماشے بھی 100 افسانچوں میں میرے سامنے آتے گئے۔ محسوس ہوا کہ اس کتاب کا نام مصنف نے بالکل درست رکھا ہے۔

کتاب 'تماشا' کے فلیپ پر چند ادیبوں کے تاثرات موجود ہیں جس میں پروفیسر طارق چھتاری کے الفاظ دیکھیے۔ ''مختصر ترین افسانے لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ بڑی فنکاری چاہیے۔ آپ اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔''

اس کتاب میں علیم اسماعیل نے ان ہی افسانچوں کو جگہ دی ہیں جن میں موجودہ دور کے تماشے پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ پرانی قدروں کی پامالی سے لے کر تعلیم، سیاست، ادب، معاشرہ، عورت، انصاف غرض ہر ایک چیز اپنے حصے کا تماشا لیے ہوئے ہیں۔ جہاں نظر ڈالیں وہاں تماشا لگا ہوا ہے، عورت کا اپنی بے بسی کو لے کر، تو ادیب کا اپنی تخلیق کو لے کر، سیاست دانوں کا اپنے مفاد کو لے کر اور طلبہ کا مستقبل کو لے کر۔ تماشا، درندے، تبدیلی، قیامت، غیرت، افسوس، مستقبل، ایوارڈ، تعلیم، اکیسویں صدی کا شہزادہ سلیم، مطالبہ، بی۔ اے پاس وغیرہ ایسے افسانچے ہیں جو سر دھننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ محمد علیم اسماعیل مشاہدے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ جو دیکھتے ہیں اسے ہی تخلیقی روپ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تماشا کے افسانچے ان کے مشاہدے کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون 'علیم اسماعیل کی افسانچہ نگاری' میں لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر محمد علیم اسماعیل کو آج کے عہد کا منفرد افسانچہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ ان کے کئی افسانچے تو ہمیں سر دھننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ہمیں غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔''

بہو اور بیٹی، حل، تیسری، دیا اور تھالی، کامیابی کا راز، ایک بچی کی خود کلامی، وکاس وغیرہ افسانچوں میں مصنف نے اپنی فن کارانہ مہارت سے طنز کے تیر چلائے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم کس سمت گامزن ہیں۔ افسانچہ 'تیسری' ماڈرن زمانے کی سوچ کا حقیقی ترجمان ہے۔ محمد علیم اسماعیل نے موجودہ دور کی صورت حال کو نہایت ہی احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔

علیم اسماعیل کا کہانیوں کو بیان کرنے کا انداز منفرد ہے۔ سادہ عام فہم زبان میں ان کی بات ڈائریکٹ دل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ قاری اسے ایک ہی نشست میں پڑھ لیتا ہے۔ بوریت کا احساس نہیں ہوتا اور معاشرے کی موجودہ صورت حال تخلیقی پیرائے میں آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔

چونکہ متعدد اساتذہ حضرات نے افسانچے کی پنچ لائن کو افسانچے کی کامیابی قرار دیا ہے۔ محمد علیم اسماعیل کے افسانچوں میں یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ کہیں کہیں پنچ لائن کمزور ہوئی ہے۔ ایسا ضروری بھی نہیں کہ ہر افسانچہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر یہ قاری پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس بات کا کیا اثر قبول کرتا ہے۔ میرے نزدیک افسانچے کی دنیا میں یہ کتاب کسی گوہر سے کم نہیں۔ نئے لکھنے والے بھی اس سے خوب استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

طنز و مزاح

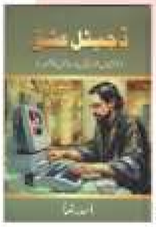

ڈجیٹل عشق

مصنف: اسد رضا

صفحات: 228، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2024

پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: احمد علوی 10/7 بہار گولین، بولیورڈ تیس ہزاری دہلی۔ 54

ان دنوں طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی حامل کتب خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ زیر بحث کتاب ایک ایسی ہی دلکش تصنیف ہے۔ دراصل ڈجیٹل عشق اسد رضا کی بائیسویں کتاب ہے، جس میں تیس فکاہیہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب میں صرف دو مختصر مضمون کتاب کے تعارف میں بطور تمہید شامل کیے گئے ہیں۔ ایک صفحے کا مختصر مضمون پروفیسر خالد محمود کا ہے اور تین صفحے کا مختصر مضمون ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کا ہے جس سے بلاشبہ کتاب بوجھل ہونے سے بچ گئی ہے۔ اس سے مطلب صاف ہے کام کی بات نو بکواس۔

پروفیسر خالد محمود رقم طراز ہیں اسد رضا معروف مزاح نگار' پختہ گو شاعر' سینئر صحافی اور انگریزی کے سابق لیکچرر ہیں یہ بیس سے زائد کتب کے مصنف، مترجم اور مولف ہیں جنھیں ساہتیہ اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، اردو اکادمی دہلی اور انجمن ترقی اردو ہند سمیت سو سے زائد ادبی و ثقافتی تنظیموں نے انعامات و اعزازات سے نوازا ہے۔ اسد رضا کی ایک کہانی نصاب میں بھی داخل ہے اور ان کے تحریر کردہ ناول پر بنائی وی سیریل دوردرشن کے ٹی وی چینل ڈی ڈی اردو پر بھی چل چکا ہے۔ 'اسد رضا بحیثیت طنز و مزاح نگار' کے موضوع پر فرح صدیقی نے اپنا ایم فل کا مقالہ لکھ کر ڈگری لی ہے. اسد رضا کی علمی و ادبی خدمات کی بدولت ہی ان کو جامعہ اردو نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے کتاب میں شامل انشائیوں پر بات کی ہے، ان کی نظر میں اسد رضا کے طنزانچے خاصے کی چیز ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا یعنی تیر بہ ہدف ہوتے ہیں۔

آج جیسا کہ ٹک ٹاک اور ریل کا زمانہ ہے طویل افسانے اور ضخیم ناولوں کو پڑھنا تو دور کوئی ہاتھ لگانے کو بھی تیار نہیں ہے آج دس سیکنڈ کی ریل بھی اگر پر تاثر نہیں ہو تو ریل دیکھنے والا دو سیکنڈ میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں طنزانچے جیسا اسلوب ہی کامیابی کی سند ہو سکتا ہے، لیکن یہ فن کوزے میں دریا بند کرنے والا ہے۔ اگر طنزانچے میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہوگی تو یہ اپنا تاثر قائم نہیں کر پائے گا۔

زلف دراز مانگ کے... مضمون بھی اسد رضا جیسا طنز نگار ہی قلم بند کر سکتا ہے جو خود اپنا مذاق اڑانے کا جگر رکھتا ہے. دوسروں پر ہنسنا بہت آسان ہے خود پر ہنسنا بہت مشکل مگر یہ کام اسد رضا بڑی آسانی سے لیتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

اسد رضا کے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ موصوف صرف ڈجیٹل عشق تک محدود ہیں۔ ان کی اس کتاب میں ڈجیٹل شاعر بھی موجود ہے یہ ڈجیٹل اصلاح بھی فرماتے ہیں۔ ان کے رشتے بھی ڈجیٹل ہیں. حد تو یہ ہے کہ ڈجیٹل قربانی

کا تصور بھی انھوں نے پیش کر دیا ہے۔

کتاب کے مضامین میں لطف پیدا کرنے کے لیے جا بجا معروف شاعروں کے اشعار کا استعمال کیا گیا ہے جس میں لاپروائی برتی گئی ہے اگر تھوڑی عرق ریزی سے کام لیا جاتا تو درست شعر کوٹ کیے جا سکتے تھے مثال کے طور شہنشاہ ظرافت دلاور فگار کا یہ شعر یوں ہے۔

شاعر تو کہہ رہا تھا کہ میں نے کہے ہیں شعر
اور شعر کہہ رہے تھے چرائے ہوئے ہیں ہم

کتاب میں یہ شعر غلط چھپا ہے۔

شاعر تو کہہ رہا تھا کہ میں نے کہا ہے شعر
اور شعر کہہ رہے تھے چرائے ہوئے ہیں ہم

یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ آپ ایک ہی نشست میں مکمل کتاب پڑھ جائیں گے اور کتاب ختم ہونے پر سوچیں گے کہ اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئی۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے کیونکہ اس کی تخلیق بھی ڈیجیٹلی کی گئی ہے۔ کتاب کے بیک فرنٹ پر اسد رضا کی نوجوانی کی وہ تصویر چھاپی گئی ہے جس تصویر کو دیکھ کر ان کی اہلیہ نے ان کو پسند کیا تھا. جب کہ 'اف ترا کافر بڑھاپا جوش پر آیا ہوا' کے تعلق سے یہ زندگی کی 73 بہاریں دیکھ چکے ہیں اور ماشاءاللہ ابھی بھی اپنے موبائل کو صرف ڈیجیٹل عشق کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے تاکہ یہ اپنی ڈیجیٹل شاعری ڈیجیٹل قربانی اور ڈیجیٹل رشتوں جیسے مضامین لکھ کر ہمیں یونہی ہنسا تے ہنساتے سوچنے پر مجبور کرتے رہیں۔

شاعری

حواشی

شاعر: شہرام سرمدی

صفحات: 144 قیمت: 225 روپے

ناشر: بازگشت بکس، نئی دہلی

مبصر: محمد ارشد ہمراز

ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔ 500032

شہرام سرمدی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو کم لکھتے ہیں مگر جب لکھتے ہیں تو کچھ ایسا کہ اس پر سلسلہ بحث بہت دیر اور دور تک چلتا ہے۔ 'ناموعود' کے بعد 'حواشی' تک کا سفر تقریباً دس برسوں پر محیط ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہرام جب سرمدیت کے نشے میں پوری طرح سرشار ہوتے ہیں تب ہی ایسی نظمیں تخلیق پاتی ہیں جن کا اسلوب اور موضوع قاری کو پہلے پہل چونکاتا ہے اور جب یہ گرفت میں آنے لگتی ہیں تو قاری بھی ان کی گرفت میں آجاتا ہے اور صفحہ آخر تک یہ اسے باندھے رکھتی ہیں۔ کہیں کہیں طلسماتی، داستانوی اور دیو مالائی فضا کی تخلیق بھی تجسس کی کیفیت میں مبتلا کرتی ہے۔

'حواشی' کو صورت ہستی کی معنوی تفسیر لکھنے والے امیر حمزہ ثاقب نے درست کہا ہے:

''ایک طلسمی فضا اور گہری ہوش مند خاموشی شہرام کی نظموں کا کلیدی وصف ہے۔ ایک شفاف اور مشک فشاں تنہائی 'حواشی' کی نظموں میں کلام کرتی ہے۔ ایک ایسا مرحلہ ذات ہے جو پہاڑوں پر اپنی راکھ لیے جاتا ہے اور پھر اس سے شعلہ روشن ایجاد کرتا ہے۔''

شہرام علی گڑھ تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ان کی ذوق کی بالیدگی میں شام مصر اور شب شیراز کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ممبئی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ جدید فارسی فکشن پر انھوں نے عمدہ کام کیا ہے۔ یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے ابھی ہندوستانی فارن سروس کے ممبر کی حیثیت سے ملک و بیرون ممالک خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

یہ مختصر سا تعارف اس لیے ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس سے شہرام کے تخلیقی رویے اور شعری تجربے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یہ تصوف کی روشنی فارسی کی محبت کا صلہ ہے۔ تجربات و مشاہدات کے تحفے مختلف امصار و دیار سے ملے ہیں اور حواشی کا آخری حصہ دیوانوں کا دشت جنوں ہے جہاں مجاز کا ایک پورٹریٹ ہے۔ مسعود تامی اونٹ کی باگ سنبھالے اسٹریچی حال کی جانب خراماں اور اپنی دیوانگی پے نازاں ہے۔ مجاہد بھائی ایک زندہ مجسمہ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ پاسداران روایت پلکیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی تاریخ وفات پر دو الہامی کتابوں (وید مقدس اور دیوان غالب) کا ذکر کچھ سوچ کر چھیڑا ہے۔ روشنی گل ہونے کا منظر اندھیرے میں نظر آتا ہے۔ شہریار تنہا ہیں اور اس کے چاہنے والے ہوٹل حیات کے ٹی لاؤنج میں، شمشاد پر رات کی ہر بات قہقہوں میں اڑا رہے ہیں۔ 'باز آمد' سرسید کی صدی تقریبات کے موقعے پر کہانی ختم ہوتی ہے کہ جو خواب اس نے دیکھے تھے ہم اس تعبیر کے لائق نہیں نکلے۔

تمام نظموں کے پس منظر میں جو علامتی، استعاراتی اور تلمیحاتی فضا ہے یہ انھیں جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہے۔

حواشی متن کے مبہم، مشکل اور پیچیدہ حصے کی گرہ کشائی کی کلید ہوتی ہے۔ شہرام سرمدی کی یہ 'حواشی' جن متون کی گرہ کشائی کر رہی ہے وہ متون دراصل ان کے ذہن میں 'ی ادداش ت' کی صورت میں بکھرے ہیں نہ کہ کسی مسودے کی شکل میں کہیں ظاہر و موجود ہیں جنھیں ہم چھو سکتے ہیں اور حواشی کے متوازی اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ صفحہ نمبر 126 کی پیشانی پر 'متن' لکھا ہے اور مکمل صفحہ سادہ ہے ممکن ہے یہ اسی جانب بلیغ اشارہ ہو کہ یہ 'حواشی' جن متون کی گرہ کشائی کر رہی ہے وہ کسی صفحہ قرطاس پر موجود نہیں ہے۔ حواشی کی نظموں کا بیانیہ شاعر کے تجربات، واقعات، تاریخ اور تصوف سے تشکیل پائے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی انفرادیت نہیں ہے کیوں کہ بیشتر شعرا کے یہاں یہ رنگ جھلکتا ہے۔ اس بات سے انکار ممکن بھی نہیں، مگر حواشی کی انفرادیت اس کی ہیئت، ڈکشن اور اسلوب سے قائم ہوتی ہے۔ علائم، استعارے اور بطور خاص تلمیحات کو جس ماہرانہ فنکاری سے برتا گیا ہے اس کی مثال عہد حاضر کی نظمیہ شاعری میں ڈھونڈھنے پر ملتی ہے مگر 'حواشی' کی تقریباً تمام نظمیں ان صنائع سے مزین ہیں اور ہر لفظ کے پیچھے معانی کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ الفاظ معانی رکھتے ہیں مگر اس کی شاعرانہ ترتیب اور فنکارانہ استعمال سے اس میں گہرائی اور تہداری پیدا ہوتی ہے۔ پس منظر، پیش منظر یا ماضی، حال اور مستقبل کی تجسیم لفظوں کے الٹ پھیر سے کیسے ممکن ہے شہرام اس فن سے خوب واقف ہیں۔ بطور مثال 'حواشی' سے کئی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن خوف طوالت سے دو تین نظموں پر اکتفا کرتے ہیں۔

صفحہ نمبر 36 پر ایک نظم ہے 'اندر جیت امروز کے لیے' اندر جیت امروز، امریتا اور ساحر کی حقیقی کہانی اہل علم و ادب کے لیے مخفی نہیں ہے مگر شہرام سرمدی نے اس کے جس ان چھوے پہلوؤں کو نظم کا قالب عطا کیا ہے اور جس انداز میں کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آخری مصرعے میں 'امروز و فردا' کا جو خلاقانہ استعمال ہوا ہے اس پر بے ساختہ داد کے الفاظ زبان سے نکلتے ہیں۔

امرتا! / یہ زندگی ایک ضبط ہے / شاید مقدر میں تمھارے کم تھا / یا تم رکھ نہیں پائی گزشتہ شب / اگر امروز کی اس بات پر / کچھ غور کر لیتیں / فقط اس زاویے پر۔ اس طرح اصرار / اک پل کو نظر انداز کر دیتیں تو / فردا آنکھوں میں / پھر کوئی غنچہ مہکتا یا / کوئی گل کھل رہا ہوتا / کہیں امروز بھی فردا سے اپنے مل رہا ہوتا

مجموعے کی تمام نظمیں اپنے اندروہ جہان معانی اور ساحرانہ کیفیت رکھتی ہیں کہ قاری قرات کے بعد بھی نظم کی اس فضا سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ کتاب کی طباعت بھی نفیس اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ 144 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 225 روپے ہے جسے بازگشت بکس، نئی دہلی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بونے دوست

مصنف / شاعر: عبداللہ ندیم

صفحات: 160، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: ڈاکٹر شہزادانجم برہانی، ڈپارٹمنٹ آف اردو،

جگ جیون کالج، نیو پولیس لائن، چندوا آرا، بھوجپور۔ 802312 (بہار)

بونے دوست عبداللہ ندیم کا پہلا اور قابل قدر شعری مجموعہ ہے، بقول شاعر لاک ڈاؤن کے زمانے میں میسر فرصت کے اوقات نے ان کے اندر کے شاعر کو بیدار کیا اور جناب سالم سلیم نے ان میں تخلیقی وفور کے جراثیم داخل کر دیے۔ اس طرح بونے دوست کی اشاعت اتنے ممکن ہو پائی لیکن ہمیں اس اعتراف پر اعتراض ہے کیونکہ بونے دوست میں موجود شاعری، شاعر کے اس قلیل عرصہ مشق سخن کا ثبوت پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے شاعر کی طویل ریاضت، غور و خوض، شاعری کی روایت، کلاسیکی طریق شعر سے واقفیت کا بھی دخل ہے۔

سوشل میڈیا پر عبداللہ ندیم صاحب نے اپنی نثر کے ذریعے متوجہ کیا تھا جس میں مزاح کا خوبصورت اور ادبی اظہار ان کے قدرت کلام کی گواہی دیتا ہے۔ اس مجموعے کو پڑھ کر ان کی شاعرانہ شخصیت کا بھی قائل ہونا پڑا کہ یہ آدمی اپنی علمی و ادبی شخصیت کے حوالے سے نہ صرف عمدہ نثر نگار ہے بلکہ شاعری کے مذاق سے کما حقہ واقف بھی ہے اور اپنے معاصرین میں اپنی انفرادی شناخت کے لیے کامیاب کوشش میں مصروف بھی۔

بونے دوست میں شامل غزلیں اپنے روایتی اور کلاسیکی طریق شعر سے مزین ہیں۔ اظہار کی سطح پر تازہ کاری اور موضوعات کی قلب ماہیت، غور و فکر کا الگ زاویہ، عشق کے مانوس تجربوں میں کہیں کہیں انوکھے انداز بیان نے اس شاعری کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔

اس شاعری کو پڑھ کر جو بات شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عبداللہ ندیم عقل سے زیادہ عشق کو ترجیح دیتے ہیں، حقیقت کے مقابلے خواب کی اہمیت ان کے نزدیک زیادہ ہے، وہ فکر کے فریب سے دور اور جذبے کے قائل ہیں، وہ مستقر سے زیادہ سفر کے خواہشمند ہیں لہذا کسی ایک منزل پر رک جانا ان کی فطرت کا تقاضا نہیں ہے۔ مسرت و شادمانی کے برخلاف ان کے ہاں درد ہی اعتبار کا درجہ رکھتا ہے شاید انھیں یہ راز معلوم ہوگیا ہے کہ

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

عبداللہ ندیم کی وحشت و دیوانگی میں روایتی جنون کی کارفرمائی نہیں ہے اس حوالے سے ان کے ہاں بدلا ہوا پیرایہ اظہار ملتا ہے کہ۔ وحشت میں جیب و دامن کو تار تار کرنے والی روایت کی قلب ماہیت ان کے احساس کے انفرادی اظہار کا حوالہ کہی جاسکتی ہے۔

ہر ایک تار سلامت ہے جیب و دامن کا
گئے ہیں دن میری وحشت کے رائیگاں کتنے

یہ کاروبار جنوں اور کاروبار زمانہ کے اشتراک کا نتیجہ ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ جس وحشت و دیوانگی کے لیے ہمہ وقت زنجیر پا رقص درکار تھا وہ وقت دیگر الجھنوں اور تقاضائے زندگی کی نذر ہوگیا لہذا یہ فکر انھیں وحشت کے دن کی رائیگانی کے احساس سے شرمندہ کر دیتی ہے خوب شعر ہے

ندیم کی شاعری سے ایک بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موجود سے مطمئن نہیں ہوتے یعنی مفروضات کے برخلاف ان کے یہاں منظر سے پس منظر کی طرف لپکنے والی طبیعت اور اضطراب بھی ہے جو ان میں کرید اور جستجو کی پراسراریت کا حوالہ کہی جاسکتی ہے۔

اک حقیقت پسِ آئینہ چھپی رہتی ہے　　خواب کوئی ہو فقط خواب کہاں رہتا ہے
وہ عالم خروش ہے شبنم کی بوند پر　　ڈر ہے نہ چیر دے کہیں دل آفتاب کا
اک آس زندہ رہتی ہے پانی کی دشت میں　　احسان کچھ یہ کم تو نہیں ہے سراب کا

خواب میں حقیقت کا نظارہ اور حقیقت میں واہمے کی صورت گری ہی انھیں وہ بصیرت عطا کرتی ہے جس کے ڈانڈے دانشوری کی کافرانہ حدوں سے مل جاتے ہیں۔ ندیم کی یہی بے اطمینانی انھیں حقائق سے واقف کر کے اعتراف کی طرف لے جاتی ہے جہاں حزن اور اداسی دردانگیز پیرایہ اختیار کر لیتی ہے۔

ہم کو ہر شے پہ حقیقت کا گماں تھا پہلے　　ہائے کس درجہ نگاہوں کا زیاں تھا پہلے

بازگشت بکس نئی دہلی نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ عبداللہ ندیم کے portrait میں معصومیت اور شرارت کا امتزاج اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور کتاب کی خوبصورتی میں اضافہ بھی۔ 96 غزلیں اور 160 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 250 روپے ہے جو اچھی شاعری کے عاشقوں کے لیے بہترین تحفہ کہی جاسکتی ہے۔

روشنی ہے مرے چراغوں میں

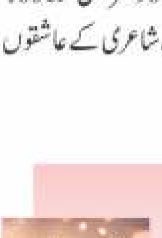

شاعر: یاسین انصاری

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر یوسف صابر، مدیر اعلیٰ سہ ماہی 'عکس ادب'، چھترپتی سمبھاجی نگر، 431008 (مہاراشٹر)

شاعری ایک ایسا فن ہے جس میں حسن، دلکشی اور وقت گزاری کے ساتھ ساتھ

سماج کی نہ صرف عکاسی بلکہ سماج کی اصلاح بھی موجود ہوتی ہے، علامہ اقبال اس کی سب سے عمدہ مثال ہیں۔ اقبال کو ہم اگر آفتاب مان لیں تو دیگر ایسے کئی ستارے ہیں جو آسمان ادب پر ستاروں کی شکل میں روشنی لٹا رہے ہیں، ان ہی میں ایک کا نام یاسین انصاری ہے۔ یاسین انصاری کی تمام شاعری کا مرکز سماج کی اصلاح ہے۔ 'روشنی ہے مرے چراغوں میں' یاسین انصاری کا ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو پڑھنے والوں کے ذہنوں میں مثبت سوچ پیدا کرتا ہے۔ یاسین انصاری سے میرا تعارف کچھ عرصہ پہلے ہوا، موصوف کا منتخب کلام مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے جس کے مطالعے نے مجھے ان کی شاعری پر قلم اٹھانے کے لیے اکسایا۔ یاسین انصاری کے جتنے بھی اشعار میں نے پڑھے سبھی نے مجھے متاثر کیا اور ہاتھوں نے آج قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ ان کے کلام میں پختگی، سنجیدگی، پاکیزگی، سادگی اور صداقت پسندی دریا کے پانی کی طرح پھیلی ہوئی ہے، جو پڑھنے اور سننے والوں کو سیراب کرتی ہے۔ موصوف کا کلام ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو مثبت سوچ رکھتا ہے اور جس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے۔ یاسین انصاری کے شعری مجموعہ 'روشنی ہے مرے چراغوں میں' ایسے کئی اشعار ہیں جو دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ جیسے۔

چار چھوٹے جب اکٹھے ہو گئے — کس قدر لاچار بچے ہو گئے
چراغوں کی نہیں یاسین اب تو — ہواؤں کی حفاظت ہو رہی ہے

سونے سے جو کھرے ہیں نہیں ان کی قدر کچھ
اب کھوٹے بک رہے ہیں بہت اونچے بھاؤ پر

شعری مجموعہ 'روشنی ہے مرے چراغوں میں' کا سرورق بھی جاذب نظر ہے۔ روشنی، چراغ، اجالا، علم، ترقی اور مثبت سوچ کی علامت ہیں۔ یاسین انصاری کی کئی غزلوں میں بھی ان پر اشعار ہیں۔ موصوف نے بڑی عمدگی اور سلیقے سے ان لفظوں کو علامتی طور سے استعمال کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

اجالے ہم نے وراثت میں کوئی پائے ہیں — اندھیرا چیر کے خود روشنی میں آئے ہیں
بجھا نہ پائے گی دنیا کبھی انھیں یاسین — چراغ ہم نے جو الفاظ کے جلائے ہیں

یاسین انصاری کا کلام مبالغہ آرائی سے پاک نظر آتا ہے۔ انھوں نے جب عشق کی بات کی تو اس کے معیار کو بلند رکھا اور جب مادہ پرستی کی جانب اشارہ کیا تو یہ شعر بھی ان کی زنبیل سے نکلا۔

یہ ترقی ہے، پھول سے بچے — کام کرتے ہیں کارخانوں میں

ڈاکٹر طارق قمر صاحب نے اپنے مضمون میں یاسین انصاری کے کلام کے متعلق بڑے عمدہ بیانات درج کیے ہیں، جس میں یہ تحریر بھی شامل ہے:

''یاسین انصاری کی فکر، ان کے احساس اور ان کے ادراک کے حوالے سے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آنے والوں میں ان کے شعری آسمان سے کء آفتاب و ماہتاب طلوع ہو سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کا روشن پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کو اخبارات میں شائع کراتے ہوئے بھی اپنی زبان کو اخباری اور بازاری نہیں ہونے دیا۔''

یاسین انصاری نے زندگی کے مقصد، زندگی کے حقائق اور فلسفہ پر کئی اشعار تخلیق کیے ہیں، جن میں مندرجہ ذیل اشعار بھی شامل ہیں۔

نا امیدی نہ زندگی میں رکھ — حوصلہ یار مفلسی میں رکھ
مسئلے کچھ نہ کچھ تو بنے رہتے ہیں — زندگی میں جھمیلے لگے رہتے ہیں
زندگی کی چائے میں شکر نہیں — مفلسوں کے پاس مال و زر نہیں
داستان درد و غم لکھتا ہوں میں — زندگی کے بیچ و خم لکھتا ہوں میں

یاسین انصاری کا کلام اس وقت ہندوستان کے متعدد معتبر ادبی رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا حال جتنا تابناک ہے اس سے کئی زیادہ روشن یقیناً ان کا مستقبل ہوگا۔ یاسین انصاری کو ابھی طویل سفر طے کرنا ہے۔ ادبی دنیا میں آئے ہوئے انھیں ابھی زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا، مگر ان کی رفتار تیز ہے اور حوصلہ بلند ہے۔ مجھے امید ہے کہ موصوف کے پہلے شعری مجموعہ 'روشنی ہے مرے چراغوں میں' کو حلقہ ادب میں پزیرائی حاصل ہوگی اور موصوف کے کلام پر لکھنے کے لیے دیگر قلمکار بھی اپنے قلم کو جنبش دیں گے۔ میں اپنے قلم کو انھیں کے ایک شعر پر روکتا ہوں۔

دوست ہیں سب اگر تو پھر یاسین — دل میں نشتر چبھو رہا ہے کون

■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

نئی نسل کی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا میری اولین ترجیح: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں کریٹیو رائٹنگ اینڈ چلڈرن لٹریچر پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر جسولہ، نئی دہلی میں 22 مئی 2025 کو کریٹیو رائٹنگ اینڈ چلڈرن لٹریچر پینل کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت معروف فکشن نگار، شاعر اور ماہر درسیات پروفیسر غضنفر نے کی۔ میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، گورننگ کونسل کے ممبران میں جناب محمد شہزاد، جناب ارشد فریدی کے علاوہ این بی ٹی کے چیف ایڈیٹر اور جوائنٹ ڈائرکٹر جناب کمار وکرم، ڈاکٹر امجد حسین حافظ کرناٹکی،

جناب اقبال برکی، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، جناب سراج عظیم، محترمہ شاہ تاج خان، محترمہ شائستہ یوسف، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر، اکیڈمک)، ڈاکٹر عبد الباری (اسسٹنٹ ایڈیٹر)، نہاں رباب (ریسرچ اسسٹنٹ، اکیڈمک) اور محمد افروز (ویب ماسٹر) وغیرہ شامل ہوئے۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ نئی نسل کی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا میری اولین ترجیح ہے۔ اسی لیے میں نے بچوں اور نوجوانوں کو سامنے رکھ کر یہ پینل بنایا ہے تاکہ نئی نسل کو ان کے ذوق کے مطابق علمی مواد فراہم کیا جاسکے۔ کریٹیو رائٹنگ اینڈ چلڈرن لٹریچر پینل کے چیئرمین پروفیسر غضنفر نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ اپنی تخلیقیت کا استعمال کرسکیں۔ تخلیقیت کے فروغ کے لیے ورکشاپ کا اہتمام کیا جائے۔ بچوں کی عمر کے اعتبار سے بیسک ووکیبلری تیار کیا جائے جن کی روشنی میں بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق نصابات تیار کیے جاسکیں۔ این بی ٹی کے چیف ایڈیٹر اور جوائنٹ ڈائرکٹر جناب کمار وکرم نے کہا کہ اردو میں دوسری زبانوں سے بھی مواد ترجمے کی شکل میں لینے کی ضرورت ہے۔ اردو کی کلاسیکی کتابوں کو مختصر ورژن (Abridge Version) میں شائع کیا جائے۔ کمار وکرم نے کونسل کے کاموں کی بھی ستائش کی۔ کرناٹک اردو اکیڈمی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر حافظ کرناٹکی نے کہا ہے کہ قومی اردو کونسل بچوں اور نئی نسل کے لیے بہت عمدہ کام کررہی ہے۔ آج کی اس میٹنگ میں تقریباً 45 دیدہ زیب کتابوں کو منظوری دی گئی جو قومی تعلیمی پالیسی 2020 کو ذہن میں رکھ کر ورکشاپ موڈ میں تیار کی گئی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قومی اردو کونسل کے اراکین کس محنت و جاں فشانی سے کام کررہے ہیں۔ میٹنگ میں شرکا نے ایک سال کی مدت میں تیار کی گئی کتابوں کی اشاعت کی منظوری کے علاوہ سابقہ برسوں میں تیار کی گئی کتابوں کو بھی منظوری دی۔ اس موقعے پر وزارت تعلیم حکومت ہند کے ایپ 'راشٹریہ ای۔ پستکالیہ' سے بھی جڑنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں موجود ممبران نے گذشتہ ایک سال میں کیے گئے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے نئے عزائم اور منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 مئی 2025

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں 'اردو ادب پینل' کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں آج اردو ادب پینل کی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف ناقد و دانشور پروفیسر قدوس جاوید نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام معزز مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ اس نو تشکیل شدہ پینل میں ملک کی نمایندہ ادبی

شخصیات شامل کی گئی ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ آپ کی رہنمائی میں اس پینل کے تحت مفید اور ضروری ادبی موضوعات پر کام ہوگا۔ انھوں نے 2047 تک ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر میں ہندوستانی نالج سسٹم اور کثیر لسانی ثقافت کے کردار کا حوالہ دیتے ہوئے مزید کہا کہ اس کے فروغ واستحکام میں ملک کی دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی مطلوبہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اردو زبان میں مختلف ہندوستانی زبانوں کے معیاری ادب کا ترجمہ شائع کرنا ضروری ہے، جس کے لیے کونسل پر عزم ہے اور ریاستی اردو اکادمیوں کو خط ارسال کر کے متعلقہ ریاست کے نمایندہ ادب کی نشان دہی کی درخواست کی جائے گی تاکہ اسے اردو قارئین تک بھی پہنچایا جاسکے اور تمام ہندوستانی زبانوں کے مابین ہم آہنگی کو مضبوط کیا جاسکے۔ میٹنگ کے چیئرمین پروفیسر قدوس جاوید نے معیاری ادب کی اشاعت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو میں عربی، فارسی، سنسکرت کی بنیادی تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے تراجم بھی شائع ہونے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ روایتی انداز کے غیر مفید موضوعات کے بجائے موجودہ دور میں کارآمد موضوعات پر تصنیف، تحقیق اور ترجمے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سینئر ادیب و دانشور جناب جانکی پرساد شرما نے کہا کہ ہندی ریاستوں کے لوک گیتوں کو اردو میں منتقل کرکے ان کا انتخاب شائع کرنا بھی ایک اہم کام ہوگا۔ اس موقعے پر یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اردو زبان میں اردو کی اہم ادبی شخصیات کے مونوگراف کے علاوہ ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی اہم ادبی شخصیات کے بھی مونوگراف اور ان کی نمایندہ تحریروں کے انتخابات تیار کروائے جائیں تاکہ اردو والے بھی ان سے آشنا ہوسکیں۔ اسی طرح اس میٹنگ میں ہمعصر ٹکنالوجی جیسے آرٹیفیشیل انٹیلی جنس وغیرہ پر اردو مواد کی تیاری کے ساتھ ماحولیات اور قدرتی ذخائر کے تحفظ وغیرہ پر بھی اردو کتابوں کی تیاری واشاعت پر زور دیا گیا۔

میٹنگ کے دوران اردو ادب پینل کی گزشتہ میٹنگ (منعقدہ 4 اگست 2022) کی روداد کی تصدیق کے ساتھ اس کے تحت چل رہے مختلف اشاعتی پروجیکٹس کی صورتحال کا جائزہ لیا گیا اور متعدد کتابوں کی اشاعت پر اطمینان کا اظہار کیا گیا، جبکہ نئے موصول ہونے والے پروپوزلس پر بھی غور کرکے ان کے تعلق سے فیصلہ لیا گیا۔ پینل کے ممبران نے اس پر زور دیا کہ آج کے دور کے اشاعتی طریقۂ کار کو دیکھتے ہوئے ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کی کثیر تعداد میں اشاعت کی بجائے 'پرنٹ آن ڈیمانڈ' کے اصول پر عمل کیا جائے، ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ضخیم کتابوں کے انتخابات شائع کیے جائیں اور اصل ورژن پی ڈی ایف یا ای پب فارمیٹ میں کونسل کی ویب سائٹ یا ای- کتاب ایپ پر آن لائن فراہم کروا دیا جائے تاکہ جنھیں ضرورت ہو وہ اس سے استفادہ کرلیں۔

میٹنگ میں شامل پینل کے دیگر ممبران میں پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر شبنم حمید، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر آفتاب عالم آفاقی، پروفیسر مشتاق عالم قادری (آن لائن)، ڈاکٹر نعیم انیس، ڈاکٹر درانی شبانہ قابل ذکر ہیں، جبکہ ڈاکٹر خاور نقیب کسی ناگزیر وجہ کی بنا پر شریک نہ ہوسکے۔ ان کے علاوہ این سی پی یو ایل کی گورننگ کونسل کے ممبران ڈاکٹر سید مشیر عالم (آن لائن) اور ڈاکٹر شمشیر سنگھ نے بطور مدعوئین خصوصی شرکت کی۔ کونسل سے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر عبدالباری (اسسٹنٹ ایڈیٹر) نایاب حسن، نہاں، نصرت جہاں (ریسرچ اسسٹنٹ) اور محمد افروز (ویب ماسٹر) وغیرہ میٹنگ میں موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 جون 2025

چنار بک فیسٹول کے تعلق سے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اردو پبلشرز کے ساتھ میٹنگ

شرکا میں ڈاکٹر شمس اقبال (ڈائریکٹر قومی اردو کونسل)، جناب مینک سرولیا (این بی ٹی)، جناب اشوک دھنکر (ایونٹ منیجر، این بی ٹی)، جناب اے رحمٰن (عالمی اردو ٹرسٹ)، ڈاکٹر ادریس احمد (ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ)، ڈاکٹر نصرت مہدی (ڈائرکٹر مدھیہ پردیش اردو اکادمی)، جناب محمد اصغر (خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)، ڈاکٹر پشکر مشرا (ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور)، جناب محمد ساجد (انجمن ترقی اردو، ہند)، جناب عزیر حسن (اردو اکیڈمی، دہلی)، ڈاکٹر معاذ الدین خان (کرناٹک اردو اکادمی بنگلور)، جناب کوثر معبودی (معبودی پبلی کیشنز)، جناب محمد افضل لون (ملت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز)، جناب راشد خان (ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی)، محترمہ انجم عامر خان (نامک پبلی کیشنز، دہلی)، جناب شیخ معید (شیخ محمد عثمان اینڈ سنس)، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (خسرو فاؤنڈیشن)، اقبال عثمانی (قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز)، شیخ جاوید احمد (سٹی بک سینٹر)، جناب عمر جہانگیر (دارالسلام)، دارالہدیٰ پبلی کیشنز، جناب عادل (بک ریڈرس کلب)، جناب اظہار احمد (عرشیہ پبلی کیشنز)، جناب محمد شعیب (عذرا بک ٹریڈر)، جناب محمد شاہد تیمی (علم اسٹور ڈاٹ ان)، جناب نادر مرزا (ریختہ پبلی کیشنز) کے علاوہ قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسرز جناب انتخاب احمد، ڈاکٹر کلیم اللہ، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر امتیاز احمد وغیرہ موجود رہے۔

قومی اردو کونسل میں مذہب وثقافت پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں آج 'مذہب وثقافت پینل' کی میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پدم شری پروفیسر عین الحسن نے کی اور ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی اہم علمی وثقافتی شخصیات نے اس میٹنگ میں شرکت کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے تمام مہمانوں کا

استقبال کیا۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو اپنے مذہبی تنوع اور ثقافتی تکثیریت کے اعتبار سے دنیا کے نقشے پر ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اس لیے ایک قومی اشاعتی ادارے کے طور پر قومی اردو کونسل ایسے مواد کی تیاری واشاعت کے لیے پابند عہد ہے جو ملک میں قومی آہنگی کے فروغ واستحکام میں اپنا رول ادا کرے، اسی مقصد سے مذہب وثقافت کا ایک خاص پینل بنایا گیا ہے، جس کے زیر اہتمام اب تک ہندوستانی مذاہب اور کلچر سے متعلق بہت سی اہم کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس نو تشکیل شدہ پینل میں ایسی اہم شخصیات شامل ہیں جو ملکی سطح پر اپنی شناخت رکھتی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں کونسل مزید بہتر کام کر سکتی ہے۔ پروفیسر عین الحسن نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کے دور میں اگر ہم اپنی قومی ثقافتی شناخت و امتیاز کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہوگی اور اس مقصد سے ہمیں مختلف ہندوستانی مذاہب اور ثقافتوں سے متعارف کروانے والا لٹریچر تیار کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل اس حوالے سے عرصۂ دراز سے کام کر رہی ہے اور ڈاکٹر شمس اقبال کی متحرک سربراہی میں اس کی سرگرمیوں میں مزید سرعت ووسعت آئی ہے، لہذا ہم بجا طور پر امید کرتے ہیں کہ کونسل ہندوستان کے تہذیبی وثقافتی ورثے کے تحفظ اور اردو زبان میں اس کی اشاعت کے سلسلے میں مزید پختگی کے ساتھ آگے بڑھے گی۔ انھوں نے اس کام کے لیے ادارہ جاتی اشتراک پر زور دیتے ہوئے کام کرنے والے باصلاحیت افراد کی تلاش، اسی طرح اہل علم خواتین کی حصے داری پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی فلسفے میں غیر معمولی گیرائی ہے، جس کا انکشاف کرنے کے ساتھ دنیا کو اس سے آشنا کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

رضا لائبریری رامپور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے کہا کہ اردو کی ادبی وشعری اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر اس کے دائرے کو بڑھا کر اسے فکر و فلسفے اور معاشرتی حقائق کے شفاف اظہار کی زبان بنانے پر بھی توجہ دینا چاہیے۔ انھوں نے قومی ثقافتی ورثے کو مضبوط کرنے کے حوالے سے ہندوستان کے 'صوفی ٹھاٹ' پر کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اس حوالے سے کونسل کی جانب سے اگر کوئی پروجیکٹ تیار کیا جاتا ہے تو رامپور رضا لائبریری کونسل کے ساتھ اشتراک کے لیے تیار ہے۔ پروفیسر اقتدار محمد خاں (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ اسلامیات کے موضوع پر غیر مسلم اہل علم کی خدمات اسی طرح دیگر مذاہب کے مطالعے میں مسلم اسکالرز کی کدوکاوش پر بھی تحقیقی واشاعتی کام ہونا چاہیے۔ پروفیسر زینت شوکت علی نے کہا کہ ہندوستانی فلسفے، تصوف یا قومی ثقافت کے موضوع پر ایسی کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے، جو عام لوگوں کے لیے قابل فہم ہوں، تبھی ہم اپنے مقصد کو پا سکتے ہیں۔ پروفیسر شاہ حسین احمد (پٹنہ) نے کہا کہ مذہبی ہم آہنگی، ثقافتی تنوع اور تصوف و صوفیا پر کتابوں کی اشاعت کے ساتھ کونسل کے پلیٹ فارم سے ملک کے مختلف شہروں اور صوبوں میں سمینار اور سمپوزیم کا بھی انعقاد کیا جانا چاہیے تاکہ ان موضوعات پر مطالعے کا ایک عمومی رجحان پیدا ہو سکے۔ ڈاکٹر مبین زہرا (دہلی یونیورسٹی) نے ثقافتی موضوعات خصوصاً تصوف کے حوالے سے خواتین کی علمی وعملی سرگرمیوں پر تحقیق وتالیف پر توجہ دینے کی بات کہی۔ ڈاکٹر وارث مظہری (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی) نے بھی ہندوستانی مذاہب پر تعارفی لٹریچر کی تیاری اور ہندوستان کے مذہبی تنوع کے خصوصی مطالعے پر زور دیا۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (کنوینر خسرو فاؤنڈیشن، دہلی) نے ہندوستانی ثقافت اور تصوف پر لکھی گئی قدیم اور اہم کتابوں کے ترجمے اور ان کی اشاعت کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔

میٹنگ کے دوران ممبران نے اس پینل کے تحت جاری اور مکمل شدہ مختلف پروجیکٹس کی صورتحال کا جائزہ لیا اور ان کے تعلق سے اہم فیصلے لیے گئے۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال و دیگر شرکا نے باوقار شہری اعزاز 'پدم شری' سے نوازے جانے پر پروفیسر عین الحسن کا گلدستہ وشال پیش کر کے خصوصی استقبال کیا۔ آخر میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) کے اظہار تشکر کے ساتھ میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر عبدالباری (اسسٹنٹ ایڈیٹر)، نایاب حسن (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر صائمہ ثمرین (پروجیکٹ اسسٹنٹ) وغیرہ بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 جون 2025

قومی اردو کونسل میں ماس میڈیا پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج ماس میڈیا پینل کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن

ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر شافع قدوائی نے کی۔ اس میٹنگ میں ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ میٹنگ کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور اس پینل کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ ہر زمانے میں جب نئے چیلنجز اور مسائل آتے ہیں تو راستے بھی نکلتے ہیں۔ آپ حضرات میڈیا کے اہم ستون ہیں۔ آج میڈیا کے مسائل اور چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ایسے مفید مشورے دیں جن کو بروئے کار لاکر اردو میڈیا کے مسائل اور امکانات کے حوالے سے مثبت اور معنی خیز گفتگو کی جاسکے۔ پروفیسر ایم شافع قدوائی نے ماس میڈیا پینل کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ پینل ورکنگ جرنلسٹ کے لیے بہت اہم ہے۔ بنیادی مسائل سے عدم واقفیت کی بنا پر بسا اوقات بہت سی فاش غلطیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آج اردو میڈیا سے وابستہ افراد کو زبان و بیان اور صحافتی اصول وضوابط سے واقف کرانا بہت ضروری ہے۔ اس پینل کے ذریعے ماضی میں بھی قومی اردو کونسل نے اہم ورکشاپ کرائے جن کے مفید اور مثبت نتائج سامنے آئے۔ اس طرح کے ورکشاپ کی مزید ضرورت ہے۔ ڈاکٹر قاسم خورشید (سابق صدر ایس سی آر ٹی بہار) نے کہا کہ منظرنامہ بدل چکا ہے، بدلتے منظرنامے کے مطابق ہی منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر دانش اقبال (انور جمال قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ آج کے دور میں میڈیا کے جو اہم مسائل ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے۔ جناب محمد سلیم عارف نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تلفظ اس وقت کا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے لیے ہمیں تھیٹر ورکشاپ اور اسپیکنگ ڈکشنری کی سخت ضرورت ہے۔ پروفیسر سیدہ افسانہ (میڈیا ایجوکیشن ریسرچ سینٹر، کشمیر یونیورسٹی) نے کہا کہ اردو زبان کو پاپولر بنانے کے لیے اسٹوری ٹیلنگ کا نیشنل پروگرام کیا جائے تو اس سے نوجوانوں کو رہنمائی اور روشنی ملے گی۔

ان حضرات کے علاوہ پروفیسر وریندر کمار بھارتی (صدر ڈپارٹمنٹ آف پبلی کیشنز اینڈ ایڈیٹر کمیونی کیٹر جنرل، آئی آئی ایم سی، نئی دہلی)، پروفیسر احتشام احمد خان (اسکول آف ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد)، ڈاکٹر شہباز حسیبی (پی آئی بی)، جناب محمد عبدالستار (وائس پریسیڈنٹ فار دکن اردو ایڈیٹرس کانفرنس، حیدرآباد) وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ میٹنگ کے دوران اس پینل کے تحت مختلف ایجنڈوں پر غور وخوض کیا گیا۔ ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) کے اظہار تشکر پر میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 جون 2025

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج یونانی میڈیسن پینل کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت محمد خالد صدیقی (سابق ڈائرکٹر جنرل سی سی آر یو ایم) نے کی۔ اس میٹنگ میں ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر شمس اقبال کے

علاوہ پروفیسر اشہر قدیر (شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ)، ڈاکٹر محمد ذوالکفل (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن)، پروفیسر آسیہ سلطانہ (صدر شعبہ علاج بالتدبیر، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ)، حکیم وسیم احمد اعظمی (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ)، ڈاکٹر وسیم احمد (شعبۂ کلیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور)، ڈاکٹر امان اللہ (ریسرچ آفیسر، سائنٹسٹ، سی سی آر یو ایم، منسٹری آف آیوش نئی دہلی)، ڈاکٹر اشفاق احمد (حیدرآباد)، حکیم نازش احتشام اعظمی (میڈیکل آفیسر انچارج نئی دہلی)، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک، قومی اردو کونسل، نئی دہلی)، محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) اور ڈاکٹر عبدالباری (اسسٹنٹ ایڈیٹر، این سی پی یو ایل) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یونانی میڈیسن پینل بہت اہم پینل ہے۔ اس پینل کے تحت بہت سی اہم طبی کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ اس پینل کی کتابیں حوالے کے طور پر طلبا کے نصاب میں شامل ہیں۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ آپ حضرات کے تعاون سے اس پر زیادہ سے زیادہ کام ہو اور گذشتہ برسوں میں اس پینل سے متعدد اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی ماہرین سے دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق کتابیں لکھوائی جائیں جو اطبا اور طب یونانی کے طلبا کے لیے مفید و معاون ہوں۔

اس پینل کے صدر ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے صدارتی کلمات میں کونسل کے کاموں کی ستائش کی اور کہا کہ طب یونانی کے کلاسیکی مواد کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ مواد تیار کرتے وقت طلبا کی ضرورتوں اور ان کی ذہنی ساخت کا بھی خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔ میٹنگ کے دوران اس پینل کے تحت مختلف ایجنڈوں پر غور وخوض کیا گیا اور کئی اہم فیصلے لیے گئے۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) کے اظہار تشکر پر میٹنگ کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جون 2025

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دہلی

کتنا بدل چکا ہے ادب

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی اور راشٹرپتی بھون ثقافتی مرکز کے اشتراک سے منعقد دو روزہ ادبی سمینار 'کتنا بدل چکا ہے ادب؟' کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند دروپدی مرمو نے راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی 140 کروڑ آبادی میں بے شمار زبانیں اور بولیاں رائج ہیں اور ان کی ادبی روایتیں بھی اتنی ہی متنوع ہیں۔ لیکن اس تمام تنوع میں ایک مشترک 'ہندوستانیت' کی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تمام زبانوں کے ادب کو اپنا ادب مانتی ہیں۔ انھوں نے گوپ بندھو داس، رابندرناتھ ٹیگور، فقیر احسن سیناپتی، گنگادھر مہر اور پرتھا رائے جیسے ادیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آج کا ادب محض نصیحت دینے والا نہیں ہوسکتا، بلکہ ادب انسان کو خواب دیکھنے اور انھیں پورا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر برائے ثقافت و سیاحت گجیندر سنگھ شیخاوت نے کہا کہ ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے، جو نہ صرف مشاہدہ کرتا ہے بلکہ رہنمائی بھی کرتا ہے۔ ثقافت کی وزارت کی خصوصی سکریٹری، رنجنا چوپڑا نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی، وزارت ثقافت کے تحت کام کرنے والا ایک مؤثر ادارہ ہے، جس نے حالیہ برسوں میں اپنی سرگرمیوں سے سب کا دھیان کھینچا ہے۔ یہ ادبی سمینار اسی فعال طرزِ عمل کا ایک اہم مظہر ہے۔ بعد ازاں 'سید حادل سے: مشاعرہ' کے عنوان سے ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت معروف اردو شاعر شین کاف نظام نے کی جب کہ ساہتیہ اکادمی کے صدر مہمان خصوصی رہے۔ اس مشاعرے میں ملک کی مختلف زبانوں کے ممتاز شعرا نے شرکت کی، جن میں رنجیت داس (بنگالی)، ممنگ دیئی (انگریزی)، دلیپ جھاویری (گجراتی)، ارون کمل (ہندی)، مہیش گرگ (ہندی)، شفی شوق (کشمیری)، دمینتی بیشرا (سنتھالی) اور روی سبرامنیم (تمل) شامل تھے۔ مشاعرے کی نظامت اے کا سنہانے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2025

شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر

نئی دہلی: مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات (جے این یو) میں ہر سال کی طرح اس سال بھی شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر کے گیارہویں سیشن کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس میموریل لکچر کا انعقاد ہر سال برصغیر کے عظیم مصلح، مفسر، محدث اور مفکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی، فکری اور اصلاحی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس روایت کا مقصد یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے افکار کو نئی نسل تک پہنچایا جائے اور ان کی فکر کو عصر حاضر کے تناظر میں زندہ و متحرک رکھا جائے۔ پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے 'اسلامی علوم اور جدید تعلیم کا امتزاج: عصر حاضر کے عالمی چیلنجز کا فکری حل' پر جامع خطاب کیا۔ اس موقعے پر جے این یو کے طلبہ، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ پروفیسر فاروقی نے کہا کہ آج کا زمانہ محض ٹیکنالوجی کا نہیں بلکہ تہذیبی اور فکری کشمکش کا بھی ہے۔ نوآبادیاتی دور کے بعد عالمیت نے ایک نیا چہرہ اختیار کرلیا ہے جو اب فکری اور تہذیبی بالادستی کی صورت میں دنیا پر چھا رہا ہے۔ انھوں نے اسلامی مدارس کے تعلیمی ڈھانچے کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ ادارے صدیوں سے دینی علوم کی حفاظت و ترویج میں مصروفِ عمل رہے ہیں، لیکن عصرِ حاضر میں ان کے سامنے نئے چیلنجز نے سر اٹھایا ہے۔ انھوں نے مدارس اور یونیورسٹیوں کے درمیان علمی اشتراک، نصابی ہم آہنگی اور مشترکہ تحقیقی منصوبوں کی ضرورت پر زور دیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر زرنگار نے کی جب کہ پروفیسر مجیب الرحمٰن نے خطبے پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ پروگرام کا اختتام پروفیسر رضوان الرحمٰن کے کلمات تشکر پر ہوا، جنھوں نے مقرر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حاضرین کی علمی دلچسپی اور بھرپور شرکت کو سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2025

نکڑ ناٹک فیسٹول

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ذیلی شاخ 'ہم سب ڈرامہ گروپ' اردو ڈرامے کے فروغ کے لیے مختلف ثقافتی پروگرام کا انعقاد کرتی ہے۔ 29 اپریل کو ایوان غالب میں نکڑ ناٹک فیسٹیول کا انعقاد ہوا جس میں ماتا سندری کالج فار ویمن کے ڈرامہ گروپ 'پرندے' نے 'اپرادھ کا جنم' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈرامہ گروپ 'ڈرامہ کلب' نے 'خاموشی'، دیش بندھو کالج (ڈی یو) کے 'دیش بندھو ڈرامیٹک سوسائٹی' نے 'اَن دیکھی اَن سُنی' اور رام لال آنند کالج (ڈی یو) کے گروپ 'حسرتیں' نے 'میں نہ سہتا' نکڑ ناٹک پیش کیے۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذیلی شاخ 'ہم سب ڈرامہ

گروپ' اردو میں ڈرامے کے فروغ کے لیے مسلسل سرگرم ہے اور اس سلسلے میں ڈرامہ فیسٹیول اور اسٹریٹ تھیٹر فیسٹیول بطور خاص قابل ذکر ہے۔ میں اس فیسٹیول میں شریک ہونے والے تمام فنکاروں اور ان کے سرپرستوں کا خیر مقدم کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ انھی فنکاروں میں ایسے فنکار بھی ابھریں گے جو آئندہ اس میدان میں ملک کا نام روشن کریں گے۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ نکڑ ناٹک کئی اعتبار سے اہم اور مشکل ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ناظرین آپ تک نہیں آتے آپ کو ان تک پہنچنا ہوتا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر پروفیسر محمد کاظم نے شرکت کرنے والی تمام ٹیموں کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے مومنٹو پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اپریل 2025

علم بیان، علامت اور پیکر

نئی دہلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، اسکول آف لینگویجز، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی اور القلم فاؤنڈیشن، نئی دہلی کے زیر اہتمام خصوصی لیکچر بہ عنوان 'علم بیان، علامت اور پیکر' کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کے لیے پروفیسر مظفر علی شہ میری، سابق وائس چانسلر، عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول، آندھرا پردیش کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ان کا خاص میدان ہے۔ علم بیان پر آج انھوں نے تفصیلی گفتگو کی، جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کو نہایت ہی خوش اسلوبی اور سلیس انداز میں مثالوں کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ تمام نقطے واضح ہوگئے۔ اس خصوصی لیکچر کی صدارت پروفیسر اخلاق احمد آہن، چیئر پرسن، سی پی سی اے ایس، اسکول آف لینگویجز نے فرمائی۔ اس خصوصی لیکچر کے خیر مقدمی کلمات اور اغراض و مقاصد پر پرویز احمد اعظمی نے تفصیلی گفتگو کی اور خصوصی لکچر کے انعقاد کے مقاصد بیان فرمائے۔ اس پروگرام میں اسکول آف لینگویجز کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور ایم اے کے طالب علموں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ نظامت کے فرائض فیصل ہاشمی نے انجام دیے، جب کہ ایم اے کی طالبہ طوبیٰ الماس نے شکریے کی تحریک پیش کی۔ پروگرام کے اختتام پر طلبہ نے موضوع سے متعلق سوالات کیے، جن کا پروفیسر موصوف نے تشفی بخش جواب دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اپریل 2025

جدید ترقی پسندی

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک خصوصی لیکچر بعنوان 'جدید ترقی پسندی' کا انعقاد کیا گیا، جس میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کلیدی خطاب

کیا۔ اس پروگرام کا مقصد طلبہ کو نصابی حدود سے باہر نکال کر ادب کے وسیع تر تناظر سے روشناس کرانا تھا۔ پروگرام کا آغاز صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابوبکر عباد کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ ادب کسی مخصوص تحریک یا منشور کے تحت تخلیق نہیں کیا جاتا، لیکن ادیب کے شعور کے کسی گوشے میں کوئی رجحان یا نظریہ ضرور کارفرما ہوتا ہے جو اس کی تخلیقات میں جھلکتا ہے۔ پروگرام کے کلیدی مقرر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے 'جدید ترقی پسندی' کے عنوان سے ایک پرمغز خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا ہر دور اپنی فکری و تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ آج ہم ایک نئے فکری دور میں داخل ہو چکے ہیں، جسے میں جدید ترقی پسندی کا نام دیتا ہوں۔ انھوں نے واضح کیا کہ یہ محض ایک اصطلاح نہیں بلکہ معاصر ادب میں موجود رجحانات کی نئی تعبیر ہے۔ لیکچر کے اختتام پر سوال و جواب کی نشست منعقد کی گئی جس میں طلبہ و طالبات نے اپنے سوالات کے تسلی بخش جوابات حاصل کیے۔ پروگرام کے دوران چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ سے شائع ہونے والے معروف ادبی رسالے 'ہماری آواز' کے 'عارف نقوی نمبر' کا باقاعدہ اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مئی 2025

فراق گورکھپوری کی شخصیت اور فن: ایک جائزہ

نئی دہلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دیار میر کے میر انیس ہال میں 'فراق گورکھپوری کی شخصیت اور فن: ایک جائزہ' کے زیر عنوان توسیعی خطبے کا انعقاد

6 مئی کو کیا گیا۔ یہ خطبہ کینیڈا میں مقیم ممتاز اردو محقق اور نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پیش کیا۔ انھوں نے دلکش اسلوب میں فراق گورکھپوری کے سوانحی کوائف، دلچسپ شخصیت، ذہنی کشمکش اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری کے چند اچھوتے اور نئے ابعاد و جہات کو روشن کیا۔ مہمان خطیب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فراق نے ہندوستان کی مٹی سے استعارے کی فصل اگائی۔ فراق کی شاعری صحیح معنوں میں سنسکرت اور ہندی کی جمالیات کا اعلیٰ ترین اردو روپ ہے، فراق نے ڈکشن، طرز ادا، فکر و خیال اور استعارات و علامات کی سطح پر اردو شاعری کو اجنبی اور نادر جہتوں سے آشنا کیا۔ صدارتی خطبے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ فراق گورکھپوری ہمارے شعبے میں بطور خصوصی مطالعہ نصاب میں شامل ہے، فراق کی شاعری مسرت سے بصیرت تک کا سفر طے کرتی ہے۔ اپنے ہندوستانی جڑوں اور طرز تخلیق کے سبب فراق تلسی داس اور رسکھان سے متاثر تھے۔ فراق گورکھپوری کی شاعری کے ساتھ ان کی زندگی اور شخصیت بھی نہایت مقناطیسی اور پرکشش تھی۔ وہ گفتگو کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

خطبے کے کنوینر ڈاکٹر سید تنویر حسین نے مہمان خطیب کا استقبال کرتے ہوئے ان کا مفصل تعارف پیش کیا، انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعلق ہندوستان کے تین زرخیز ادبی مراکز امروہہ، دہلی اور حیدرآباد سے رہا ہے، حالانکہ وہ پیشے کے اعتبار سے فیزیشین ہیں لیکن اردو سے ان کا تعلق عشق و جنون کی حد تک ہے. وہ وطن عزیز سے بہت دور دیار غیر کے ایک اردو سے بیگانہ خطہ کینیڈا میں مقیم ہونے کے باوجود تحقیق و تنقید کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دیں اور اب تک ان کی 70 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خطبے کا اختتام ڈاکٹر مشیر احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔

پریس ریلیز: نوشاد منظر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، 6 جون 2025

قصہ و قلم: بولتی قلم

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے زیرِ اہتمام 'قصہ و قلم: بولتی قلم' کے عنوان سے بچوں کے لیے تخلیقی تحریر کی ہر

سال منعقد ہونے والی پانچ روزہ ورکشاپ گزشتہ روز کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ یہ ورکشاپ ہندی و انگریزی زبان میں تخلیقی اظہار اور تحریری فنون پر مرکوز تھا جس کا آغاز اکادمی نے 2017 میں کیا تھا۔ ورکشاپ کا یہ چھٹا ایڈیشن 26 سے 30 مئی 2025 تک (پیر تا جمعہ) روزانہ صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک منعقد ہوا، جس میں دس سے اٹھارہ برس کے 43 بچوں نے شرکت کی۔

ہر روز، بچوں کو تحریری اسالیب کے مختلف رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا گیا۔ دلچسپ مشقوں اور انفرادی سرگرمیوں کے ذریعے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز دی گئی۔ بچوں نے نہ صرف افسانہ نویسی کے فنی رموز سیکھے بلکہ بصری و لفظی اشاروں کے ذریعے کہانیوں کو زندگی عطا کرنے کا ہنر بھی سیکھا۔ اس ورکشاپ نے بچوں کو ایک ایسی فضا مہیا کرائی جہاں ہر شرکت کنندہ کو اپنی تحریر پر غور و خوض، تنقیدی جائزہ اور خود تدوین کا سلیقہ سیکھنے کا موقع ملا۔ ساتھیوں اور اساتذہ کی آرا نے اس عمل کو اور بھی پختگی بخشی۔ آخری دن بچوں نے وہ کہانیاں سامعین کے روبرو پیش کیں، جو انھوں نے پانچ دنوں کی محنت اور تخلیقی ارتکاز سے خود تخلیق کی تھیں۔

قصہ و قلم کا یہ چھٹا ایڈیشن 'سبز، نیلا و دیگر رنگوں کے بارے میں: ہمارے معدوم ہوتے سیارے کے بارے میں تخلیق' کے عنوان کے تحت منعقد کیا گیا تھا۔ ممتاز ادیبہ چندنا دتہ اور وندنا بشٹ نے ماہرین کی حیثیت سے شرکت کی اور بچوں کو لکھنے کی ترغیب دی۔ ورکشاپ کے دوران ادبِ اطفال کی معروف مصنفہ اور ماحولیات کی مؤرخ میگھا گپتا کو بچوں کے ساتھ گفت و شنید کے لیے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا جنھوں نے اپنے خیالات اور تجربات بچوں سے شیئر کیے۔ ورکشاپ کے آخری دن بچوں کے والدین اور سرپرستوں نے بھی شرکت کی۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے. سرینواس راؤ نے ہر بچے کو شرکت کا سرٹیفکیٹ دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 2 جون 2025

فارسی زبان کے زوال اور اس کے تدارک کے حوالے سے ورکشاپ

نئی دهلی: فارسی زبان کے زوال اور اس کے تدارک کے حوالے سے ایک اہم ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسرز، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور سول سوسائٹی کے نمائندوں نے شرکت کی۔ پروگرام میں فارسی زبان کے ماضی، حال اور مستقبل پر سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ اس موقعے پر انجمن محبان فارسی کا باقاعدہ افتتاح عمل میں آیا۔ یہ انجمن فارسی زبان اور اس کے ادبی ورثے کے فروغ و احیا کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اس بامقصد اور علم پرور اقدام کی سرپرست بنیادی بیگم ایجوکیشن اینڈ امپاورمنٹ فاؤنڈیشن ہے، جو تعلیم و ثقافت کے فروغ کے لیے وقف ایک معروف فلاحی ادارہ ہے۔ تقریب کے مہمان خصوصی شمیم الدین ریٹائرڈ (اسسٹنٹ کمشنر کسٹم) نے اپنے خطاب میں کہا کہ فارسی صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیبی ورثہ ہے، یہ ہماری علمی، فکری اور روحانی روایات کا امین ہے۔ اس زبان کے احیا سے ہم اپنے ماضی سے جڑتے ہیں اور ایک روشن مستقبل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ بنیادی بیگم فاؤنڈیشن کی چیئرپرسن طاہر نور نے اس موقعے پر کہا کہ ہماری فاؤنڈیشن کا مقصد تعلیم کے ذریعے شعور و آگہی پیدا کرنا ہے۔ فارسی زبان کی ترویج نہ صرف ہماری تہذیبی شناخت کی حفاظت ہے بلکہ نوجوان نسل کو ایک علمی و ادبی خزانے سے روشناس کرانا بھی ہے۔ پروفیسر علیم اشرف خان، ڈاکٹر سلیم ملک جاوید، ڈاکٹر جمشید خان، پروفیسر جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر سائرہ مسعود، ہاجرہ سلیم، سعدیہ نے فارسی ادب، تصوف اور تعلیم میں اس کے کردار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ تقریب کے اختتام پر ایک ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا جس میں نایاب فارسی مخطوطات کی نمائش شامل تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جون 2025

پروفیسر نجمہ رحمانی کی یاد میں پروگرام کا انعقاد

نئی دهلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کی جانب سے خواجہ احمد فاروقی ہال میں سابق استاذ و صدر پروفیسر نجمہ رحمانی کی یاد میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر تسلیم رحمانی نے کہا کہ نجمہ رحمانی کا نام نہ کبھی شعبے سے نہ ادب سے ختم ہوسکتا ہے۔ نجمہ کی پوری زندگی جدوجہد کا استعارہ ہے۔ جرمن رومن اور اسپینش اسٹڈیز کی صدر پروفیسر وجیاونکٹ رمن نے کہا کہ نجمہ رحمانی کی طرح بے لاگ بے باک میں نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ ڈاکٹر نورین علی حق نے پروفیسر نجمہ رحمانی عدل و انصاف کے حصول کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتی رہتی تھیں، خواجہ احمد فاروقی ہال کی توسیع ان کی جدوجہد کی آخری نشانی ہے۔ ڈاکٹر نورالاسلام، اسسٹنٹ پروفیسر، الہ آباد نے پروفیسر نجمہ رحمانی سماجی کاز کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ ڈاکٹر امتیاز احمد نے کہا کہ پروفیسر نجمہ رحمانی طلبا و طالبات کے لیے انتہائی شفیق اور مہربان تھیں، وہ طلبا و طالبات کی رہنمائی صرف تعلیمی معاملے میں ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ اقتصادی طور پر بھی عملاً سامنے آتی تھیں۔ شعبہ کے ریسرچ اسکالر ذیشان حیدر نے کہا کہ وہ ہمیشہ طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں، مجھے ان سے استفادے کا بھرپور موقع ملتا رہا ہے۔ ریسرچ اسکالر امام الدین امام نے کہا کہ پروفیسر نجمہ میرے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی تھیں، طلبا و طالبات کی خفتہ صلاحیتوں کے اظہار کی راہیں ہموار کرتی تھیں۔ ریسرچ اسکالر محمد رضوان نے کہا کہ ان کے ساتھ مجھے ایم فل کرنے کا موقع ملا۔ ریسرچ کا کام اچھا اور بہتر

ہو اس کے لیے ہمیشہ نصیحت کرتی تھیں۔ پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر فرحت کمال نے حاضرین و سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر نجمہ رحمانی کی شفقتوں کو یاد کیا اور کہا کہ ان کا رویہ ہم طلبا و طالبات کے ساتھ ماں کی طرح تھا۔ نظامت اشرف یاسین نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جون 2025

اتر پردیش

انجمن ترقی اردو ہند کی ادبی خدمات

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام 'ادب نما' سیریز کے تحت 'انجمن ترقی اردو ہند کی ادبی خدمات' کے موضوع پر آن لائن پروگرام کا کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو ہند کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ انجمن ترقی اردو ہند ایک قوم پرست ادارہ ہے، جس نے تحریک آزادی سے لے کر آج تک اردو زبان و ادب کی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم، جب کہ نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ انجمن ترقی اردو ہند وہ واحد ادارہ ہے جو آزادی سے پہلے قائم ہوا اور اس نے اردو کی بقا کے لیے منفرد انداز میں کام کیے۔ مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے جاوید رحمانی نے کہا کہ انجمن کے یوٹیوب چینل کو دنیا بھر میں دیکھا جارہا ہے اور لاکھوں افراد سوشل میڈیا کے ذریعے انجمن کے کاموں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

پروفیسر ریشما پروین نے اپنے تاثرات میں کہا کہ آج کے پروگرام کے ذریعے انجمن کی ملک گیر خدمات کا عکس واضح طور پر سامنے آیا ہے۔ پروگرام کے دوران ریسرچ اسکالر شاہ زمن اور سیدہ مریم الٰہی نے اردو زبان سے متعلق سوالات بھی کیے، جن کے جوابات ڈاکٹر اطہر فاروقی نے نہایت بصیرت افروز انداز میں دیے۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ انجمن ترقی اردو ہند نہ صرف اردو بلکہ انگریزی ترجمے کے میدان میں بھی معیاری کام کر رہی ہے۔ آج کے دور میں انگریزی سے واقفیت نہ ہونا ایک بڑی رکاوٹ ہے، جس کا ادراک انجمن نے بخوبی کیا ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر عفت ذکیہ، ڈاکٹر فرح ناز، محمد شمشاد اور متعدد طلبہ و طالبات نے آن لائن شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2025

صدی کا صحافی - حفیظ نعمانی

لکھنؤ: حفیظ نعمانی کی صحافت ان کے کردار اور کارناموں

کو ان کے عہد کے منظرنامے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ان کا دور اردو صحافت کا سنہری دور تھا، یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ روزنامہ 'تحریک' کا اجرا کیا تو اردو صحافت کی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ حفیظ نعمانی کے اندر صحافتی دیانت داری تھی، تحریر میں شگفتگی تھی، ان خیالات کا اظہار معروف صحافی معصوم مرادآبادی نے کیا، وہ گلوریس فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام و اترپردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے 'صدی کا صحافی - حفیظ نعمانی' موضوع پر منعقد سمینار سے خطاب کر رہے تھے۔ اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن لکھنؤ کے صدر سید محمد شعیب نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ حفیظ نعمانی نے ندائے ملت کے علی گڑھ نمبر کے لیے جو صعوبتیں برداشت کیں ان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حفیظ نعمانی کا نام صحافت میں اہم مقام رکھتا ہے، ان سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

مہمان خصوصی معروف صحافی احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ حفیظ نعمانی کی شخصیت کے مختلف پہلو تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑی جدوجہد کی۔ وہ اردو کے بے لوث خادم تھے۔ پرویز ملک زادہ نے کہا کہ حفیظ نعمانی کے لیے صدی کا صحافی، موضوع حرف بحرف سچ ہے۔ ان کے اداریے اور مضامین سچائی پر مبنی اور دلچسپ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مہمان خصوصی ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، روبی جمشید اسسٹنٹ کمشنر ضلع ادیوگ بارہ بنکی، ڈاکٹر احتشام احمد خاں، ڈاکٹر طارق قمر وغیرہ نے خطاب کیا۔ سمینار کی کنوینر نزہت شہاب چشتی نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔

پروفیسر ریشماں پروین، محمد اویس سنبھلی، اشرف فردوسی ندوی، ڈاکٹر حمیرا عالیہ، ڈاکٹر سعید اختر، سعدیہ سحر، ضیاء اللہ صدیقی ندوی اور راشد خان ندوی نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 مئی 2025

یادِ والی آسی

لکھنؤ: والی آسی ایجوکیشنل اینڈ لٹریری سوسائٹی، لکھنؤ کے زیر اہتمام 'یادِ والی آسی' کے عنوان سے ایک یادگار سمینار و مشاعرے کا انعقاد رشید بارہ دری، عیش باغ

میں ہوا۔ صدارت اسلامک سنٹر آف انڈیا کے صدر و امام عیدگاہ مولانا خالد رشید فرنگی محلی اور نظامت پرویز ملک زادہ نے کی۔ ڈاکٹر مسعود احسن عثمانی نے والی آسی کی شاعری، ان کی شخصیت، منکسر المزاجی، محبت و شفقت اور ہمہ گیر خدمات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ایک منفرد اور باکمال شخصیت قرار دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر کوثر عثمان نے ان کے اشعار کی روشنی میں ان کی ادبی عظمت کو اجاگر کیا اور متعدد واقعات کا ذکر بھی کیا۔ اس موقعے پر بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر رئیس انصاری کو 'والی آسی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ رئیس انصاری نے والی آسی کے اشعار پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ناظر عام ندوۃ العلما لکھنؤ مولانا عمار عبدالعلی حسنی نے والی آسی کی دینداری کو سراہتے ہوئے موجودہ شعرا سے ان کے نقش قدم پر چلنے کی اپیل کی۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ والی آسی کی زندگی

دین وادب کا حسین امتزاج تھی۔ سوسائٹی کے صدر اور مشہور صرافہ تاجر معروف خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ والی آسی کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہ تھا، وہ اپنی شاعری ہی نہیں بلکہ اپنے کردار سے بھی اصلاح معاشرہ کا پیغام دیتے تھے۔ مشاعرہ رئیس انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا، نظامت پرویز ملک زادہ اور رضوان فاروقی نے کی۔ آخر میں والی آسی کے فرزند اور سوسائٹی کے سکریٹری جمالی آسی نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مئی 2025

تحریک آزادی اور اردو

میرٹھ: ہمارے ملک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اردو تقریباً پانچ سو ساڑھے پانچ سو سال پرانی زبان ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تحریک

آزادی میں اہم کردار ادا کرنے والی زبان انگریزی نہیں بلکہ دونوں بہنیں اردو اور ہندی پیش پیش تھیں۔ یہ الفاظ تھے معروف بین الاقوامی محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی کے جو شعبۂ اردو اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالر انجمن (ایوسا) کے مشترکہ پروگرام یک روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'تحریک آزادی اور اردو' میں شعبے کے پریم چند سمینار ہال میں اپنے کلیدی خطبے کے دوران ادا کر رہے تھے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، شکریہ ڈاکٹر الکا وششٹھ اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی نے کہا کہ تحریک آزادی میں اردو کی ہر صنف نے اہم کردار ادا کیا، خواہ وہ صحافت ہو، نثر ہو یا پھر نظم، انقلاب، زندہ باد کا نعرہ ہو یا سرفروشی کی تمنا... جیسا نغمہ ہو ہر طرح سے اردو نے تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ معروف ناقد پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ 1857 کی آزادی کے مجاہدین پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس لکھے ہوئے کو مستند مان کر اپنی تحریریں نہ لکھیں بلکہ کچھ اور نئی تحقیق کریں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج کے پروگرام رکھنے کا مقصد ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے جنھوں نے اس وطن کی خاطر جام شہادت نوش کیا۔ اسی وجہ سے میرٹھ کے مختلف ادارے اور تنظیمیں ہفتے بھر کے لیے پروگرام منعقد کرتے ہیں تاکہ نئی نسل اپنے بزرگوں کی قربانی کو یاد رکھیں اور وطن کے تئیں ان کے اندر شدید محبت کا جذبہ بیدار رہے۔ اس دوران شعبۂ اردو کے ششماہی مجلّہ 'ہماری آواز' کے 'گوشۂ عارف نقوی' کا اجرا بھی مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر ارشاد سیانوی، محمد ہارون سہارنپوری نے 'تحریک آزادی اور اردو غزل' جامعہ کے ریسرچ اسکالر راحت علی صدیقی نے 'تحریک آزادی اور اردو صحافت'، ڈاکٹر فرح ناز نے 'تحریک آزادی اور اردو نظم'، سنبھل کے ڈاکٹر نوید خان نے 'تحریک آزادی میں اردو افسانے کا کردار'، عظمیٰ سحر نے 'تحریک آزادی میں خواتین کا کردار' عنوانات سے اپنے مقالات پیش کیے جن کو سامعین نے خوب سراہا۔ آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ اسکالر کسی بھی صنف کا انتخاب کرے لیکن اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرے۔ موضوع سے نہ ہٹے۔ انھوں نے ارجن کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ارجن کی طرح اپنے ٹارگیٹ پر نظر رکھنی چاہیے، تبھی ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمیں راستے پر نہیں اپنی منزل پر نظر رکھنی چاہیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مئی 2025

بہار

موجودہ سماجی صورتِ حال اور نظریہ تصوف

پٹنہ: حضرت دیوان شاہ ارزانی کے عرس کے موقعے پر ہر سال تصوف کے موضوع پر ایک قومی سمینار کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کے تحت 30 مئی 2025 کو بعد نماز مغرب دو روزہ قومی سمینار کا افتتاحی اجلاس عمل میں آیا جس کی صدارت اردو زبان وادب کے معروف ادیب، سابق صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی وسابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے فرمائی۔ پروفیسر موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں خانقاہ میں منعقدہ سمینار کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ خانقاہوں میں اس کی طرح کی روایت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے خانقاہ دیوان شاہ ارزانی قابل مبارکباد ہے کہ رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ ادب کو فروغ دینے کا کام بھی بحسن وخوبی انجام دے رہی ہے۔ انھوں نے مزید اس بات پر زور دیا کہ تصوف وقت کی اشد ضرورت ہے۔

کلیدی خطبہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے تشریف لائے پروفیسر خواجہ محمد اکرام نے ادا کی۔ اپنے خطبے میں انھوں نے کہا کہ 21 ویں صدی کا ہندوستان تیزی سے بدل رہا ہے۔ ترقی بھی کر رہا ہے۔ اس ماحول میں تصوف کی تعلیمات ایک ہمہ گیر روحانی ومعاشرتی علاج کی صورت میں سامنے آسکتی ہے کیونکہ تصوف ہی محبت، امن، اور انسان دوستی کا واحد ذریعہ ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر حضرت مولانا سید شاہ مصباح الحق عمادی، سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ، پٹنہ سٹی اور جناب امتیاز احمد کریمی، سابق چیرمین بہار پبلک سروس کمیشن، پٹنہ موجود تھے، مولانا عمادی نے تصوف کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''موجودہ دور میں تصوف سے لوگوں کی جو دوری بڑھ گئی ہے اس کی وجہ سے ان کے اخلاقی، سماجی اور معاشی حالات پر اثر پڑا ہے۔ جبکہ جناب امتیاز احمد کریمی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ صورت حال میں تصوف کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی ہے، تصوف فرد کے اندر روحانی تبدیلی اور خلاقی اصلاح پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کا فریضہ اردو ادب کے معروف ناقد اور شاعر پروفیسر زین رامش نے بحسن وخوبی نبھایا۔

31 مئی 2025 بروز سنیچر کو دو روزہ قومی سمینار کا پہلا اکیڈمک سیشن صبح 10 بجے شروع ہوا۔ اس سیشن کے مجلس صدارت میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی اور پروفیسر مظہر صدیقی شامل تھے اور ڈاکٹر قیصر زاہدی پٹنہ،

ڈاکٹر ابوذر ہاشمی کلکتہ، ڈاکٹر احمد نعیمی دہلی، اور احمد جاوید دہلی نے سمینار کے موضوع کے تحت مقالے پیش کیے۔

دوسرے اکیڈمک سیشن کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد پٹنہ اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام دہلی نے فرمائی اس اجلاس میں پروفیسر مظہر صدیقی ممبئی پروفیسر سراج اجملی علی گڑھ، ڈاکٹر ریحان غنی پٹنہ، ڈاکٹر مبین قریشی ڈالٹین گنج، ڈاکٹر سرور ساجد علی گڑھ نے اپنے وقیع مقالے پیش کیے۔ ظہرانے کے بعد تیسرے اکیڈمک سیشن کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر زین رامش ہزاری باغ اور مولانا ڈاکٹر سید صباح الدین منعمی نے مشترکہ طور پر صدارت کا فریضہ انجام دیے۔ اس سیشن میں پروفیسر سید حسن عباس بنارس، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی پٹنہ، مولانا سید امانت حسین پٹنہ، مولانا صباحالدین منعمی گیا اور ڈاکٹر مشکور معینی آسنسول نے مقالے پیش کیے۔ ان بھی اکیڈمک سیشنز میں صدور حضرات نے پڑھے گئے مقالات کے تعلق سے صدارتی خطبے پیش کیے اور معیار و اسالیب کا احتساب کیا۔ پہلے سیشن کی نظامت ڈاکٹر مشکور معینی آسنسول مشکور معینی نے فرمائی جبکہ دوسرے اور تیسرے سیشن کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد فیروز عالم نے انجام دیے۔ اختتامی سیشن کی صدارت مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور مولانا سید امانت حسین نے کی اور پروفیسر خواجہ اکرام، پروفیسر مظہر صدیقی، جناب احمد جاوید، ڈاکٹر مشکور معینی اور جناب ابوذر ہاشمی ممبئی نے سمینار کے تعلق سے اپنے گراں قدر خیالات اور تاثرات کا اظہار فرمایا۔ مقررین نے متفقہ طور پر سمینار کو بامعنی، باوقار، معیاری اور موضوع سمینار کو حالات حاضرہ کے عین مطابق قرار دیا۔

اس موقعے پر ہر سال کسی ایک علمی ادبی خصوصاً تصوف کے میدان کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیت کو آفتاب شریعت تصوف سے نوازہ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ تقریباً گیارہ برسوں سے جاری ہے۔ 2025 کا یہ پر وقار ایوارڈ شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ ہمدرد، دہلی سے منسلک ڈاکٹر مولانا احمد نعیمی دہلی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آفتاب شریعت تصوف ایوارڈ کے تحت مومنٹو، شال، توصیفی سند اور /11,000 ہزار روپے بدست زیب سجادہ پروفیسر سید شاہ حسین احمد دیا گیا۔

اسی دوران حضرت سید شاہ حسین احمد سجادہ نشین خانقاہ دیوان شاہ ارزانی کی ترتیب دی ہوئی کتاب 'شجرۃ الیقین' کی رسم اجرا بھی ادا کی گئی۔ یہ واضح ہو کہ مذکورہ کتاب شیخ الاسلام حضرت سید شاہ غلام نجف قدس اللہ سرہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے مرید و خلیفہ حضرت شاہ رضا حسین نے ترتیب دی تھی لیکن اب اس کے مطبوعہ نسخے نایاب ہیں۔ ملفوظات کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر صاحب سجادہ نے اسے ازسرنو ترتیب دے کر شائع کیا ہے جس کی رونمائی سمینار کے دوران ہوئی۔

رپورٹ: سید شاہ تنویر احمد، مہتمم، خانقاہ شاہ ارزانی، پٹنہ جون 2025

اعزاز و اکرام

شین کاف نظام

نئی دھلی: صدر جمہوریہ ہند دروپدی مرمو نے اردو ادب کے نامور شاعر، نقاد اور محقق شین کاف نظام کو پدم شری ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ انھیں یہ اعزاز اردو زبان وادب کے فروغ میں ان کی طویل، مسلسل اور گراں قدر خدمات کے اعتراف میں گزشتہ روز راشٹرپتی بھون میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں دیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ شین کاف نظام، جن کا اصل نام شیو کشن برسہ ہے، جو 26 نومبر 1945 کو جودھپور، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اردو شاعری، تنقید اور تحقیق

کے میدان میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی معروف تصانیف میں گمشدہ دیر کی گونجتی گھنٹیاں، لمحوں کی صلیب، دہشت میں دریا، اور بھی ہے نام راستے کا، شامل ہیں۔ ان کی کتاب گمشدہ دیر کی گونجتی گھنٹیاں کو 2010 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اقبال سمان، بھاشا بھارتی سمان، بیگم اختر غزل ایوارڈ، شان اردو ایوارڈ سمیت دیگر مختلف ایوارڈز سے نوازا جاچکا ہے۔ شین کاف نظام نے اردو شاعری کے کلاسیکی دیوانوں جیسے دیوان غالب اور دیوان میر کو دیوناگری رسم الخط میں مرتب کیا، تاکہ ہندی زبان کے قارئین بھی اردو شاعری سے محظوظ ہوسکیں۔ انھوں نے اردو کے معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو، میراجی، منیر نیازی اور علامہ کالی داس گپتا رضا جیسے ممتاز شعرا پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔ واضح رہے کہ پدم شری جو ہندوستان کا چوتھا بڑا شہری اعزاز ہے، ہر سال ان افراد کو دیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہوں۔ 2025 میں کل 13 افراد کو یہ اعزاز دیا گیا، جن میں شین کاف نظام بھی شامل ہیں۔ ادبی شخصیات اور قارئین کی جانب سے مبارکباد دینے کا سلسلہ جاری ہے اور سبھی نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2025

مسرور ادبی ایوارڈ

لکھنؤ: حکیم سید محمد نذر کے فرزند سید عابد نظر سادات امروہہ کی طرح علم وفضل وکمال میں یکتا ہیں۔ شعری مجموعے تار نظر کے علاوہ بھی ان کے پاس نظم و نثر کا ذخیرہ ہے جسے منظر عام پر لانے کی تگ ودو جاری ہے۔ ڈاکٹر منصور حسن خاں جنھیں ادبی وشعری خدمات انجام دینے والے بے لوث خادمین ادب پر کام کرنے اور خدمات کا کھلے دل سے استقبال کرنے کا فطری ذوق ہے۔ انھوں نے عابد نظر کی تمام تر بے نیازی کے باوجود ان کی نثری وشعری خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے مجلس مذاکرہ کی میز سجائی۔ انھیں مسرور ادبی ایوارڈ 2025 سے ادیبوں وشاعروں کی موجودگی میں نوازا گیا۔ واضح رہے کہ یہ پروگرام مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی نے سینٹ روز پبلک اسکول گڑھی پیر خاں میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت روزنامہ صحافت برمنگھم کے چیف ایڈیٹر

امیر مہدی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ بڑا ادب اور بڑی شاعری مذہبی اور مسلکی دائروں سے نکل کر ممکن ہے۔ عابد نظر کا اصل میدان تنقید ہے۔ نظامت شاعر و ادیب رضوان احمد فاروقی نے کی اور کہا کہ سچے فن کاروں پہ کام کی ضرورت کل سے کہیں زیادہ آج ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے ساکنان امروہہ کی علمی برتری، سرفرازی و سربلندی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ امروہہ کی دھول مٹی سے بنے ہوئے ہیں، عابد نظر، ملک کی تعمیر و ترقی، نسلوں کی آبیاری ہی ان کا مقصد ہے۔ سید محمد آل رضا زیدی کے مطابق عابد نظر کا لہجہ دوسروں سے مختلف اور جدا ہے۔ ان کی انفرادیت نے مجھے بھی متاثر کیا ہے۔ پروگرام کے آخر میں مشاعرہ ہوا جس میں مختلف شعرا حضرات نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 مئی 2025

صوفی بستوی میموریل ایوارڈ

لکھنؤ: دبستانِ اہل قلم لکھنؤ کے زیر اہتمام مشاعرہ بیاد ڈاکٹر صوفی بستوی و تقریب اعزاز ڈاکٹر مخمور کاکوروی کی سرپرستی و صحافی و شاعر محمد مجاہد سید کی صدارت میں ہوٹل اودھ کی کورٹ نزد برلنگٹن چوراہا لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ نظامت کے فرائض روزنامہ اودھ نامہ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر پروین شجاعت و دایب پرویز ملک زادہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عزیز خیرآبادی و شاعر جمیل احمد جمیل کو ڈاکٹر صوفی بستوی میموریل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ صدر تقریب محمد مجاہد سید نے خطبۂ صدارت میں کہا کہ ڈاکٹر صوفی بستوی کے افسانوں اور شاعری میں اظہار جذبات قلبی بکثرت ہے۔ عالمی سطح پر کوئی ان سے آگے نہ بڑھ پایا، لکھنؤ والوں کو پھر سے وہی سمت سفر اپنانے کی ضرورت ہے۔ مہمان خصوصی پرویز ملک زادہ نے کہا کہ صوفی بستوی کو یاد کرنا ہم سب کا ادبی فریضہ ہے جسے دبستان اہل قلم لکھنؤ نے ادا کیا۔ اس کے لیے میں ڈاکٹر مخمور کاکوروی، معید رہبر لکھنوی اور کنوینر معراج ہاشمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جون 2025

رسم اجرا

مسیحا

ناگپور: اردو ادب کے ہمہ جہت قلمکار جناب وکیل نجیب کی 37ویں کتاب 'مسیحا' (ہندی زبان میں) کا اجرا مورخہ 18 مئی 2025 کو مدرسہ یعقوبیہ کے عظیم الشان ہال 'ایوان وکیل نجیب' میں وقوع پذیر ہوا۔ اس جلسے کی

صدارت شہر ناگپور کی مشہور و معروف شخصیت الحاج عبداللطیف سیٹھ نے انجام دی جب کہ ہندی دنیا کے مشہور و مقبول شاعر اور ادیب جناب ساگر کھادی والا کے دست مبارک سے اجرا کی رسم انجام دی گئی۔

'مسیحا' جناب وکیل نجیب کا مشہور اور بے انتہا پسند کیا جانے والا ناول ہے جس کو 2016 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اب 2025 میں اس ناول کا ساہتیہ اکادمی نے ہندی میں ترجمہ کروا کر اپنی جانب سے شائع کیا ہے۔ اجرا کے بعد جناب وکیل نجیب نے 'مسیحا' ناول کی تخلیق کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مزید ناول کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے اور بعد میں ساہتیہ اکادمی کی معرفت اس ناول کے ہندی زبان میں ترجمہ اور طباعت سے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ اس کے بعد مہمانوں میں جناب شمیم اعجاز مدیر دعوت المیزان، جناب نظام الدین انصاری، مدیر تحریک اصلاح نے تفصیل سے وکیل نجیب کی ادبی کارگزاریوں و نیز ملک گیر شہرت و مقبولیت کو ذاتی تجربوں کی بنیاد پر بیان کیا۔ ماہنامہ 'الفاظ ہند' کے مدیر جناب ریحان کوثر نے اس ناول کے حوالے سے شدھ ہندی میں بہترین مقالہ پیش کیا۔ آثار قدیمہ (آرکیالوجی) کے سابق ڈائرکٹر جناب خواجہ غلام السیدین ربانی نے اپنے متاثر کن انداز میں ناول مسیحا کی فنی خوبیوں کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر قائم مقام صدر جلسہ جناب رفیق اے ایس نے وکیل نجیب کی شخصیت، ان کی ناول نگاری اور ناول 'مسیحا' کے متعلق اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض سہیل انصاری نے انجام دیے۔

ڈاک سے: محمد نعیم الوکیل، مومن پورہ ناگپور، 25 مئی 2025

اردو کیسے سیکھیں

حیدرآباد: ممتاز ادیب، شاعر اور ماہر اقبالیات شخصیت ساز اسلامک اسکالر برصغیر کی معروف شخصیت ڈائرکٹر ہدف نعیم جاوید کے ہاتھوں ریاض سعودی عرب میں محمد عبدالوحید حمیری، حیدرآباد دکن کی کتاب 'اردو کیسے سیکھیں؟' کی رونمائی 14 مئی کی شام معروف تنظیم 'اظہار' کے زیر اہتمام صدر تنظیم پروفیسر عظمت اللہ بھٹو کی رہائش گاہ پر عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ممتاز قلمکار مجید عارف نظام آبادی نے محمد عبدالوحید حمیدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں۔ حمیدی صاحب نے بچوں کی ایج و صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے 'اردو کیسے سیکھیں' (حصہ اول تا حصہ پنجم) کے عنوان سے ایک مکمل کورس متعارف کرایا ہے، جو نئی نسل کو اردو سیکھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ قبل ازیں علامہ اقبال کے فکر و فن پر سیر حاصل گفتگو کی۔ مسٹر نعیم جاوید نے کہا کہ علامہ اقبال کی شخصیت مینار نور کی مانند ہے، جس کی کہکشاں سے نسلیں فیض یاب ہوتی رہیں گی۔ اس موقعے پر علامہ اقبال کے فکر و فن پر شاہد خیالوی، منصور محبوب چودھری، ڈاکٹر راشد محمود، صدر محفل پروفیسر عظمت اللہ، پروفیسر گوہر رفیق نے بھی روشنی ڈالی۔ بعد ازاں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں معروف شعرائے کرام منظر حمدانی، منصور محبوب چودھری، عبدالرحمٰن راشد عمری، نعیم جاوید نے کلام سنایا، پروفیسر عظمت اللہ کے شکریے پر محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 مئی 2025

الشفا

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے مرکزی دفتر دریا گنج نئی دہلی میں ماہنامہ 'الشفا' کے 32 سال کے خصوصی شمارے کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی

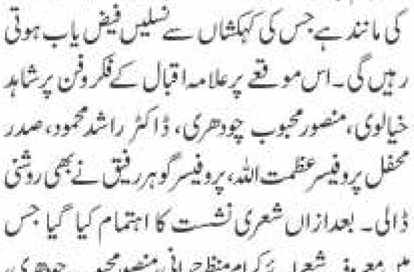

کے طور پر موجود معروف سماجی کارکن اور انسٹی ٹیوٹ فار سوشل ہارمونی لکھنؤ کے جنرل سکریٹری محمد خالد نے

رسالے کا اجرا کیا۔ محمد خالد نے اس موقعے پر کہا کہ اردو اور میڈیکل سائنس کا رشتہ تاریخی ہے، اور ایک وقت ایسا بھی تھا جب عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم بی بی ایس کی تعلیم اردو زبان میں ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اردو نہ صرف ایک علمی زبان ہے بلکہ یہ معاشرے میں اخوت، محبت اور ہم آہنگی کی علامت بھی ہے۔ 'الشفا' جیسا طبی وسماجی رسالہ اردو زبان کی سائنسی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ 'الشفا' اردو زبان میں صحت عامہ سے متعلق ایک منفرد اور مسلسل شائع ہونے والا رسالہ ہے، جس کے اکتیس سال مکمل ہونا اردو صحافت اور طبی دنیا کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مفتی جاوید انور دہلوی، ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد عارف سیفی، محمد اویس گورکھپوری، حکیم آفتاب عالم، سید اعجاز حسین اور محمد عمران قنوجی نے بھی اظہار خیال کیا اور 'الشفا' کی خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مئی 2025

'چہرے پڑھا کرو' اور 'نگینے لوگ'

نئی دہلی: سینئر صحافی، ادیب اور خاکہ نگار معصوم مرادآبادی کے خاکوں کے دو مجموعوں 'نگینے لوگ' اور

'چہرے پڑھا کرو' کی رسم رونمائی ادبی اور علمی شخصیات کے ہاتھوں اردو گھر میں عمل میں آئی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اس تقریب کی صدارت پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر سابق رکن پارلیمنٹ اور سفیر م افضل شریک ہوئے۔ ممتاز ادیب اور دانشور پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے کہا کہ 'خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک پسندیدہ صنف ہے۔ موجودہ عہد میں جن لوگوں نے اسے اعتبار بخشا ہے، ان میں میں معصوم مرادآبادی کا نام سرفہرست ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ ان کے قلم سے کسی شخصیت کا خاکہ یا تذکرہ پڑھنے کو نہ ملتا ہو۔ ان کی تحریریں پڑھ کر ابن انشا کی یاد آتی ہے۔ 'نگینے لوگ' اور 'چہرے پڑھا کرو' دونوں ہی کتابیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ سابق ممبر پارلیمنٹ اور سفیر م افضل نے کہا کہ معصوم مرادآبادی کو میں اس لیے اہمیت دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنی محنت، لگن اور ایمانداری سے صحافت اور ادب دونوں میں نام کمایا۔ عالمی شہرت یافتہ مزاحیہ شاعر ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی نے کہا کہ معصوم مرادآبادی کی ادبی تحریروں نے مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے اور میں ان کی نثر کا مداح ہوں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے معصوم مرادآبادی کی صحافتی، علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان میں بات کہنے کا جو سلیقہ ہے وہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے لوگوں کے ذہنوں پر اپنی انشاپردازی کے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ وہ تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور ان کے قلم سے بہترین تحریریں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ حال ہی میں قومی اردو کونسل نے بھی ان کی ایک تحقیقی کتاب شائع کی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ میں اور معصوم مرادآبادی جدوجہد کے دنوں کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے جو اسٹرگل کیے ہیں اسے دیکھ کر بہت حوصلہ ملتا ہے۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شہزاد انجم نے اپنی تقریر میں 'چہرے پڑھا کرو' اور 'نگینے لوگ' کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مجھے معصوم مرادآبادی کے اسلوب نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کی زبان و بیان، اسلوب معلومات اور رشتوں سے ان کے علم وحلم کا بخوبی اندازہ ہے۔ سینئر صحافی سہیل انجم نے 'نگینے لوگ' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب خاکہ نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے اور اس میں شامل طنزیہ ومزاحیہ خاکے بہت لطف دیتے ہیں۔ ممتاز فکشن نگار ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ معصوم مرادآبادی کی صحافت اور خاکہ نگاری میں ایک مماثلت ہے۔ وہ بہت کم وقت میں کسی شخص کی تصویر کشی بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ معروف صحافی اور شاعر تحسین منور نے کہا کہ معصوم مرادآبادی کسی شخصیت کا مطالعہ بہت باریک بینی کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کی نگاہ ان پہلوؤں تک جاتی ہے جہاں تک عام لکھنے والوں کی رسائی نہیں ہے۔ صاحب کتاب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ زندہ لوگوں پر خاکے لکھنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ اس عمل میں آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہوتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں جن لوگوں کا تعارف کرایا گیا ہے وہ علمی وادبی دنیا کی اہم شخصیات ہیں۔ تقریب اجرا کی نظامت معروف شاعر اور صحافی معین شاداب نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2025

کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا

لکھنؤ: مشہور عالم دین صحافی اور صاحب طرز انشاپرداز مولانا عبدالعلی فاروقی کی نئی تصنیف 'کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا' کی تقریب رسم اجرا عیدگاہ عیش باغ میں مولانا خالد رشید فرنگی محلی کی صدارت میں منعقد ہوئی، نظامت کے فرائض جناب عاصم کاکوروی نے انجام دیے۔ جس میں بڑی تعداد میں علمائے کرام، ادبا، شعرا اور دانشوران نے شرکت کی۔ مشہور ومعروف صحافی احمد ابراہیم علوی صاحب کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ صدر جلسہ مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا' کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا' میں مولانا نے اپنے خیالات کو تسلسل کے ساتھ لکھا ہے۔ قارئین کو اس کتاب کے مطالعے میں بہت کچھ مفید باتیں ملیں گی۔ اسی طرح دیگر حضرات مثلاً جناب طارق صدیقی، حضرت مولانا رفیق القاسمی، جناب احمد ابراہیم علوی، عمیر منظر، مولانا ذکی نور ندوی، وحیداللہ سعیدی، مولانا ضیاء الدین، مولانا ضیاء الحق، مولانا جمیل احمد نذیری، مفتی محمد خبیر، مست حفیظ نعمانی حضرات نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار مختلف انداز سے کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 مئی 2025

عالمی جائزہ

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں 'عالمی جائزہ' کے ابن صفی نمبر کی تقریب اجرا میرے

لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ یہ ثبوت ہے نہ صرف اسلم جمشید پوری کی ژرف نگاہی اور ادب نوازی کا بلکہ ابن صفی کی فنکارانہ عظمت اور اردو قارئین میں ان کی مقبولیت کا کہ مختلف اردو اداروں اور دانش گاہوں سے اس قسم کی تقاریب اجرا کے لیے مجھے مدعو کیا جارہا ہے۔ یہ الفاظ تھے 'عالمی جائزہ' کے مدیر اور عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان کے جو شعبۂ اردو میں منعقد 'ابن صفی نمبر' کی اجرا کی تقریب میں مہمان اعزازی کے بطور اپنی تقریر میں ادا کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے آج سے چھیاسٹھ سال قبل ابن صفی کا پہلا ناول پڑھا تھا اور اب تک ان کے سبھی ناول چھیاسٹھ بار پڑھ چکا ہوں۔ ابن صفی کی لوگوں کو لت جاگ جاتی تھی۔ ابن صفی کو جس نے بھی ایک بار پڑھ لیا وہ ان کا عادی ہوگیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض شعبے کے استاد ڈاکٹر آصف علی، تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے۔ مارکنارٹی ایجوکیشنل کے صدر آفاق احمد خاں نے کہا کہ دوران طالب علم ابن صفی کے ناولوں کو پڑھنے کی ہم میں دیوانگی اتنی تھی کہ الہ آباد سے نکلنے والی میگزین جس میں ابن صفی کے ناول شائع ہوتے تھے اسے لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر پہلے ہی پہنچ جایا کرتے تھے اور چار پانچ روز میں پڑھ کر ختم کردیتے تھے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے 'سائبان' اور 'جرنلزم ٹوڈے' کے مدیر جاوید رحمانی نے کہا کہ ابن صفی کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہے۔ ابن صفی نہ صرف ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے بلکہ ادب کے لیے تابندہ رہیں گے۔ پروفیسر نوین چندلونی نے کہا کہ اگر زبان کی قواعد کو جاننا ہے تو ناول کو پڑھنا ضروری ہوجاتا ہے۔ ایک اچھے ادیب کی تحریریں بچوں تک ضرور پہنچانی چاہیے۔ ابن صفی کے کلام کو دیگر زبانوں میں ترجمہ کرکے دوسروں تک پہنچائیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 مئی 2025

بیگم شہناز سدرت: کامیابیاں منصوبے اور کوششیں

لکھنؤ: بیگم شہناز سدرت نہ صرف متحرک و باعمل بلکہ ملت کا درد رکھنے والی حساس خاتون ہیں۔ انھیں خواتین کی تربیت و تحفظ اور تعلیم کی فکر ہے۔ ان کی

کتاب 'بیگم شہناز سدرت: کامیابیاں، منصوبے اور کوششیں' کی تقریب اجرا کے موقعے پر یہ باتیں مقررین نے کہیں۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ یہ کتاب مردہ پرستی کی فضا ختم کرتی ہے، جس کے لیے بجا طور پر احمد ابراہیم علوی لائق مبارکباد ہیں۔ بیگم شہناز سدرت کی بے لوث خدمات نے انھیں سربلندی و سرفرازی عطا کی ہے۔ انھوں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ کتاب کو دیگر شخصیات کے مضامین اور اہم تصاویر کی شمولیت سے زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے کہا کہ آج کے دور میں ایک دن میں کتاب کا تیار کردینا بھی کسی ریکارڈ سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے بیگم شہناز سدرت کی شخصیت کو قابل قدر و ستائش بتایا۔ زبیر انصاری ایڈوکیٹ ہائی کورٹ نے کہا کہ بیگم شہناز کی علمی و سماجی خدمات کو احمد ابراہیم علوی کی کتاب سے عوام و خواص میں اعتبار حاصل ہوگا۔ پرویز ملک زادہ نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مختصر سے وقت میں کتاب لکھنا، چھپانا اور تقریب اجرا دل خوش ہونے کے ساتھ حیرت انگیز ہے۔ رفعت شیدا صدیقی، حیدر علوی، ڈاکٹر نجے مصرا شوق، راجو مسرا، سدھا مسرا، انور جہاں اور پریا سنگھ نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت رضوان احمد فاروقی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 مئی 2025

جبین ادب

لکھنؤ: لکھنؤ علم و ادب کے معاملے میں منفرد شناخت رکھتا ہے۔ 'جبین ادب' ڈاکٹر جہاں آرا کی چوتھی تصنیف ہے۔ اس میں اردو کے دلاوروں اور بہادروں کا ذکر ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب عوامی مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خان محمد عاطف نے سلیم جن کلیات سمیتی کے زیر اہتمام ڈاکٹر جہاں آرا سلیم کی تازہ ترین نثری تخلیق 'جبین ادب' تقریب رسم اجرا میں اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ تقریب کا انعقاد بارہ دری رشید، عیدگاہ عیش باغ میں ہوا۔ صدارت سابق صدر شعبہ فارسی پروفیسر خان محمد عارف نے جب کہ نظامت پروفیسر ریشماں پروین نے کی۔ اس موقعے پر معید رہبر، نجے مشرا شوق، محمد فیصل خاں، آفتاب اثر ٹانڈوی، وقار کاشف، صغیر نوری وغیرہ شعرا نے اپنے کلام بھی سنائے۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے ڈاکٹر زیبا کا ترسیل شدہ مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے اپنے پرمغز مقالے میں کہا کہ جبین ادب محض ایک تنقیدی مجموعہ نہیں ہے بلکہ اردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں ایک وقیع اضافہ ہے۔ ان کا قلم علمی دیانت، فکری گہرائی اور ادبی شائستگی کا خوبصورت امتزاج ہے۔ واصف فاروقی نے جبین ادب کے ادبی اعتبار اور وقار کو سراہا۔ اختر جمال عثمانی نے کہا کہ ڈاکٹر جہاں آرا سلیم اپنے والد فیض علی کی علمی و ادبی وراثت کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کی ادبی کاوشیں ان کے علم و ادب سے گہری وابستگی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم حیدر نے کہا کہ ڈاکٹر جہاں آرا کی تحریروں میں بلا کی روانی اور بے ساختگی ہے اور خاکہ نگاری پر خاص دسترس حاصل ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 مئی 2025

رند

نئی دہلی: معروف فکشن نگار ڈاکٹر فردوس عظمت کے نئے ناول 'رند' کی رسم اجرا کی تقریب انڈیا انٹرنیشنل

سینٹر، لودھی روڈ، نئی دہلی کے کانفرنس ہال میں ہوئی۔ اس محفل کی صدارت پروفیسر سویتا سنگھ نے کی، جب کہ مہمانان خصوصی کے طور پر پروفیسر خالد جاوید اور رحمان عباس نے شرکت کی۔ تقریب کا آغاز سابق مدیر ماہنامہ 'آجکل' خورشید اکرم کی گفتگو سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ فردوس عظمت کا ناول 'رند' تقسیم ہند کے کرب کو عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ اس موقعے پر این سی ای آر ٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رضوان الحق، انگریزی زبان کی صحافی زہرا نقوی، شاداب رشید، مدیر 'نیا ورق' اور 'کتاب دار' کے مالک جو انگریزی ادب کی اسکالر عنب تیر نے ناول کے فنی اور فکری محاسن پر روشنی ڈالی۔ فکشن نگار اسلم پرویز نے ڈاکٹر فردوس عظمت کے ناول 'رند' کو تقسیم پر لکھے گئے دیگر ناولوں سے مختلف قرار دیا۔ ڈاکٹر نشاں زیدی نے اسے اردو ادب میں ایک نئی آواز کی حیثیت سے سراہا۔ رحمان عباس نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ناول کے کرداروں اور جزئیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ایک شاندار ناول ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر خالد جاوید نے کہا کہ 'رند' کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ ہم نے الہ آباد کو فردوس عظمت کی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے محسوس کیا۔ اس موقعے پر روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے گروپ ایڈیٹر عبدالماجد نظامی نے ناول کے حوالے سے گفتگو کی اور اسے ایک کامیاب فن پارہ قرار دیا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر فردوس عظمت نے اظہار تشکر کرتے ہوئے آئندہ اپنی تخلیقات کو ہندی میں لکھنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ اردو۔ہندی کے دیرینہ رشتے کو فروغ مل سکے۔ صدر محفل پروفیسر سویتا سنگھ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اگر تقسیم کے وقت فیصلے خواتین کے ہاتھ میں ہوتے تو شاید تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا۔ تقریب کی نظامت مالک اشتر نے انجام دی جب کہ اردو ہندی اور انگریزی کے متعدد اسکالرز اور پروفیسرز کی شرکت نے اس پروگرام کو ایک علمی و ادبی جشن میں تبدیل کر دیا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ..... مئی 2025

وفیات

ایم آر سری نواسن

چنئی: جوہری سائنس داں اور ایٹمی توانائی کمیشن کے سابق چیئرمین ڈاکٹر ایم آر سری نواسن کا تمل ناڈو کے اوگمنڈلم میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 95 برس تھی۔ ملک کے سول نیوکلیئر انرجی پروگرام کے چیف آرکیٹیکٹ ڈاکٹر سری نواسن

نے ستمبر 1955 میں ڈپارٹمنٹ آف اٹامک انرجی (ڈی اے ای) میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور پانچ دہائیوں سے زائد عرصے تک خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا کے ساتھ ملک کے پہلے نیوکلیئر ریسرچ ری ایکٹر اپسرا کی تعمیر میں کام کیا جس نے اگست 1956 میں کام شروع کیا۔ 1959 میں انھیں ملک کے پہلے ایٹمی پاور اسٹیشن کے لیے پروجیکٹ انجینئر مقرر کیا گیا۔ 1974 میں وہ ڈی اے ای کے پاور پروجیکٹ انجینئرنگ ڈویژن کے ڈائرکٹر بنے اور ایک دہائی بعد نیوکلیئر پاور بورڈ کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔ 1987 میں ڈاکٹر سری نواسن کو اٹامک انرجی کمیشن کا چیئرمین اور محکمہ جوہری توانائی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اسی سال وہ نیوکلیئر پاور کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ (این پی سی آئی ایل) کے بانی چیئرمین بھی بن گئے۔ ان کے دور میں نمایاں توسیع دیکھنے میں آئی اور ان کی رہنمائی میں 18 نیوکلیئر پاور یونٹ تیار کیے گئے، جن میں سے سات کام کر چکے تھے اور سات زیر تعمیر تھے۔ اس کے علاوہ چار منصوبہ بندی کے مرحلے میں تھے۔ ڈاکٹر سری نواسن کو جوہری سائنس اور انجینئرنگ کے شعبے میں ان کی مثالی شراکت کے لیے ملک کے دوسرے اعلیٰ ترین شہری اعزاز پدم وبھوشن سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2025

انیس رفیع

کولکاتا: اردو کے ممتاز افسانہ نگار جناب انیس رفیع 7 جون 2025 کو 80 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انیس رفیع کی ولادت 5 جنوری 1945 کو ویشالی بہار میں ہوئی تھی۔ 7 جون بعد نماز عصر ان کی تدفین باگ ماری قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم گزشتہ چند ماہ سے صاحب فراش تھے۔ ان کے پسماندان میں اہلیہ نوشابہ پروین، دو بیٹے

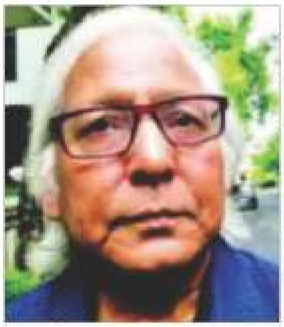

آصف انیس خان، انتخاب انیس خان اور ایک بیٹی ڈاکٹر عظمیٰ انیس ہیں۔ انیس رفیع نے علم سیاست میں ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مختلف کالجز میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1975 میں یو پی ایس سی کے ذریعے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت حاصل کی۔ آل انڈیا گورکھپور، کلکتہ اور پٹنہ میں پروگرام کے ایگزیکیوٹو عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد 1991 میں دوردرشن کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنائے گئے۔ دہلی، پونہ اور کلکتہ میں اپنے فرائض انجام دے کر وہ ڈائرکٹر ہوئے اور ڈبلوگڑھ آسام مظفر پور (بہار) اور کوہیما (ناگالینڈ) میں معمور رہ کر 2005 میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ 2008 میں وزیٹنگ فیلو کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ماس کمیونی کیشن میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ افسانہ نگار کی حیثیت ان کی ایک منفرد شناخت تھی۔ ان کے تین افسانوی مجموعے اب وہ اترنے والا ہے، کرفیو سخت ہے اور گداگر سرائے ادبی حلقے میں بہت مقبول ہوئے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

روزنامہ 'پندار'، پٹنہ اور دیگر ذرائع

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قیام امن: ایک جستجو

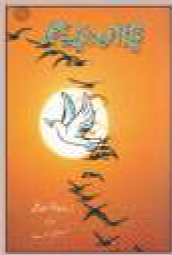

مصنف: زینت شوکت علی، مترجم: نسیم احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 586+xxii

قیمت: 310 روپے

پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں

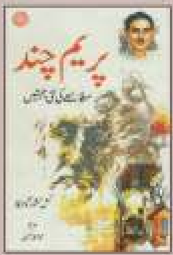

مصنف: کمل کشور گوئنکا، مترجم: محمد صغیر حسین

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 283

قیمت: 165 روپے

سوانح عمری: حاجی محمد سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی

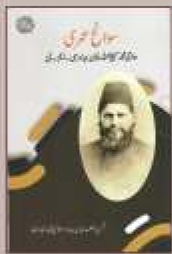

مصنف: شمس العلماخان بہادر مولوی محمد ذکاءاللہ

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 172+xii (حصہ اوّل)، 72+5 (دوم)

قیمت: 160 روپے

تنویر احمد علوی (مونوگراف)

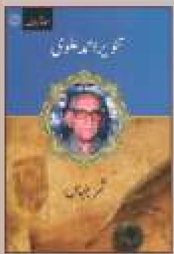

مصنف: ثمر جہاں

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 170

قیمت: 120 روپے

انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم

مولف: انس مسرور انصاری

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 100

قیمت: 35 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (جلد اوّل)

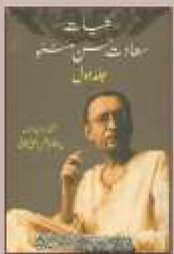

تحقیق، تدوین وترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 596

قیمت: 330 روپے

سفینۃ الاولیا

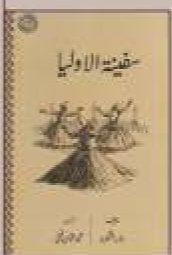

تالیف: دارا شکوہ، ترجمہ: محمد عثمان غنی

پہلی اشاعت: 2025

صفحات: 280

قیمت: 195 روپے

تلفظ

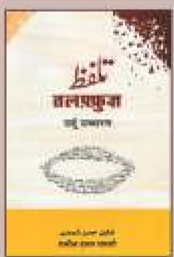

مصنف: شکیل حسن شمسی

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 184+xxiv

قیمت: 135 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जूलाई–2025,वर्ष:27, अंक:07
URDU DUNIYA Monthly, July-2025, Vol.27, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/06/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

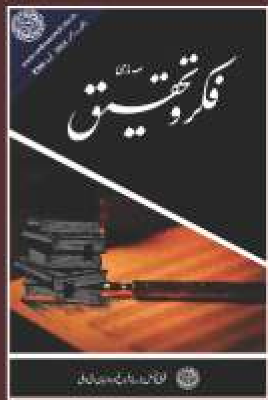

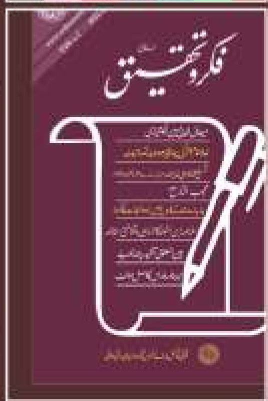

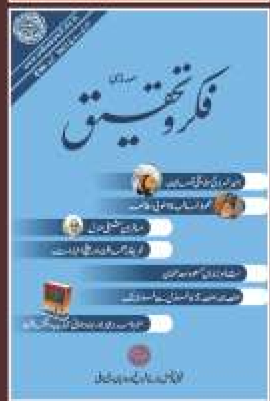

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6